وَكَذٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوٓا أَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ أَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا
(الکھف ۱۸: ۲۱)

اصحابِ کہف کے غار کا انکشاف

پروفیسر محمد نعمان خاں
صدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی

پروفیسر محمد نعمان خاں

(صدر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی)

طوبیٰ ریسرچ لائبریری

معاون خصوصی: مولانا حبیب اللہ اختر

http://toobaa-elibrary.blogspot.com/

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الآفَاقِ وَ فِي أَنفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَق﴾

(سورہ حم السجدة (فصلت) آیت: ۵۳)

''عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں اطراف عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ حق یہی ہے۔''

﴿وَكَذٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا﴾

(سورة الکهف:۲۱)

''ہم نے (لوگوں) کو ان (اصحاب کہف) پر مطلع کر دیا تا کہ وہ (لوگ) جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت (کے آنے) میں کوئی شک نہیں۔''

اصحاب کہف کے غار کا انکشاف

پروفیسر محمد نعمان خاں
شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ﴾
(سورہ حم السجدة (فصلت) آیت: ۵۳)

''عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں اطراف عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ حق یہی ہے۔''

﴿وَكَذَٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا﴾
(سورة الكهف: ۲۱)

''ہم نے (لوگوں) کو ان (اصحابِ کہف) پر مطلع کر دیا تاکہ وہ (لوگ) جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت (کے آنے) میں کوئی شک نہیں۔''

اصحاب کہف کے غار کا انکشاف

پروفیسر محمد نعمان خاں
شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی

Name of the Book : **Ashaab-e-Kahf ke Ghar Ka Inkishaf**
Name of the Author : Prof. M.N. Khan
Edition : 1427AH/2006AD
Published By : **Islamic Book Foundation**
An Institute of Islamic Research & Publications
1781, Hauz Suiwalan, New Delhi-110 002
Pages : 245
Price : **150/-**

نام کتاب : اصحاب کہف کے غار کا انکشاف
نام مصنف : پروفیسر محمد نعمان خاں
ایڈیشن : ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء
صفحات : ۲۴۵
قیمت : ۱۵۰ روپے
مطبع : ڈائمنڈ پرنٹرز، دہلی
ناشر : پروفیسر محمد نعمان خاں
تقسیم کار : **اسلامک بک فاؤنڈیشن**
۱۷۸۱ حوض سوئیوالان، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

Islamic Book Foundation
AN INSTITUTE OF ISLAMIC RESEARCH & PUBLICATIONS
1781, Hauz Suiwalan, New Delhi-110002

ISBN 81-901947-3-9

یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے شائع کی گئی

فہرست مضامین

تمہید ۷
سورۂ کہف کا تعارف ۱۵
سورۂ کہف کی فضیلت ۱۶
شانِ نزول ۱۷
قرآنِ کریم میں اصحاب کہف کا واقعہ ۱۹
قرآنِ کریم میں مذکور اصحابِ کہف کے قصّے کا خلاصہ ۲۳
اصحابِ کہف کا قصہ دیگر تفصیلات کی روشنی میں ۲۵
اصحابِ کہف کا آخری زمانے میں ظہور ۲۷
اصحابِ کہف سے متعلق مختلف مآخذ کا بیان ۲۹
مذکورہ مآخذ کا جائزہ اور استدلال ۳۳
عیسائی مآخذ میں اصحابِ کہف کا قصہ ۳۷
اسلامی مآخذ میں اصحابِ کہف کا قصہ ۴۱
اصحابِ کہف کی تعداد ۴۵
اصحابِ کہف کا کتا ۴۷
اصحابِ کہف کے محوِ خواب رہنے کی مدت ۴۹
اصحابِ کہف کا ظالم بادشاہ اور ان کے ظہور کا زمانہ ۵۰
الرقیم کی تشریح ۵۳

اصحابِ کہف کے غار کے پہاڑ کا نام ۵۴
اصحاب کہف کے غار کا محلِ وقوع ۵۵
اصحابِ کہف کا غار، عیسائی روایات کی روشنی میں ۵۶
اصحابِ کہف کا غار، اسلامی روایات کی روشنی میں ۵۸
اصحاب کہف کے غار کے بارے میں دلائل وقرائن ۶۲
دینی دلائل ۶۲
تاریخی اور آثاری ثبوت ۶۶
حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ۶۷
صلاح الدین ایوبی کے ایک فوجی جنرل کی اس غار پر حاضری ۷۵
اصحاب کہف کا غار، قرآن مجید کی روشنی میں ۷۶
سورج کے طلوع وغروب کے وقت کی کیفیت ۷۶
مسجد یا بیزنطی کنیسے کا وجود ۷۶
اصحاب کہف کے غار کی دریافت ۷۸
محکمۂ آثارِ قدیمہ اردن سے رابطہ ۷۹
کھدائی اور جانچ کا کام (محکمہ آثار قدیمہ کی رپورٹ) ۸۱
کھدائی سے پہلے ۸۱
کھدائی کے کام کی ابتداء اور رفیق الدجانی کی رپورٹ ۸۳
مسجد کی مرمت کا کتبہ ۸۴
کہف کے اندر کھدائی کا لائحۂ عمل ۸۵
کہف کے میدان میں کھدائی ۸۶
دوسری مسجد کی دریافت ۸۶
کھوہ کی دریافت ۸۷
کھدائی کے نتائج ۸۷

کہفِ افسوس اور کہف الرقیم کا موازنہ ۹۰
الرقیم اور البتراء ۹۲
اختلاف کا خاتمہ ۹۴
اصحابِ کہف ورقیم کی مسجد ۹۵
پرانی مسجد کی تعمیر کی تاریخ ۹۶
الرجیب کے قدیم نام کی بحالی ۹۷
کہف کے علاقے کی اہمیت ۹۷
حال میں تعمیر ہونے والی مسجد ۹۷
کہف کے پاس نئی بستی ۹۹
اصحابِ کہف کے بارے میں مختلف آراء ۱۰۱
اردنی ماہرینِ آثارِ قدیمہ، مؤرخین اور علماء کی رائے ۱۰۲
محکمۂ آثار قدیمہ کے معاون ڈائرکٹر محمود العابدی کی رائے ۱۰۲
مشہور مؤرخ وادیب احسان النمر کی رائے ۱۰۴
تکنیکی معاون رفیق الدجانی کی رائے ۱۰۶
اردن کے مذہبی علماء کی رائے ۱۰۷
دفترِ قاضی القضاۃ کے مشیر ... کی رائے ۱۰۷
جمعیۃ دار القرآن اردن کے صدر ... کی رائے ۱۰۹
محمد السالک الشنقیطی ... عمان، اردن کی رائے ۱۱۱
غیر ملکی زائرین کا اعتراف ۳
مصر میں انکشاف کا شہرہ ۵
مخالف آراء اور جواب ۷
عملی مطالعے کی ضرورت ۸
مصر کے مذہبی علماء اور دانشوروں کی رائے ۹

مذہبی علماء کی رائے ۱۲۰
ایران کے شیعہ علماء کی رائے ۱۲۱
ایرانی عالم طباطبائی کی تائید ۱۲۲
علمائے ہندوپاک کی آراء ۱۲۳
مولانا مودودی کی رائے ۱۲۴
اخبارات، مجلات، ریڈیو... میں انکشاف کی گونج ۱۲۶
غار کے انکشاف کے بارے میں لکھنے والا پہلا رسالہ ۱۲۶
کویتی رسالے ''العربي'' کا مضمون ۱۲۸
رسالہ الوعي الإسلامي کا تحقیقی مضمون ۱۲۹
مشرقِ وسطیٰ خبر رساں ایجنسی کی تحقیقات ۱۳۱
قصے کی ابتداء ۱۳۲
انکشاف کی بازگشت ایران میں ۱۳۳
ضمیمے ۱۳۵
ضمیمہ (۱) علمائے ہندوپاک کے اصحابِ کہف پر مضامین ۱۳۵
ضمیمہ (۲) مضامین وغیرہ کے عکس ۲۳۹
ضمیمہ (۳) تصویریں ۲۴۵

تمہید

اصحاب کہف کے غار کی دریافت بیسویں صدی کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور قرآن کریم میں بیان کردہ واقعے کی تصدیق ہے۔ اس غار کے انکشاف سے پہلے بعض یورپی مصنفین کا خیال تھا کہ قرآن میں اس واقعے کو کسی سے سن کر بغیر تحقیق کے نقل کر دیا گیا ہے اور اس کے باوجود کہ قرآن کے بیان کردہ اوصاف، کسی مشہور غار پر منطبق نہیں ہوتے ہیں، بڑی تعداد میں خود مسلم علماء و مفسّرین، ترکی میں واقع شہر افسوس یا افیسس کے غار کو اصحاب کہف کا غار سمجھتے اور لکھتے رہے، لیکن اس کتاب کے مطالعے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ پہلی صدی ہجری میں عمان کے مضافات میں واقع غار کو ہی اصحابِ کہف کے غار کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔

اصحابِ کہف کے غار کے انکشاف کی تفصیلات لکھنے کے لیے ہمارے اصل ماخذ دو کتابیں ہیں، ان دونوں کتابوں کے مصنف اردنی ہیں، پہلی کتاب ڈائرکٹر آثار قدیمہ اردن کے تکنیکی معاون، رفیق وفا الدجانی کی ہے، جو اس کہف کے انکشاف کے عملے کے رکنِ رکین اور نگراں تھے۔ یہ کتاب ۱۹۶۴ء میں بیروت کے مؤسسة المعارف سے اکتشاف کہف أهل الکهف کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ دوسری کتاب ''أهل الکهف و ظهور المعجزة القرآنية الکبرى'' تالیف محمد تیسیر ظبیان ہے جو ۱۹۷۸ء میں دار الاعتصام قاہرہ سے شائع ہوئی ہے اور مصنف اس کتاب کو آخری شکل دینے کے بعد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اس طرح وہ مہم جو انہوں نے تقریباً ۲۵ سال پہلے شروع کی تھی ان کی عمر کے ساتھ مکمل ہوگئی۔

اس دوسری کتاب کے مصنف اردن میں رابطۂ علومِ اسلامیہ کے صدر اور بہت سرگرم شخص تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جو اس غار تک پہنچے اور اردن کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کو اس طرف توجہ دلانے کے لیے ۱۹۵۳ء سے جہدِ پیہم کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۶۳ء میں کام شروع ہوسکا۔ یہی نہیں بلکہ اس غار کو عالمِ اسلام میں روشناس کرانے کا سہرا بھی انھی کے سر جاتا ہے۔ وہ تاحیات اس مہم میں لگے رہے۔ اس موضوع پر لکھتے رہے اور کہف کے علاقے میں ضاحیۃ الکہف کے نام سے بستی بسا گئے اور وہاں ایک مدرسہ بھی قائم کر گئے تا کہ یہ علاقہ، دینی و دنیوی دونوں سطح پر ترقی کرسکے۔

بظاہر اصحابِ کہف جیسے واقعات ایک سے زیادہ مرتبہ ظہور پذیر ہوئے ہیں، کیوں کہ مذہبی تشدد کے واقعات اس دنیا میں ہوتے رہتے ہیں، خود قرآن مجید میں اُصحاب الاُخدود کے واقعے کی طرف اشارہ ہے، اسی طرح احادیث میں بھی اس طرح کے واقعات کا ذکر ملتا ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف مقامات پر نیک لوگوں نے ظالموں اور سرکشوں سے بھاگ کر اپنا ایمان بچانے کے لیے مختلف غاروں کا سہارا لیا ہے۔ اس طرح کے مختلف واقعات مشہور ہوئے، جن میں سب سے زیادہ شہرت ترکی کے آثاری شہر افیسس یا افسوس کو ہوئی اور غالباً اس کی شہرت کی وجہ سے اسے بغیر کسی تحقیق کے قرآن میں مذکور اصحابِ کہف کا غار تصور کرلیا گیا۔ اگر چہ دوسرے غاروں کو بھی اصحاب کہف کا غار کہا گیا، لیکن عام رائے اسی غار کے بارے میں متفق ہوگئی۔ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غار تو واقعی حقیقی تھے اور کچھ بعض مذہبی فریب کاروں کی ذہنی اپج، انھوں نے اپنی جیب گرم کرنے کے لیے مختلف جگہوں پر اس طرح کے جال پھیلا دیے۔

اس کے بعد اصحاب کہف کے غار کے قصے کے بارے میں مسلم راویوں نے خوب گل کھلائے اور کمال یہ کہ ہر بات صحابہؓ سے منسوب۔ الثعلبی کی قصص الانبیاء خرافیات کا مجموعہ ہے، اس میں اصحابِ کہف کا قصہ پڑھیے، باریک سے باریک بات بھی آپ کو معلوم ہوجائے گی اور زیادہ تر باتوں کی کڑیاں حضورِ اکرم ﷺ سے جا کر مل جاتی ہیں،

قرآنِ کریم حضورِ اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے آپ کسی سے ان کے بارے میں دریافت نہ کیجیے ﴿وَ لَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِنْهُمْ اَحَدًا﴾ جو اس بات کا واضح پیغام ہے کہ آپ جوہر پر توجہ دیجیے غیر ضروری تفصیلات سے گریز کیجیے، لیکن الثعلبی (دار القلم بیروت چوتھا ایڈیشن بغیر تاریخ اشاعت ص ۴۱۳) اصحاب کہف کے بارے میں سب کچھ بتاتے ہیں، جنھیں پڑھ کر لگتا ہے کہ داستانِ الف لیلہ ولیلہ میں پہنچ گئے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ ترجمان القرآن کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن یہاں بھی ان کے اقوال متضاد ہیں، ایک جگہ وہ الرقیم کو مرقوم کے معنی میں بتاتے ہیں تو دوسرے قول کے مطابق وہ جگہ کا نام ہے اور تیسرے قول کے مطابق یہ ان الفاظ میں سے ہے جن کے معنی حضرت ابنِ عباس کو معلوم نہیں تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک حضرت ابنِ عباس کا کوئی قول سندی لحاظ سے مضبوط نہ ہو اس وقت تک، اسے قرآن کی ترجمانی نہیں سمجھا جاسکتا۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس قصے کی جو تفصیلات ہیں، وہ زیادہ تر افیسس یا افسوس کے غار سے متعلق معلومات سے ماخوذ ہیں۔ مختلف تفسیروں میں یہ واقعہ مختلف اسناد کے ساتھ مختلف طور پر بیان کیا گیا ہے لیکن اس بارے میں کوئی بھی روایت صحیح نہیں ہے، اس لیے یہی کہنا پڑے گا کہ ان تفصیلات کے بارے میں کوئی قطعی بات کہنا ناممکن ہے، قطعی تفصیلات تو صرف اسی قدر ہیں جتنی کہ قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

اس کتاب کا مقصد اصحابِ کہف کی تاریخی حیثیت کی تحقیق نہیں ہے اور نہ قرآن فہمی کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ اس کتاب کا اصل مقصد تو صرف اصحاب کہف کے غار کے انکشاف کی تفصیل بتانا ہے، دیگر تفصیلات کا ذکر ضمناً ہے تا کہ قارئین کو تشنگی کا احساس نہ ہو، نیز اس واقعے کے مختلف پہلو سامنے آجائیں۔ اسی غرض سے کتاب میں علماء و محققین کے کچھ مضامین بھی شامل کردیے گئے ہیں۔ تفسیر معارف القرآن سے شامل کیا گیا مضمون زیادہ مناسب نہیں لگا لیکن بہرحال معلومات سے خالی یہ بھی نہیں ہے، اس لیے اسے خارج نہیں کیا گیا۔ ان مضامین میں کہیں کہیں تکرار بھی محسوس ہوسکتی ہے لیکن صاحبِ

مضمون کا عندیہ بتانے کے لیے یہ تکرار ضروری تھی۔ نیز ان مضامین سے یہ بھی اندازہ
ہوجائے گا کہ کس نے، کہاں سے، حوالے یا بغیر حوالے کے، کتنا لیا ہے۔ علامہ سلیمان
ندویؒ کی ارض القرآن سے مجموعۂ مضامین میں کچھ شامل نہیں کیا جاسکا، اگر کتاب کی
دوسری اشاعت کی نوبت آئی تو ممکن ہے اس وقت مولانا کا کوئی مضمون یا عبداللہ یوسف
علی کے ترجمے سے کچھ معلومات شامل کی جاسکیں۔

اپنی طرف سے کسی وضاحت کے لیے اس طرح کے قوسین [ ] استعمال کیے گئے
ہیں۔ مولانا آزاد کے مضمون میں حاشیے پر دیے گئے عناوین کے لیے ترچھے حروف
(Italics) استعمال کیے گئے ہیں۔ یہ عناوین ترجمان القرآن کے لاہور ایڈیشن سے
لیے گئے ہیں۔ ساہتیہ اکادمی اور لاہور ایڈیشن میں کافی فرق ہے۔ آیتوں کی صحت
کا اہتمام کیا گیا ہے اور انہیں اوران میں آنے والے الفاظ کو آیتوں کے لیے مخصوص
توسین ﴿ ﴾ میں تحریر کیا گیا۔ اس کتاب میں، اردو میں استعمال ہونے والے عربی الفاظ
کو، غیر اضافتی صورت میں، عربی املے کے مطابق لکھا گیا ہے، کیوں ان الفاظ کو ہم، عربی
املے کے مطابق ہی بولتے ہیں، مثلاً ہم لکھتے تو مورخ لیکن بولتے مؤرخ ہی ہیں۔ اردو
کے مجدّدین حضرات میں سے کسی کو ناگوار گزرے تو پیشگی معذرت قبول فرمائیں۔ ہمارا
ارادہ تھا کہ تمام مشدّد الفاظ پر تشدید لگائی جائے لیکن اس پروگرام میں تشدید لگانے سے
بہت سے الفاظ کی شکل بدل جاتی ہے، اس لیے بہت سے الفاظ سے تشدید سے ہٹانی پڑی
ہے۔ اسی طرح ہِٹّی (Hitti) کو حِتی لکھا گیا ہے کیوں کہ یہ ایک عرب اسکالر ہیں اور عربی
میں ان کا نام اسی طرح لکھا جاتا ہیں۔

تفسیر کو تفسیر کی حیثیت دینے والے بہت کم حضرات ملیں گے۔ تفسیر میں نظریات کا
دخل یہاں بھی دیکھنے کو ملے گا۔ مولانا مودودیؒ نے آیت ﴿فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَانًا﴾
میں عمارت بنانے کا ترجمہ تیغا لگانا [بند کرنا] کردیا، دوسرے لوگوں نے اس سے مزاروں
پر مسجد یا درگاہ وغیرہ بنانے کے جواز کا استشہاد کرلیا۔ کچھ لوگوں نے غار پر مسجد بنانے
والوں کی رائے دینے والوں کو کافر بتادیا اور اہلِ حق وہ تھے جو عمارت بنانے اور بقول

مولانا مودودی تیغا لگانے کو کہہ رہے تھے، جب کہ قرآن میں اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں
ہے۔ قرآن نے تو صرف اتنا کہا ہے کہ اس وقت لوگوں میں اختلاف ہورہا تھا، کچھ لوگوں
نے کہا یادگار عمارت بنادو، لیکن جن کی رائے کو غلبہ حاصل ہوا یا جو اس اختلاف میں غالب
رہے، انہوں نے مسجد بنانے کی رائے رکھی۔ ایسے معاملوں میں اختلافِ رائے، عام ہے،
عوامی کاموں میں معمولی معمولی باتوں میں اختلاف دیکھنے کو ملتا ہے، اس لیے عوامی پلیٹ
فارموں پر اصلاحی کام مشکل ہوجاتے ہیں۔ اب اس بارے میں مزاروں وغیرہ کے تناظر
میں یہ رائے بنالینا کہ یہ آیتیں مزاروں کے حق میں ہیں یا خلاف ہیں، قرآنی سیاق کے
خلاف ہیں۔ مزید یہ کہ تمام روایتیں اس پر بھی متفق ہیں کہ جس بادشاہ کے زمانے میں
اصحابِ کہف کا ظہور ہوا، وہ حق پرست وموحد تھا، پھر وہ غلط کام کی اجازت کیسے دیتا!۔
قرآن مجید کو اس کے سیاق میں ہی سمجھنا ضروری ہے اسے اپنے نظریات کے لیے تختۂ
مشق بنانا بڑی ناانصافی ہے۔

ایک بات اور محسوس ہوئی وہ یہ کہ آیت ﴿وَ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ میں غار کے منظر
کے خوفناک ہونے کی تشریح، حضرت مولانا مودودیؒ نے تفہیم القرآن میں اس طرح کی
ہے،۔ ایک ایسا دہشت ناک منظر پیش کرتا کہ جھانکنے والے، ان کو ڈاکو سمجھ کر بھاگ
جاتے تھے۔

یہ تشریح بڑی عجیب لگی، ہوسکتا ہے سبقتِ قلم کا نتیجہ ہو۔ دہشت ناک منظر کے لیے
چوروں، ڈاکوؤں کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ بعض جگہوں کا ماحول اور کیفیت دہشت ناک
منظر پیدا کرسکتی ہے۔ آدمی کہیں جنگل یا ویرانے میں جائے اور کسی غار کے دہانے پر ایک
کتے کو اگلے پیر پھیلائے دیکھے اور پھر غار میں کچھ لوگوں کو سونے کی سی کیفیت میں دیکھے،
اسے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوگا اور اسے خیال ہوگا، پتا نہیں کون ہیں، جن ہیں کہ بشر
وغیرہ اور ہوسکتا ہے کہ ان کی ہیئت بھی کچھ ایسی ہو کہ انہیں دیکھ کر خوف آتا ہو۔ یہ بات،
شخصیات میں بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ بعض اشخاص ایسے ہوتے ہیں، جنہیں بغیر جانے
ہوئے بھی آدمی دیکھ کر مرعوب ہوجاتا ہے۔ پھر رات کی تنہائی میں حتیٰ کہ بسا اوقات دن

میں بھی قبرستان، جنگل یا صحراء ایک دہشت ناک منظر پیش کرتا ہے۔ وہ علاقہ قبرستان کے طور پر بھی استعمال ہوتا تھا۔

اس کتاب کا قصہ بہت پرانا ہے، ۱۹۸۰ء کی ابتدائی دہائی میں، میں نے مذکورہ بالا دونوں کتابوں کے عارضی ترجمے کا مسودہ تیار کرلیا تھا، بس دونوں کی معلومات کو یکجا کر کے ایڈٹ کرنا باقی تھا لیکن موقع ہی نہیں مل پایا اور وہ کاغذات بوسیدہ ہوتے چلے گئے، پھر یہ خیال بھی رہا، مجھ سے علم میں زیادہ بہت لوگ ہیں، اور ان کی معلومات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، کوئی نہ کوئی یہ کام ضرور کرلے گا، اس وجہ سے ارادہ ترک کردیا، بلکہ اردن میں قیام کے دوران بھی اس طرف دھیان نہیں گیا، لیکن اتنا طویل عرصہ گزر جانے کے بعد بھی، میری نظر سے اس موضوع پر، کوئی کام نہیں گزرا اس لیے مسودے کی ورق گردانی کر کے مواد تیار کیا اور اسے کمپیوٹر میں داخل بھی کرادیا اور اسے تقریباً آخری شکل دے دی، لیکن خدا کا حکم ایسا ہوا کہ وہ ایک ٹیکنیشین کی غلطی سے کمپیوٹر سے بالکل صاف ہوگیا، اس کا پرنٹ نہ ہونے کی وجہ سے کام تقریباً ازسرنو کرنا پڑا۔

غالباً یہ کام موجودہ شکل میں بھی نہیں ہو پاتا، اگر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اس کی طباعت کے لیے جزوی مالی تعاون منظور نہ کیا ہوتا۔ اس کے لیے میں کونسل کے ذمہ داران کا بے حد شکر گزار ہوں۔

وقت کی کمی کے باعث یہ کتاب اس طرح پیش نہیں ہوسکی، جس طرح پیش کی جانی چاہیے تھی۔ بعض معلومات تجدید چاہتی ہیں، پھر عموماً عربی اور اردو کی کتابوں میں لاطینی یا انگریزی حروف میں لکھے لفظوں کی تحقیق ضروری ہوتی ہے اور اس کتاب میں تو یونانی وغیرہ کے مآخذ کا بھی ذکر ہے، ہم اس تحقیق کا حق ادا نہیں کر پائے ہیں۔ اس کی وجہ وقت کی کمی کے ساتھ ساتھ مآخذ کی عدم دستیابی ہے۔ کچھ نئی تصاویر بھی شامل کی جانی ضروری تھیں لیکن ایک صاحب نے جنہوں نے حال ہی میں اصحابِ کہف کے غار کی زیارت کی ہے اور کچھ تصویریں بھی کھینچی ہیں، اس کتاب کے لیے تصویریں دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ اپنی افسرانہ مصروفیتوں کی بنا پر ایسا نہیں کر پائے۔ اگر آئندہ کچھ تصویریں حاصل ہوسکیں

تو انشاء اللہ اگلی اشاعت میں شامل کی جائیں گی۔

بہر حال دنیا کا نظام ہے کہ کوئی کام بغیر دوسرے کے تعاون کے مکمل نہیں ہوتا، اس سلسلے میں، میں مولانا رحمت اللہ فاروقی (سب ایڈیٹر قومی آواز دہلی)، ڈاکٹر عبد المعز، لکچرر، شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی اور ڈاکٹر شمس کمال انجم کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کا مسودہ پڑھا اور اپنے مفید مشوروں سے نوازا، ڈاکٹر شمس کمال انجم نے مسودہ پڑھنے کے علاوہ بعض آیات پر اعراب (زیر و زبر وغیرہ) لگانے اور بعض صفحات کو کمپیوٹر پر لکھنے کا کام بھی انجام دیا۔ ڈاکٹر نعیم الحسن اثری لکچرر، شعبۂ عربی دہلی یونیورسٹی بھی شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت ضائع کر کے اس کام کو کمپیوٹر پر لانے کا کام انجام دیا، فجزاهم الله خير الجزاء۔

بڑی ناسپاسی ہوگی اگر میں اپنی شریکِ حیات شاکرہ سبحانی کا شکریہ ادا نہ کروں، جنہوں نے گھر کے کاموں سے وقت نکال کر بسا اوقات مسودات پڑھنے میں میری مدد کی۔

مجھے بے انتہا خوشی ہوگی اگر کوئی صاحب کتاب میں رہ جانے والی کوتاہیوں کی طرف میری توجہ دلائیں گے۔

اللہ سے دعاء ہے کہ وہ اس کام کو قبول فرمائے اور بہتری کی توفیق دے۔

وما توفيقي الا بالله.

محمد نعمان خاں
شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی

سورۂ کہف کا تعارف

سورۂ کہف قرآن مجید کی اٹھارویں سورت ہے، جس میں ۱۱۰ آیتیں ہیں، یہ سورت مکّی ہے اور قرآن مجید کے چار اہم قصوں پر مشتمل ہے، جن میں سب سے پہلے اصحابِ کہف یا غار والوں کا قصہ ہے جس کی اہمیّت کے پیشِ نظر، اس سورت کا نام سورۂ کہف قرار پایا۔ دوسرا انگور کے دو باغ والے شخص کا قصہ ہے۔ تیسرا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بندۂ خدا (خضر) کا ہے، جنہیں علم لدنّی سے سرفراز کیا گیا تھا۔ چوتھا قصہ ذوالقرنین کا ہے۔

ان تمام واقعات کا تعلق، اللہ تبارک وتعالیٰ کی بے انتہا قدرت سے ہے، جس نے اصحابِ کہف کو تین سو نو سال یا اس سے کم یا زیادہ مدّت تک سلائے رکھنے کے بعد زندہ کر دکھایا۔ دو باغ والے کو کفرانِ نعمت اور تکبّر وغرور میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے، اس کو دی گئی تمام نعمتوں سے محروم کر دیا، پھر اس کی کوئی مدد نہ کر سکا۔

نبی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ سمجھانے کے لیے کہ تمہیں جو علم دیا گیا ہے وہ ایک محدود دائرے کا علم ہے، ایک بندۂ خدا (حضرت خضر) کے پاس بھیجا گیا جس کے علم کی نوعیّت دوسری تھی اور اس کا دائرۂ کار بالکل مختلف تھا۔ ع

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

یہاں ایک بات بڑی قابل توجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام باوجود اس کے کہ تمام مسافت صرف اس لیے طے کر کے آئے تھے کہ حضرت خضر سے اللہ کے حکم کے مطابق کچھ علم حاصل کریں، لیکن ان کے مقام نبوت نے اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ دنیاوی شریعت کے خلاف کوئی بات قبول کر سکیں، اس لیے باوجود کوشش بسیار نہ وہ ان کے ساتھ رہ سکے، اور نہ ہی ان کے مافوق الشریعت اور نظام دنیا کے خلاف امور کو برداشت کر سکے۔ وہ (حضرت خضر) بھی سمجھ رہے تھے کہ جو میں کر رہا ہوں وہ دنیاوی شریعت کے خلاف ہے،

اور اسے برداشت کرنا مقام نبوت کے خلاف ہے، اس لیے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے علم سکھانے کی درخواست کی تو انہوں نے شروع ہی میں فرمایا:

اے موسیٰ، میرے ساتھ صبر نہ کر پاؤ گے، جسے آپ جانتے نہیں اور جس کا آپ کو تجربہ نہیں اس پر آپ کیسے صبر کر سکتے ہیں؟!

﴿إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا☆ وَ كَيْفَ تَصْبِرُ عَلَى مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا﴾

اس کے بعد جب انہوں نے اپنے تکوینی امور کا مظاہرہ کیا، تو وہ سب چوں کہ شریعت اور دنیاوی نظام کے خلاف تھے اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام باوجود چاہنے کے اسے برداشت نہ کر پائے اور آخر دونوں کو ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑنا پڑا۔

حضرت خضر جانتے تھے کہ وہ جو کر رہے ہیں وہ دنیا میں چلنے والے نظامِ قدرت اور اس کے لیے ملی شریعت کے خلاف ہے، اس لیے انہوں نے بعد میں اس کی وضاحت کی اور یہ بھی بتایا کہ یہ جو کچھ میں نے کیا ہے، وہ سب خدا کے حکم سے کیا ہے، اپنی طرف سے کچھ نہیں کیا: ﴿وَ مَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي﴾۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مقام نبوت کے لیے کیسے اشخاص کا انتخاب کیا جاتا ہے بلکہ یہ کہیے کہ کیسے اشخاص کو تیار کیا جاتا ہے۔

چوتھے قصے میں ذوالقرنین کا ذکر ہے، جنہیں ان کے صلاح اور تقوے کی وجہ سے ملکِ بیکراں اور بڑی طاقت سے نوازا جس کی بنیاد پر، انہوں نے یاجوج ماجوج جیسی زبردست قوم کو روکنے کے لیے، ایک زبردست دیوار، دو پہاڑوں کے درمیان تانبا پگھلا کر قائم کر دی۔

سورۂ کہف کی فضیلت

سورۂ کہف کی فضیلت میں بہت سی احادیث وارد ہوئی ہیں، جن میں شروع یا آخر کی دس آیات کے بارے میں آیا ہے کہ جو ان کو یاد کرے گا اور پڑھے گا، وہ فتنۂ دجال سے محفوظ رہے گا۔ یہ احادیث، بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد اور مسندِ احمد وغیرہ سب میں ہیں۔ یہاں کچھ حدیثیں بیان کی جاتی ہیں۔

اللؤلؤ و المرجان (ص ۱۵۳ حدیث نمبر ۴۵۸) میں حضرت البراء بن عازب کی متفق علیہ (یعنی بخاری و مسلم دونوں میں موجود) حدیث میں آیا ہے:

ایک صحابیؓ نے سورۂ کہف پڑھی، گھر میں ایک جانور بھی تھا، (اچانک) وہ بدکنے لگا، آپ نے خیر کی دعا اور سلامتی چاہی، تو کیا دیکھتے ہیں کہ انہیں بدلی یا کہر نے ڈھانپ رکھا ہے، صحابیؓ (مذکور) نے جب اس کا ذکر حضور اکرم ﷺ سے کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: (اسے) پڑھا کرو، وہ سکینت تھی جو قرآن کے لیے یعنی اس کی وجہ سے نازل ہوئی تھی۔

اسی طرح اللؤلؤ و المرجان میں مذکور اگلی حدیث (نمبر ۴۵۹) میں حضرت اُسید بن حُضیرؓ کی حدیث ہے جس میں ان کے سورۂ بقرہ پڑھنے کا ذکر ہے، انہوں نے فرشتوں کا تخت دیکھا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے حضرت اسید سے فرمایا اگر تم پڑھتے رہتے تو فرشتے چھپ نہ پاتے اور لوگ انہیں دیکھتے۔

سکینت کی تشریح حاشیے میں یہ کی گئی ہے کہ معتبر بات یہ ہے کہ وہ خدا کی ایسی مخلوق ہے، جس میں سکون و اطمینان اور رحمت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ فرشتے ہوتے ہیں۔

مختصر تفسیر ابن کثیر میں مندرجہ ذیل حدیثیں بیان کی گئی ہیں:

(۱) عن أبي الدرداء، عن النبي ﷺ قال: من حفظ عشر آيات من أول سورة الكهف عصم من الدجال. (رواه مسلم و أبوداؤد و النسائي و الترمذي)

حضرت ابوالدرداء سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جس نے سورۂ کہف کے شروع کی دس آیتیں حفظ کر لیں وہ دجال سے محفوظ ہو گیا۔

(۲) قال الإمام أحمد عن أبي الدرداء عن النبي ﷺ قال: من قرأ العشر الأواخر من سورة الكهف عصم من فتنة الدجال (رواه مسلم أيضا و النسائي، و في لفظ النسائي: من قرأ عشر آيات من الكهف ... الخ)

حضرت ابوالدرداء ہی سے مروی ہے کہ جو سورۂ کہف کی آخری دس آیتیں پڑھے گا وہ دجال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔ (نسائی میں صرف دس آیات کا ذکر ہے شروع یا آخر کی قید نہیں)۔

شانِ نزول

اس میں کوئی شک نہیں کہ شانِ نزول سے متعلق روایتیں آیتوں کے سمجھنے میں معاون ہوتی ہیں، لیکن آیتوں یا سورتوں کو کسی واقعے یا حادثے کے ساتھ مقید و محدود نہیں

کیا جاسکتا، کیوں کہ قرآن مجید کا مقصد ہدایت ورہنمائی اور تہذیبِ نفس ہے، اور اس کے مخاطب تمام انس و جن ہیں۔ سورۂ کہف کے نزول کے بارے میں آتا ہے:

جب قریشیوں کے سارے حربے، بے کار ہوگئے تو انہوں نے اہلِ کتاب (یہودیوں) کے ذریعے حضور اکرم ﷺ کو لاجواب کرنا چاہا، چنانچہ انہوں نے النّضر بن الحارث اور عُقبہ بن ابی مُعیط کو یہود کے بڑے بڑے علماء کے پاس بھیجا، اور ان سے کہا تم جا کر محمد کے بارے میں دریافت کرو اور ان کے بارے میں ساری تفصیل بتاؤ، اور وہ جو کہتے ہیں وہ بھی انہیں بتاؤ کیوں کہ وہ پرانے اہل کتاب ہیں، ان کے پاس انبیاء کا علم ہے جو ہمارے پاس نہیں ہے، وہ دونوں مدینے پہنچے اور یہود کے بڑے علماء سے حضور اکرم ﷺ کے بارے میں دریافت کیا اور ان کے بارے میں تفصیل بتائی اور ان کے بعض اقوال بھی نقل کیے اور کہا: تم توریت والے ہو اس لیے ہم تمہارے پاس آئے ہیں تاکہ تم ہمارے اس آدمی کے بارے میں ہمیں بتاؤ، یہودی علماء نے کہا ان سے تین باتوں کے بارے میں دریافت کرو جو ہم تمہیں بتاتے ہیں، اگر وہ بتا دیں تو سمجھو وہ اللہ کے بھیجے ہوئے نبی ہیں، اگر نہ بتا پائیں تو وہ باتیں گھڑنے والے ہیں پھر تم ان کے بارے میں جو مناسب سمجھو، کرو۔ ان سے ان نوجوانوں کے بارے میں دریافت کرو جو پرانے زمانے میں چلے گئے تھے، ان کا کیا معاملہ تھا؟ ان کا ایک عجیب وغریب واقعہ ہے۔ اس سیاح شخص کے بارے میں معلوم کرو جو دنیا کے تمام مشرقی اور مغربی حصوں میں گھوما پھرا تھا، اس کا کیا قصہ تھا؟ اور روح کے بارے میں سوال کرو کہ روح کیا ہے؟۔ اگر وہ (حضرت محمد) ان باتوں کا جواب دے دیں تو ان کی اتباع کرو، یقیناً وہ نبی ہیں، اگر جواب نہ دے پائیں تو سمجھو کہ وہ اپنی طرف سے باتیں بنانے والے ہیں، پھر جو تمہاری سمجھ میں آئے برتاؤ کرو۔ اب النضر بن الحارث اور عقبہ قریش کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں: اے قریش کے لوگو! ہم تمہارے اور محمد کے درمیان فیصلہ کر دینے والی بات لے کر آئے ہیں، یہودی علماء نے کچھ ایسی باتیں ہمیں بتائی ہیں اگر محمد نبی ہیں تو ان کا جواب دے پائیں گے، اگر جواب نہ دے پائیں تو سمجھ لو کہ وہ اپنی طرف سے باتیں بنانے والے ہیں اور پھر تمہارے جی میں جو آئے ان کے ساتھ برتاؤ کرو۔

اب وہ تینوں باتوں کے بارے میں حضور اکرم ﷺ سے سوال کرتے ہیں، آپ فرماتے ہیں کل جواب دوں گا، انشاء اللہ کہنا بھول گئے۔ اس کے بعد جیسا کہ کہا جاتا ہے، پندرہ دن گزر گئے اور کوئی وحی نہیں آئی اور نہ ہی حضرت جبرئیلؑ نے اپنی شکل دکھائی۔

اب اہل مکہ میں طرح طرح کی باتیں پھیلنے لگیں، وہ کہنے لگے محمد نے کل کا وعدہ کیا تھا اور اب پندرہ روز گزر گئے، کوئی جواب نہ دے پائے۔ آپ ﷺ پر ان کی چہ میگوئیاں بڑی گراں گزریں اور آپ وحی نہ آنے پر غمگین ہو گئے، اب حضرت جبریلؑ سورۂ کہف لے کر آتے ہیں اور روح کے بارے میں خبر بھی۔ (ابن ہشام: السیرۃ النبویۃ ۱/۳۲۱)۔

یہ تاخیر بھی مصلحت سے خالی نہ تھی، اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں مزید اشتیاق پیدا ہو جائے، اور وہ یہ بھی جان لیں کہ حضرت محمد ﷺ اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہتے، بلکہ جو پیغام خدا تعالیٰ کے پاس سے آتا ہے، وہی لوگوں تک پہنچاتے ہیں: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَى ، إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوْحَى﴾ سورۃ النجم ۳۔۴ اور وہ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں بولتے ہیں، وہ تو (یعنی جو وہ بولتے ہیں) وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔

قرآنِ کریم میں اصحابِ کہف کا واقعہ

(سورۃ الکھف ۹۔۲۶)

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحَابَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ، كَانُوْا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا☆ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى الْكَهْفِ، فَقَالُوْا: رَبَّنَا آتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً، وَّ هَيِّءْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا☆ فَضَرَبْنَا عَلٰى آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا☆ ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ، لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا☆ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ، اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ، آمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنَاهُمْ هُدًى☆ وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ، اِذْ قَامُوْا، فَقَالُوْا: رَبُّنَا رَبُّ السَّمَاوَاتِ وَ الْاَرْضِ، لَنْ نَّدْعُوَ مِنْ دُوْنِهِ اِلٰهًا، لَّقَدْ قُلْنَا اِذًا شَطَطًا☆ هٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهِ آلِهَةً، لَوْلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ، فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا☆ وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ، فَاْوُوْا اِلَى الْكَهْفِ، يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ، وَ يُهَيِّءْ لَكُمْ مِنْ اَمْرِكُمْ مِرْفَقًا☆ وَ تَرَى الشَّمْسَ

اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ، وَ اِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ، وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ، ذٰلِكَ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ، مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ، وَ مَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا☆ وَ تَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ، وَّ نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ، وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ، لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا☆ وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنَاهُمْ، لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ، قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ: كَمْ لَبِثْتُمْ؟ قَالُوْا: لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ، قَالُوْا: رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ، فَابْعَثُوْا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ، فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا، فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ، وَلْيَتَلَطَّفْ، وَ لَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا☆ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ، يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ، وَ لَنْ تُفْلِحُوْٓا اِذًا اَبَدًا☆ وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ، لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ، وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا، اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ، فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا، رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ، قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ: لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا☆ سَيَقُوْلُوْنَ: ثَلٰثَةٌ، رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ، وَيَقُوْلُوْنَ: خَمْسَةٌ، سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ، وَ يَقُوْلُوْنَ: سَبْعَةٌ، وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ، قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ، مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ، فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا، وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا☆ وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا☆ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ، وَ اذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ، وَ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا☆ وَ لَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا☆ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا، لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ، اَبْصِرْ بِهٖ وَ اَسْمِعْ، مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ، وَّ لَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا☆

کیا آپ کا خیال ہے کہ کہف ورقیم والے ہماری نشانیوں میں بہت عجیب وغریب تھے؟ ☆ ان چند نوجوانوں نے جب غار میں پناہ لی تو دست بدعا ہوئے: اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما، اور ہمارے کام میں ہمارے لیے راہ یابی کا سامان مہیا فرما☆ چنانچہ ہم نے کئی برس کے لیے غار میں ان کے کان تھپتھپا دیے (یعنی انہیں سلا دیا) ☆ پھر ہم نے ان کو (جگا) اٹھایا تاکہ ہم دیکھ لیں کہ دو گروہوں میں سے کس نے (غار میں) رہنے کی مدت زیادہ (صحیح) یاد رکھی ہے☆

(اے نبی!) ہم ان کا واقعہ ٹھیک ٹھیک آپ سے بیان کرتے ہیں، وہ چند نوجوان تھے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے، اور ہم (دن بدن) ان کو زیادہ ہدایت دیتے گئے☆ اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا، جب (بادشاہ وقت نے انہیں شرک پر مجبور کیا تو) وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بول اٹھے: ہمارا پروردگار تو وہی ہے جو آسمان وزمین کا پروردگار ہے، ہم تو اس کے سوا کسی (دوسرے) معبود کو پکارنے والے ہیں نہیں، اگر ہم نے ایسا کیا تو بڑی بے جا بات کہی☆ یہ ہے ہماری قوم جس نے اس (خدا) کے سوا اور معبود بنا رکھے ہیں، ان کی (خدائی کی) یہ کوئی کھلی دلیل پیش کیوں نہیں کرتے! جو شخص خدا پر جھوٹ بہتان باندھے اس سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوسکتا ہے! ☆ جب تم نے ان لوگوں سے اور ان سے جن کی یہ (خدا کے سوا) پوجا کرتے ہیں، علیحدگی اختیار کر لی ہے تو (چلو فلاں) غار میں چل بیٹھو، تمہارا پروردگار اپنی رحمت (کا سایہ) تم پر پھیلا دے گا، اور تمہارے لیے تمہاری مہم میں سہولت (کے سامان) مہیا کر دے گا☆

(اے مخاطب) تم دیکھو گے کہ جب سورج نکلتا ہے تو ان کے غار سے داہنی طرف بچا ہوا رہتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو کترا جاتا ہے، وہ غار کے اندر بڑی کشادہ جگہ میں ہیں۔ یہ (بھی) اللہ (کی قدرت) کی نشانیوں میں سے ہے۔ جسے خدا ہدایت دے وہی صحیح راستے پر ہے، جسے وہ گمراہ کر دے تو کوئی کارساز راہ دکھانے والا نہ پاؤ گے☆

(اے مخاطب) تم انہیں جاگتا ہوا سمجھتے ہو حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔ اور ہم ان کو داہنی طرف اور بائیں طرف کروٹیں دلواتے جاتے ہیں۔ اور ان کا کتا چوکھٹ پر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے بیٹھا ہے۔ (اے مخاطب) اگر تم ان کو (اس حال میں اوپر سے) جھانک کر دیکھتے تو ضرور الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور ان (کی صورتِ حال سے) تم میں ایک دہشت سما جاتی ☆ (اور جس طرح ہم نے ان کو اپنی قدرت سے سلا دیا تھا) اسی طرح ہم نے ان کو (اپنی قدرت سے جگا) اٹھایا، تاکہ (سونے کی مدت کے بارے میں) آپس میں پوچھ گچھ کر لیں۔ (چنانچہ) ایک کہنے والے نے کہا: (کیوں بھئی بھلا، اس غار میں) تم کتنی مدت ٹھہرے ہوگے؟ وہ بولے: ہم (بہت رہے ہوں گے تو) ایک دن یا اس سے بھی کم۔ (آخر

سب ہار کر) بول اٹھے: کتنی مدت تم ٹھہرے رہے، اس کا علم پوری طرح اللہ ہی کو ہے، تو (اب) اپنے میں سے ایک کو اپنی یہ چاندی (یعنی سکے) لے کر شہر بھیجو کہ وہ (جا کر) دیکھے کہ کونسا کھانا پاکیزہ تر ہے، تو اس میں سے کچھ کھانا تمہارے لیے لے آئے، نرمی اور احتیاط کا معاملہ برتے اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے☆ (کیوں کہ) اگر (تمہاری قوم کے) لوگ تمہاری خبر پا جائیں گے تو تمہیں (آ کر) سنگسار کر دیں گے، یا تم کو پھر اپنے دین میں لوٹا لیں گے اور (پھر) تم کبھی بھی کامیاب نہ ہو پاؤ گے☆ (جس طرح ہم نے انہیں سلایا، پھر اٹھایا) اسی طرح ہم نے (ان کی قوم کے لوگوں کو) ان پر مطلع کیا، تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ بالکل سچا ہے اور یہ کہ قیامت (کے آنے) میں کوئی شک وشبہے (کی گنجائش) نہیں۔

[اس کے بعد] جب [لوگوں نے معجزہ دیکھ لیا اور شہر والوں کو اللہ اور آخرت پر پورا یقین ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی روح قبض فرمالی تو] لوگ ان کے بارے میں آپس میں جھگڑنے لگے۔ (بعض نے) کہا: ان (کے غار) پر (یادگار کے طور پر) ایک عمارت کھڑی کر ڈالو، ان کے بارے میں ان کا پروردگار ہی زیادہ بہتر جانتا ہے۔ ان کے بارے میں جن کی رائے غالب رہی انہوں نے کہا ہم تو ان (کے غار) پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے☆

(کچھ) لوگ کہیں گے کہ (اصحاب کہف) تین تھے، چوتھا ان کا کتا، کچھ کہیں گے پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا، (یہ سب) غیب (کی باتوں) میں انکل (سے تیر چلانے کے مرادف) ہے۔ اور بعض کہیں گے (اصحابِ کہف) سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا (تو اے نبی) آپ کہہ دیجیے کہ ان کی (صحیح) گنتی میرا پروردگار ہی خوب جانتا ہے، انہیں بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں۔

(اے نبی) آپ ان کے بارے میں سرسری طور کے علاوہ بالکل بحث ومباحثہ نہ کریں اور کسی سے ان کے بارے میں پوچھ تاچھ (بھی) نہ کریں☆

[اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ حضور اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے مسلمانوں کو ہدایت فرماتا ہے] کسی بھی چیز کے بارے میں ہرگز یہ نہ کہا کرو کہ میں یہ (کام) کل [یعنی آئندہ کسی بھی وقت] کر لوں گا مگر (یہ کہہ کر کہ) اللہ چاہے (تو یہ کام کل کروں گا)۔ اگر (انشاء اللہ کہنا) بھول جاؤ تو (انشاء اللہ کہہ کر) اپنے پروردگار کو یاد کر لیا کرو، اور کہو کہ مجھے امید ہے کہ میرا پروردگار اس

سے (بھی) زیادہ ہدایت سے قریب (بات کی طرف) میری راہنمائی فرمائے گا☆

[اب اصل قصّے کی طرف رجوع ہوتا ہے] اور اصحابِ کہف اپنے غار میں تین سو سال تک رہے اور نو (سال اور) زیادہ گزارے☆ آپ کہہ دیں کہ اللہ (ہی) خوب جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت (غار میں) رہے، آسمان وزمین کے غیب کا (علم) اسی کو ہے۔ کیا ہی (اچھا) دیکھنے والا اور کیا ہی (اچھا) سننے والا ہے وہ! لوگوں کا اس کے سوا کوئی کارساز ومددگار نہیں اور نہ وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک کرتا ہے۔

قرآنِ کریم میں مذکور اصحابِ کہف کے قصّے کا خلاصہ

۱۔ دنیا میں اصحاب کہف ہی کا واقعہ کوئی بہت بڑا عجوبہ نہیں ہے (بلکہ دنیا میں اس سے بھی بڑھ کر عجیب وغریب نشانیاں موجود ہیں، جن میں خود انسان وکائنات کی پیدائش ہے)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ سے رحم وکرم کی درخواست کرتے ہوئے انہوں نے غار میں پناہ لی۔

۳۔ جب انہوں نے اللہ تعالیٰ پر بہتان نہ باندھنے کا عزم کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا اور ان کے عزم کو تقویت دی۔

۴۔ انہوں نے یہ فیصلہ لیا کہ جب اہل باطل کے کفریہ اعمال کو ٹھہرنا ہی چھوڑنا تو کیوں نہ ان سے کنارہ کشی کر لی جائے اور غار میں پناہ لے لی جائے۔

۵۔ وہ جس غار میں پناہ گزیں ہوئے اس کی کیفیت ایسی تھی کہ طلوع وغروب کے وقت سورج ان پر براہ راست نہیں پڑتا تھا بلکہ ان سے کٹ جاتا تھا۔

۶۔ وہ غار کے اندر ایک کشادہ مقام یا چبوترے (فجوۃ) پر تھے۔

۷۔ غار کی یہ خصوصی کیفیت بذاتِ خود اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔

۸۔ ان کی کیفیت یہ تھی کہ دیکھنے والا انہیں جاگتا ہوا تصور کرتا تھا حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے۔

۹۔ اللہ تعالیٰ انہیں دائیں بائیں کروٹ دلا رہا تھا۔

۱۰۔ ان کا کتا اپنے دونوں اگلے پیر پھیلائے چوکھٹ پر بیٹھا تھا

۱۱۔ ان کے منظر کی کیفیت ایسی تھی کہ کوئی وہاں پہنچ جائے تو ڈر کر بھاگ کھڑا ہو۔

۱۲۔ سو کر اٹھنے کے بعد انہوں نے ایک دوسرے سے سونے کی مدّت دریافت کی، وہ سونے کی مدّت کا اندازہ نہیں کر پا رہے تھے، اب انہیں بھوک محسوس ہو رہی تھی اس لیے خفیہ طور پر کھانا منگانے کی فکر ہوئی۔

۱۳۔ ان کو اس لیے بیدار کیا گیا تا کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شک وشبے کی گنجائش نہیں۔

۱۴۔ اس جگہ کچھ تعمیر کرنے کے بارے میں لوگوں میں اختلاف رائے ہوا، آخر کار وہاں ایک عبادت گاہ بنانے کا فیصلہ ہوا۔

۱۵۔ تعداد کے بارے میں تین قول بیان کیے گئے ہیں۔ پہلا، اصحاب کہف تین، چوتھا ان کا کتا، دوسرا، اصحابِ کہف پانچ، چھٹا ان کا کتا، ان دونوں اقوال کے بارے میں فرما دیا کہ یہ تو اٹکل سے تیر چھوڑنے کے مانند ہیں، یعنی ان اقوال میں کوو زن نہیں۔ پھر تیسرا قول بیان فرمایا کہ اصحابِ کہف سات اور آٹھواں ان کا کتا۔ اس قول کے بعد فرمایا: ''(تو اے نبی) آپ کہہ دیجیے کہ ان کی (صحیح) گنتی میرا پروردگار ہی خوب جانتا ہے، انہیں بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں'' (الکہف ۲۲)۔

اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ پہلے دو اقوال کا اصحاب کہف کی تعداد سے کوئی تعلق نہیں البتہ تیسرا قول اگر صحیح نہیں بھی ہے تو حقیقت سے قریب تر ضرور ہے۔

اس بیان اختلاف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود اہل کتاب کے درمیان اس وقت تعداد کے بارے میں اختلاف تھا۔ قرآن مجید کا ایک مقصد اہل کتاب کی کتابوں کی تصدیق وتنقیح ہے، اس لیے قرآن مجید نے تقریبی تعداد کی نشاندہی کی ہے۔

۱۶۔ اس کے بعد فرمایا: ''ان (اصحاب کہف) کے بارے میں سرسری بحث ومباحثہ کیجیے، (زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں)، اور کسی سے ان کے بارے میں دریافت بھی نہ کیجیے۔'' (الکہف ۲۲)

یعنی اب آپ ﷺ کو مزید تحقیق وجستجو میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے، جو کچھ بتا دیا گیا وہی حقیقت ہے، بس مقصد برآری کے لیے اتنی ہی معلومات کافی ہیں، کیوں کہ قرآن کا مقصد قصہ گوئی اور کہانیاں سنانا نہیں ہے، اس لیے کہ جب آدمی ذیلی چیزوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے تو اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے، اسی لیے آں حضرت ﷺ کے اقوال میں ہمیں کسی قسم کی تفصیل نہیں ملتی ہے۔

۱۷۔ ان کے کہف میں قیام کی مدّت تین سو نو سال بیان فرمائی اور اندازِ بیان یہ اختیار فرمایا: ﴿وَ لَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا☆قُلِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا، لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْأَرْضِ﴾ (الکہف، آیت ۲۵) یعنی اصحابِ کہف اپنے غار میں تین سو سال تک ٹھہرے رہے اور نو سال اور زیادہ گزارے ☆ آپ کہہ دیں اللہ ہی کو ان کے ٹھہرے رہنے کی پوری مدّت کا بخوبی علم ہے، اسی کو آسمانوں اور زمینوں کے غیبی (امور) کا علم حاصل ہے۔

براہ راست تین سو نو سال نہیں کہا۔ مصلحت یہ معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید کا کلنڈر قمری ہے اور یہ واقعہ عیسائی مذہب کے پیروکاروں کا ہے اور ان کے یہاں شمسی تقویم کا رواج رہا ہے، اس لیے دونوں حساب سے مدّت بیان فرما دی۔ اس کے بعد بھی حقیقی مدّت کا علم اللہ کے سپرد کیا گیا کیوں وہی حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔

عام مفسّرین کی رائے یہ ہے کہ یہ مدّت اللہ تعالیٰ نے قمری اور شمسی لحاظ سے بیان کی ہے لیکن بعض کا کہنا ہے کہ یہ اختلاف مدّت بھی لوگوں کا قول ہے۔

اصحابِ کہف کا قصہ دیگر تفصیلات کی روشنی میں

اصحاب کہف کا قصہ مختلف طریقوں پر مختلف مآخذ میں بیان کیا گیا ہے، لیکن کسی صحیح روایت میں اس کا ذکر تفصیل سے نہیں آیا ہے۔ یہاں قصے کی عام تفصیلات بیان کی جارہی ہیں، باقی قابل اعتبار وہی باتیں ہیں جو قرآن میں مذکور ہیں باقی باتوں کے بارے میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

یہ واقعہ قرآن مجید سے قبل کسی مقدس کتاب میں بیان نہیں ہوا ہے کیوں کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اور حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے کافی پہلے ظہور پذیر ہوا ہے۔

اصحاب کہف، بڑے گھرانے کے ہم عمر رومی نوجوان تھے۔ ان کی تعداد سریانی مآخذ کے مطابق آٹھ اور یونانی و مغربی مراجع کے مطابق سات تھی۔ وہ عیسائی مذہب کے مطابق (جو اس وقت کا اسلام تھا) ایک اللہ پر ایمان لے آئے اور بلا شرکت غیرے اس کی عبادت کرنے لگے۔ یہ ایسے رومی بادشاہ کے زمانے میں تھے جو بڑا سرکش و ظالم و بت پرست تھا اور لوگوں کو اپنے دیوی دیوتاؤں پر چڑھاوے چڑھانے پر مجبور کرتا تھا اور اللہ کو چھوڑ کر لوگوں سے ان کی پوجا کراتا تھا، رومی علاقوں میں گاؤں گاؤں جاتا اور کسی کو عیسائی مذہب پر مصر پاتا تو اسے قتل کرا دیتا۔ اس بادشاہ کا اصحاب کہف کے شہر کا بھی دورہ ہوا، وہاں کے اہل ایمان ڈراٹھے اور چھپنے کے لیے ادھر ادھر بھاگ لیے۔ یہ سرکش ایسے لوگوں کے تعاقب میں اپنی پولیس بھیجا کرتا تھا وہ اہل ایمان کو اس کے سامنے حاضر کرتے، وہ انہیں اپنے عبادت خانے لے جاتا جہاں دیوی دیوتاؤں کی پوجا ہوتی اور ان پر ان کی بلی چڑھادی جاتی، وہ ان سے کہتا یا تو ان دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرو اور بلی چڑھاؤ یا خود بلی بن جاؤ۔ زمانے کے دستور کے مطابق کچھ لوگ تو اس کی بات مان لیتے اور ان دیوی دیوتاؤں کی پوجا کرنے لگتے لیکن کچھ لوگ ایمان پر قائم رہتے اور اس کی راہ میں شہید ہو جاتے۔

یہ نوجوان بھی کہیں چھپے ہوئے عبادت میں مشغول تھے کہ ان کو اس ظالم کی پولیس نے جالیا اور بادشاہ کے سامنے حاضر کر دیا، بادشاہ کو ان کی نوعمری پر ترس آگیا اور انہیں سوچنے کے لیے وقت دے دیا۔ ادھر انہوں نے یہ فیصلہ کیا گھر سے اپنا اپنا خرچ لے لیں، اس میں سے کچھ تو اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیں، باقی خرچ لے کر شہر سے قریب ناجلوس (یا انکلوس) نامی پہاڑ میں واقع غار میں جا کر چھپ جائیں اور اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جائیں۔

حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں: یہ لوگ دقیانوس سے ڈر کر رات میں بھاگ لیے، وہ سات تھے، راستے میں انہیں ایک چرواہا مل گیا جس کے ساتھ اس کا کتا بھی تھا وہ بھی ان کا ہم دین تھا، وہ بھی ساتھ ہولیا۔

وہ تین میل تو گھوڑوں پر گئے پھر سات فرسخ پیدل چلے (یہی مسافت تقریباً عمان سے کہف الرجیب کی ہے)، یہاں تک کہ ان کے پاؤں سے خون نکلنے لگا کیونکہ انہیں پیدل چلنے کی عادت نہ تھی۔ اب وہ غار میں تھے، غار کے اندر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک میدان میں بہت سے پھلدار درخت ہیں اور پانی کا چشمہ بہہ رہا ہے۔ انہوں نے پھل نوش کیے اور پانی سے سیراب ہوئے اور اسی غار میں پناہ گزیں ہوگئے اور ان کا کتا، غار کے دروازے پر پاؤں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ ان کا کام روزہ نماز اور تسبیح کے سوا کچھ نہ تھا، انہوں نے اپنے پیسے یملیخا نامی نوجوان کے سپرد کر دیے وہ ان کے لیے شہر جا کر کھانا وغیرہ لے آتا تھا۔

اصحاب کہف کا آخری زمانے میں ظہور

بعض احادیث سے اصحاب کہف کے آخری زمانے میں ظہور کا پتا چلتا ہے اور یہ کہ وہ حضرت عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام، یا مہدی کے معاونین میں سے ہوں گے، چنانچہ اس سلسلے میں "اہل الکہف" کے مصنف محمد تیسیر ظبیان (ص ۲۳) نے صحت و عدم صحت کے تردد کے ساتھ کچھ احادیث واقوال ذکر کیے ہیں:

[حاشية] الصاوي علی الجلالین میں ہے کہ اصحاب کہف کے بارے میں اختلاف ہے، آیا وہ مر گئے اور دفن کر دیے گئے یا وہ سوئے ہوئے ہیں اور ان کے جسم محفوظ ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ وہ سوئے ہوئے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت جاگیں گے اور ان کے ساتھ حج کریں گے اور قیامت سے قبل ایک ہلکی ہوا چلے گی اور وہ انتقال کر جائیں گے، نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے: "ليحجن عيسى ابن مريم و معه أصحاب الكهف فإنهم لم يحجوا بعد": عیسیٰ ابن مریم حج کریں گے اور اصحاب

کہف ان کے ساتھ ہوں گے، انہوں نے ابھی تک حج نہیں کیا ہے (اس روایت کو ابن عیینہ نے بیان کیا ہے)۔

ابنِ کثیر کی تاریخ ''النھایة'' میں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں محمد بن کعب القرظی کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے: "في الکتب المنزلة أنّ أصحاب الکھف یکونون في حواریه و أنھم یحجّون معه" یعنی آسمانی کتابوں میں ہے کہ اصحاب کہف حضرت عیسیٰ کے حوارئین میں ہوں گے اور ان کے ساتھ حج کریں گے۔

ایک روایت میں ہے (توریت وانجیل میں تحریر ہے) کہ عیسیٰ ابنِ مریم اللہ کے بندے اور اس کے رسول الروحاء سے حج اور عمرہ کرنے والے کی حیثیت سے گزریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے حج اور عمرے کو جمع کردے گا۔ اللہ تعالیٰ ان کے حواری اصحابِ کہف ورقیم کو بنائے گا۔ وہ حج کرنے والے ہوکر گزریں گے کیوں کہ نہ تو انہوں نے حج کیا ہے اور نہ ہی وہ مرے ہیں۔

القرطبی کی کتاب "التذکرة" میں بھی اسی طرح کی روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ اسماعیل بن اسحاق نے روایت بیان کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ''قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک کہ عیسیٰ بن مریمؑ حج یا عمرہ کرنے کی غرض سے الروحاء سے نہ گزریں، یا یہ کہ اللہ (ان کے لیے) حج و عمرہ کو جمع فرمادے گا، اللہ اصحابِ کہف و رقیم کو ان کا حواری بنائے گا، وہ حج اور عمرہ ساتھ کرنے کے لیے (وہاں سے) گزریں گے کیوں کہ انہوں نے (ابھی) نہ تو حج کیا ہے اور نہ ہی وہ مرے ہیں۔

الدمیری نے اپنی کتاب ''حیاة الحیوان'' میں تحریر کیا ہے کہ اصحاب کہف اپنی خوابگاہوں میں چلے گئے اور آخری زمانے (یعنی) خروجِ مہدی تک کے لیے محوِ خواب ہوگئے۔ کہا جاتا ہے کہ مہدی انہیں سلام کریں گے اور زندہ کردیں گے اور وہ ان کے سلام کا جواب دیں گے، پھر نیند میں محو ہوجائیں گے، پھر قیامت تک نہیں اٹھیں گے۔

الدمیری نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ میں نے امام ابو الربیع سلیمان بن سبع کی کتاب الشفاء میں یہ عبارت دیکھی ہے: روایت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام دجال اور یاجوج و ماجوج

کے بعد چالیس سال، زندہ رہیں گے اور ان کے حواری، اصحاب کہف ورقیم ہوں گے، وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حج کریں گے اس لیے کہ انہوں نے حج نہیں کیا ہے۔

حضرت ابنِ عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "أصحاب الکھف أعوان المھدي" اصحاب کہف، مہدی کے معاون ہوں گے۔

اصحابِ کہف سے متعلق مختلف مآخذ کا بیان

یہ ایسا واقعہ ہے جسے مسلمانوں اور عیسائیوں میں بڑی شہرت حاصل ہوئی، اگرچہ اس واقعے کا ذکر انجیل یا بائبل میں نہیں ملتا ہے لیکن دیگر مذہبی تحریرات میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسی علیہ السلام کے بعد ظہور پذیر ہوا۔ اصحابِ کہف اس وقت کے اسلام عیسائی مذہب کے پیروکار تھے۔ انہوں نے ایک ظالم بادشاہ کے خوف سے بھاگ کر ایک غار میں پناہ لی، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے کانوں پر پردہ ڈال دیا اور اس طرح سلا دیا کہ آوازیں ان کو اٹھا نہیں سکتی تھیں۔ پھر انہیں دوبارہ اٹھایا تاکہ وہ لوگ جوان کے واقعے سے واقف تھے یہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا بعث (دوبارہ اٹھانے) کا وعدہ حق ہے اور قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں۔

مختلف مآخذ میں اس واقعے کا ذکر آتا ہے جن میں سب سے اہم قرآنِ کریم ہے، جس کی تفصیلات میں تو کوئی شک کی گنجائش نہیں لیکن قرآن نے اپنے مقصد کے مطابق صرف ضروری تفصیلات بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے جو قصے کے لحاظ سے تشنہ ہے، اس غیر ضروری تشنگی کو دور کرنے کے لیے مفسّرین نے اسرائیلی روایات کا سہارا لیا ہے، جن میں کچھ درست ہیں اور کچھ غیر صحیح۔

رفیق الدجانی نے اپنی کتاب میں اصحاب کہف کے قصے کے مآخذ اور ان میں سے کچھ میں آنے والی تفاصیل کا ذکر کیا ہے، یہاں ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے:

۱) تاریخ طبری (تاریخ الأمم و الملوك ص ۷۷۵)

اس تاریخ میں یہ قصہ سریانی سے نقل کیا گیا ہے۔ ابنِ منبّہ کے حوالے سے بیان

کیا گیا ہے کہ ایک حواری افسوس شہر پہنچا اور ایک حمام میں خادم کی حیثیت سے کام کرنے لگا، ساتھ ہی خفیہ طور پر نئے مذہب (عیسائیت) کی تبلیغ بھی کرتا، ایک دن بادشاہ کا بیٹا ایک حسین وجمیل دوشیزہ کے ساتھ اس حمام میں آیا، اس حواری نے انہیں حمام میں داخل ہونے سے روک دیا، لیکن دوسری مرتبہ نصیحت کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ لڑکی کے ساتھ حمام میں چلا گیا، خدا تعالیٰ کے حکم سے وہ اس جرم کی پاداش میں مر گئے، بادشاہ کو خبر ملی تو اس نے خادم کو طلب کیا، لیکن وہ عیسائی مذہب قبول کر لینے والے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک قریبی پہاڑ میں غار کی طرف بھاگ لیا، ان کے ساتھ ان کا کتا بھی تھا۔

۲) تفسیرِ طبری: (جامع البيان في تفسير القرآن) ج ۱۵ ص ۲۲۳

۳) ابنِ خرداذبہ: السلسلة الجغرافية (ڈی گویہ ایڈیشن) ص ۱۰۶-۱۱۰

۴) مقدسی: أحسن التقاسيم في معرفة الأقاليم (ڈی گویہ ایڈیشن) صفحہ ۱۵۳ میں مذکور ہے کہ ابسوس (ضلع قبدوقیا، موجودہ ترکی ریبوز) اہل کہف کا شہر ہے۔

۵) البیرونی: كتاب الآراء الباقية (ساخاؤ ایڈیشن)

صفحہ ۲۹۰ پر سریانی مہینوں کے ذکر میں ۵/ تشرین الثانی (نومبر) کے بارے میں بیرونی کہتا ہے کہ یہ دن اصحابِ کہف کے جشن کا دن ہے جو شہر افسس (موجودہ ریبوز، اناضول میں ضلع قبدوقیا) میں منایا جاتا ہے۔

۶) ابن الأثیر: الكامل في التاريخ (تورنبرگ ایڈیشن) ص ۲۵۴

۷) ابنِ اسحاق الثعلبی: قصص الأنبياء (العرائس) ص ۴۲۷ و ۴۴۵

۸) یاقوت الحموی: معجم البلدان ج ۲ ص ۸۰۶ (الرقیم کے تحت)

۹) الدمیری: حياة الحيوان ج ۲ ص ۲۵۰ (کلب کے تحت)

۱۰) القزوینی: عجائب المخلوقات ج ۱ ص ۱۶۱ (جبل الرقیم کے تحت)

۱۱) السائح الہروی: كتاب الإشارات إلى معرفة الزيارات [دمشق ۱۹۵۳م]

اس میں آیا ہے کہ البلقاء ایک قصبہ کا نام ہے جہاں اصحاب کہف ورقیم کا غار ہے اور یہ اس شہر کے قریب ہے جسے عمان کہا جاتا ہے، اس میں آثار قدیمہ ہیں، کہا جاتا ہے

کہ یہ دقیانوس بادشاہ کا شہر تھا۔

۱۲) ابوالفداء: البداية والنهاية

۱۳) ابنِ ہشام: السيرة النبوية

۱۴) ابنِ بطوطہ: تحفة النظار في غرائب الأمصار و عجائب الأسفار (رحلة ابنِ بطوطة)۔ جزء اوّل

۱۵) Gibbon: The Decline and Fall of the Roman Empire, p. 1197

۱۶) Assemani: Acta Sanctorum of the Bollandists

یہ کتاب لاطینی زبان میں ہے، فرانس کے شہر ٹور کے اسقف گریگوری نے السمعانی کے ذمے یہ کام سپرد کیا تھا کہ وہ جیمس ساروغی کے یونانی زبان میں موجود اصحابِ کہف کے قصّے کو لاطینی میں ترجمہ کردے۔ جیمس ساروغی پہلا شخص ہے جس نے سریانی میں اصحابِ کہف کا یہ قصہ تحریر کیا پھر اس کا یونانی میں ترجمہ ہوا، پھر یونانی سے لاطینی میں۔ اس کے بعد اس قصّے کے ترجمے حبشی، فارسی، ہندوستانی اور عربی وغیرہ زبانوں میں ہوئے۔ جیمس ساروغی عراقی شہر بطنی کا کاہن تھا۔ اس کی پیدائش ۴۵۲ء میں ہوئی اور اس نے یہ قصہ ۴۷۴ء میں لکھا، اسے ۵۱۹ء میں ساروغ صوبے کا کاہن بنا دیا گیا۔ ۵۲۱ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ ہے جس میں الرجیب کے غار پر بیزنطی عبادت خانہ تعمیر ہوا، یہ جسٹینیوس اوّل (دورِ حکومت ۵۱۸-۵۲۷ء) کا عہد ہے۔ جیمس ساروغی کی کتاب کا پہلا ترجمہ سریانی سے قدیم یونانی میں ہوا جو دیموقراطیہ کے نام سے جانی جاتی ہے۔

۱۷) Mensis Julil, Tom VI, p. 375

یہ برگزیدہ اشخاص (قدّیسوں) کی پچاس جلدوں پر مشتمل، ایک جنتری ہے جسے الآباء اليسوعيون نے شائع کیا ہے اور بہت سی فلسفیانہ اور تاریخی معلومات ہیں۔

۱۸) Renaudot, Hist. Patriarck Alexenderin, p. 39-40

۱۹) Paul the decon of Aquileia (de Giotis Longbraum), p.745-746

یہ شہر اقویلیا کے ایک شماس کی لاطینی میں تصنیف ہے۔ اس پادری کا زمانہ آٹھویں صدی [عیسوی] کے آخر کا ہے۔ لیکن یہ قصہ افسوس یا الرجیب کے اصحاب کہف کا نہیں ہے بلکہ یہ اہلِ شمال (بربر) کے غار والوں کا قصہ ہے، جنہیں بربر لوگ مقدس سمجھتے تھے۔

گبن نے اپنی مذکورہ بالا کتاب زوالِ روما (صفحہ ۱۱۹۸) میں یہ واقعہ، مذکور پادری سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ پادری کا بیان ہے کہ اسکنڈینیا کے غار میں موجود اہلِ شمال (بربر) کے کپڑے بتاتے ہیں کہ وہ لوگ، رومی النسل تھے، ان کے جسم، غار کے اندر صحیح سالم ملے ہیں۔ اس طرح ہمیں دوسرے اصحابِ کہف کا پتا چلتا ہے۔

۲۰) De Gloria Martyrum 1 in Max Bibliothica patrum, Tom XI p. 856

یہ کتاب ٹور کے کاہن گریگوری نے یونانی سے ترجمہ کرکے لکھی ہے۔

۲۱) Assemani (Bibliot Oriental, Tom 11 pp. 336, 338

(دیکھیے نمبر ۲۱)۔

یہ کتاب لاطینی زبان میں ہے، اس میں بیان کیا گیا ہے کہ اہل کہف کا ظہور اور ان کی بیداری کا واقعہ ۷۳۶ رومی مطابق ۴۲۵ء میں یا ۷۴۸ رومی مطابق ۴۳۷ء میں پیش آیا۔ (دیکھیے گبن ص ۱۱۹۸ نوٹ نمبر ۴۳)۔

یونانی مؤرخ فوٹیس کے مطابق یہ واقعہ تھیوڈوسیوس کی حکومت کے کلنڈر کے حساب سے ۸۳۰ مطابق ۴۳۹ء میں پیش آیا۔

الرجیب کے کہف میں جو آثار ملے ہیں وہ ۴۲۵ء سے مطابقت رکھتے ہیں۔

۲۲) Ph. Hitti, History of Syria, p. 332

۲۳) Conder, Survey of Eastern Palestine 1870, pp. 117-24

۲۴) Seller, Towe of Mont Nebo, p. 226

۲۵) قصص القدیسین (یونانی میں)

یہ ذقیوس میریکیوس نامی شماس کی تالیف ہے اور ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی ہے، اس

میں صفحہ ۲۱۹ پر اصحابِ کہف کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کی تعداد سات بتائی گئی ہے۔ ان کا یادگاری جشن ۴ر اگست (مشرقی) مطابق ۱۷ر اگست (مغربی) کو منایا جاتا ہے۔ اس کتاب کے مطابق اصحابِ کہف کا ظالم بادشاہ داقیوس (دورِ حکومت ۲۴۹ء تا ۲۵۱ء) تھا۔

۲۶) کتاب اوقات الصلاۃ (یونانی میں)۔

یہ کتاب استنبول کے آرتھوڈوکس پٹریارکیٹ خانے سے ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں ص ۲۱۷ اور ص ۳۴۷ پر اصحابِ کہف کا ذکر ہے۔

ان یونانی مآخذ میں بھی مسلم تاریخی و غیر تاریخی روایات کی طرح، اصحابِ کہف کی تعداد اور ان کے محلِ وقوع کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

۲۷) محکمۂ آثارِ فلسطین کا انگریزی مجلّہ جلد ۱۳ شمارہ ۲

۲۸) Harold Mattingly, Roman Coins

۲۹) Warwick Wroth, The Catalogue of the Imperial Byzantine Coins in British Museum 2 vols.

۳۰) John Walker, A Catalogue of the Arab-Sasanian Coins

۳۱) اسلامی سکے Mohamad Mobarak, Moza Hamayon

۳۲) اسلامی سکے Ismael Ghaleb, Moza Hamayon

۳۳) Dr. T. Taksoz, Ephsus, Legend and facts ص ۹۲ و ۹۴

۳۴) E.Phesus, Ayassuluk, History and Archaelogy 3rd edition

مذکورہ مآخذ کا جائزہ اور استدلال

مذکورہ مآخذ پر غور کرنے اور ان کے جائزے سے واضح ہو جاتا ہے کہ اصحابِ کہف کا قصہ پرانے زمانے کے عیسائیوں کی آزمائش اور ابتلاء کا خالص ایک مشرقی قصہ ہے۔ انہیں کسی رومی بادشاہ کے ظلم کا شکار ہونا پڑا تھا جو بت پرستی کے سلسلے میں سخت اور متعصب تھا۔ ان کا حال بھی ان مسلم سلفِ صالحین کا سا تھا جنہیں کفارِ قریش کے ہاتھوں ظلم و ستم،

زیادتی اور مختلف قسم کی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں میں ان کے حواریین کے خلاف دینی آزمائش وابتلا کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ یہ سلسلہ سرکش بادشاہ نیرون تک پہنچتا ہے۔ جس نے ۶۸ء میں شہرِ روم جلوا دیا تھا اور موردِ الزام عیسائیوں ہی کو ٹھہرایا تھا۔ اس کے بعد مملکت کے مختلف صوبوں میں ظلم وزیادتی کا سلسلہ جاری رہا۔ اسی سال روم میں قدّیس پولس کو قتل کیا گیا اور اسی زمانے میں پطرس کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ (دیکھیے رفیق ۳۶۔۳۷ بحوالہ فلپ حتی ص ۲۳۲ History of Syria)۔

دوسری مرتبہ یہ سلسلہ ۹۵ء میں شروع ہوا۔ یہ سرکش ڈومیٹین کا عہد تھا، اگرچہ یہ سلسلہ اصلاً یہودیوں کے خلاف تھا، لیکن اس کی لپیٹ میں عیسائی بھی آگئے۔ تیسری بار یہ سلسلہ سرکش ٹراجن کے زمانے میں شروع ہوا، جس نے عیسائیوں کے خلاف فرمان جاری کیا کہ اگر یہ لوگ رومی دیوتاؤں اور سلطنت کے بتوں کی پوجا اور ان پر نذرانے چڑھانے سے انکار کریں تو ان کے ساتھ غداروں اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کا سلوک کیا جائے۔ ڈاکٹر حتی کے مطابق اس فرمان کا نفاذ دو صدیوں تک جاری رہا۔

عیسائیوں پر ظلم وزیادتی کا چوتھا سلسلہ سرکش داقیوس کے زمانے میں شروع ہوا، جس نے ٹراجن کے فرمان کی تجدید کی۔ پانچویں بار ظلم کا یہ سلسلہ ویلرین کے زمانے میں ۲۵۷ء۔ ۲۵۸ء کے درمیان شروع ہوا۔ اس نے نہ صرف عیسائیوں کو اپنے دیوتاؤں پر نذرانے چڑھانے پر مجبور کیا بلکہ ان کے یکجا اور متحد ہونے پر بھی پابندی عائد کردی۔ (رفیق ۳۷)۔

آخری اور سخت ترین آزمائش کا سلسلہ دقلیانوس (دیوقلتیانس = ڈایوکلیٹین) کے زمانے میں شروع ہوا جس نے ۳۰۳ء میں اپنا فرمان جاری کیا، جس کے مطابق تمام کنیسے منہدم کردیے گئے، عیسائیوں کی تمام مقدس کتابیں جلادی گئیں اور تمام عیسائیوں کو فوجی وغیر فوجی ملازمتوں سے نکال دیا گیا، ساتھ ہی انہیں تمام قسم کی تکلیفیں اور اذیتیں بھی دی گئیں۔ (رفیق ۳۷ بحوالہ ڈاکٹر حتی ۳۳۳)

مؤرخ یوسیبوس اپنی کتاب [Historia ecclesiastica] کی جلد ۸ اور فصل ۱۲

میں لکھتا ہے کہ اس حکمنامے کی وجہ سے شام میں عیسائیوں کا قتل عام شروع ہوگیا اور انطاکیہ میں بعض کو زندہ جلادیا گیا۔ یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب قسطنطینِ کبیر نے عیسائی مذہب قبول کرلیا اور اسے سرکاری مذہب قرار دے دیا۔ (رفیق ۳۸)

مذہبی بنیاد پر عیسائیوں کو دی جانے والی تکالیف کا یہ ایک سلسلہ ہے، جو عرصے تک جاری رہا۔ اسی ظلم وزیادتی کے نتیجے میں شہیدوں، قدّیسوں اور اصحاب کہف کے واقعے ظہور میں آئے۔

مذکورہ مآخذ پر غور کرنے سے اسلامی اور غیر اسلامی روایتوں کے اختلافات واضح ہوجاتے ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ اصحابِ کہف کے محوِ خواب رہنے کی مدّت:

اگرچہ مسلمانوں میں اصحاب کہف کے غار کے محلِ وقوع کے بارے میں اختلاف ہے لیکن وہ ان کے سونے کی مدّت کے بارے میں تقریباً متفق ہیں کہ وہ ۳۰۹ سال تک سوتے رہے۔ [محققین علماء اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدّت کے بارے میں قولِ فیصل نہیں مانتے بلکہ تقریبی مدّت مانتے ہیں، یعنی یہ مدّت بھی ہوسکتی ہے یا اس سے کچھ کم وبیش]۔

اصحاب کہف کے ظالم بادشاہ کی تعیین کے لیے ان کے سونے کی مدّت کا جاننا بے حد ضروری ہے۔ یہ سونے کی مدّت ہمیں شاہ ٹراجن کے زمانے میں لے جاتی ہے جو سریانی اور یونانی مآخذ کے خلاف ہے۔ داقیوس کے زمانے سے ۳۰۹ سال پہلے عیسائیوں پر کوئی ظلم نہیں ہوتا تھا، چوں کہ اس زمانے میں عیسائی چرچ کو غلبہ اور تسلط حاصل تھا۔ یہ زمانہ تو صالح بادشاہ تھیوڈ سیس کے بھی بعد کا ہے جس کے زمانے میں اصحاب کہف بیدار ہوئے۔

۲۔ سورج کے طلوع وغروب سے متعلق آیت کا انطباق:

مسلمانوں کے نزدیک اس غار کے پہچاننے کا معیار (سورۃ الکہف کی) آیت (نمبر ۱۷) ہے جس میں غار میں صبح وشام طلوع وغروب کے وقت کی کیفیت بیان کی گئی ہے۔ کہف الرجیب میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے، جب کہ غیر اسلامی مآخذ اس امتیاز کا انکار

کرتے ہیں، یا یہ کہہ لیجیے کہ ان کے جو غار ہیں ان میں اس کیفیت کا فقدان ہے۔

۳۔ اصحابِ کہف کے کتے کا وجود:

تمام اسلامی مآخذ اصحابِ کہف کے ساتھ ان کے کتے کا ذکر ضرور کرتے ہیں کیوں کہ قرآنِ کریم نے اس کا ذکر کیا ہے، قرآنِ کریم سے زیادہ سچی خبر اور کون دے سکتا ہے، بلکہ عرب مؤرخین و مفسّرین تو کتے کے اوصاف اور اس کے مختلف نام بھی ذکر کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتے کا ذکر بھی بعض اہلِ کتاب بھی کرتے تھے ورنہ مسلم علماء و مؤرخین یہ معلومات کہاں سے لاتے۔

قرآنِ کریم نے کتے کا ذکر دو آیتوں میں کیا ہے جب کہ یونانی اور سریانی مآخذ کتے کے ذکر سے خالی ہیں۔ اسی اختلاف کی وجہ سے یہ رجحان پیدا ہوا کہ سریانی و یونانی اصحابِ کہف اور ہیں اور قرآن میں مذکور اور، بظاہر یہی حقیقت بھی ہے۔

۴۔ اصحابِ کہف کا محلِّ وقوع:

ان مآخذ میں اصحابِ کہف کے غار کے محلِّ وقوع کے بارے میں بھی اختلاف ہے۔ بعض عرب اسلامی مآخذ سریانی روایتوں سے متفق ہیں کہ یہ غار، رومی شہر افسوس میں واقع ہے جو ازمیر (موجودہ ایاصولوک) کے قریب اناطول میں ہے، بعض کے نزدیک یہ غار، شہر افسوسین میں ہے جو اناطول کے گاؤں ریبوز میں ہے۔ بعض لوگوں نے اس میں تحریف کر کے اسے طرسوس بنا دیا، بعض اسے اردن میں مانتے ہیں اور بعض اسے اسکنڈینیویا (یورپ) میں مانتے ہیں۔

۵۔ اصحابِ کہف کی تعداد:

سریانی روایتیں اصحابِ کہف کی تعداد آٹھ بتاتی ہیں، یونانی اور مغربی مآخذ میں ان کی تعداد سات ہے۔ قرآن مجید میں نہ ان کی صحیح تعداد بتائی گئی اور نہ ہی ان کے نام ذکر کیے گئے ہیں۔

قرآن مجید نے ان کی تعداد کے بارے میں مختلف اقوال بیان کیے ہیں، اس سے اس کا مقصد ان کی تعداد کے بارے میں اہلِ کتاب کا اختلاف بتانا ہے، البتہ آخری قول

یعنی ان کی تعداد سات تھی اور آٹھواں ان کا کتا تھا، صحیح تعداد کے قریب ضرور ہے۔

۶۔ کہف پر بنی عبادت گاہ:

قرآن مجید نے اصحابِ کہف کے اوپر مسجد (عبادت گاہ) بنانے کا ذکر کیا ہے (سورۃ الکہف آیت ۲۱)۔ یہ بھی قرآن مجید کے اصحابِ کہف کے غار کا اہم سراغ ہے۔

۷۔ الکہف پر الرقیم کا عطف:

قرآنِ کریم نے اصحابِ کہف کے محلِّ وقوع کو "الرقیم" کے ساتھ ملایا ہے اور اس کا الکہف پر عطف کیا ہے۔ الرقیم اردن میں ایک جگہ کا نام ہے، جس کا عربی اشعار میں ذکر ملتا ہے چنانچہ شاعر نے کہا ہے:

یزرن علی تنائیه یزیدا   بأکناف الموقر و الرقیم

(بہترین اور طاقت ور اونٹنیاں لوگوں کو سوار کیے) دور دراز (علاقوں) سے یزید (بن عبدالملک) سے ملاقات کی غرض سے الموقر اور الرقیم کے اطراف میں آ رہی ہیں۔

الموقر: یہ عمان کے جنوبِ مشرق میں ایک آثاری جگہ ہے، جہاں ایک تالاب ہے، جسے اموی خلیفہ یزید دوم نے بنوایا تھا، ۱۹۴۳ء میں یہاں، ایک ستون کا بالائی حصہ ملا ہے، جس پر تحریر ہے کہ "امیر المؤمنین یزید کے زمانے میں یہ تالاب بنایا گیا۔" ستون کا یہ ٹکڑا، اب عمان کے عجائب خانے میں محفوظ ہے۔

الرقیم: اسلامی مآخذ کے مطابق اردن میں ایک مقام کا نام ہے۔ یہ تحقیق اس بات کو تقویت دیتی ہے کہ یہ غار عمان میں ہے۔ المقدسی، یاقوت الحموی، سیاح الہروی اور القزوینی نے جو بیان کیا ہے وہ مزید برآں ہے۔

عیسائی مآخذ میں اصحابِ کہف کا قصہ

اس بات سے قطع نظر کہ اصحابِ کہف کا ظہور کس زمانے میں ہوا، اکثر اسلامی مآخذ اور عیسائی مآخذ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ نوجوان عیسائی تھے، البتہ بعض مفسّرین اس طرف گئے ہیں کہ اصحابِ کہف یہودی تھے چنانچہ مشہور مفسر ابن کثیر نے تحریر کیا ہے:

بیان کیا گیا ہے کہ اصحاب الکہف حضرت مسیح عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے مذہب پر تھے، یوں تو خدا ہی بہتر جانتا ہے مگر ظاہر یہ ہے کہ وہ بالکلیہ نصرانیت سے پہلے ہوئے ہیں کیوں کہ اگر وہ دینِ نصرانیت پر ہوتے تو عیسائیوں سے مخالفت کی بناء پر احبار یہود اصحاب الکہف کی خبر اور ان کے حالات محفوظ رکھنے کی طرف اعتنا نہ کرتے، حالانکہ سابق میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت گزر چکی ہے کہ قریش نے مدینے میں احبار یہود کے پاس اپنے کچھ لوگ اس غرض سے بھیجے تھے کہ وہ ان سے چند ایسی باتیں معلوم کرلیں جن سے رسول اللہ ﷺ کا وہ امتحان لے سکیں...

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب الکہف کا حال، اہل کتاب میں محفوظ تھا اور نیز یہ کہ ان کا واقعہ مذہبِ نصرانیت سے پہلے ہوا ہے۔ واللہ اعلم۔ (لغات القرآن ۱۴۲۔۱۴۳ بحوالہ ابنِ کثیر ۳/۷۴ مطبع مصر ۱۳۵۶ھ)۔

اسی طرح کی ایک جدید کوشش تفسیر "التفسیر المُنتخب" نامی تفسیر میں ہوئی ہے، جسے مسلم علماء کی ایک خاص کمیٹی نے ترتیب دیا ہے اور مصر میں اسلامی امور کی مجلسِ اعلیٰ کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے مرتبین نے تفسیر کے حواشی میں ذکر کیا ہے کہ ممکن ہے کہ یہ نوجوان جنہوں نے کہف میں پناہ لی یہودی رہے ہوں اور یہ واقعہ یا تو سلوقی بادشاہ انٹیوخوس چہارم معروف بہ ایپفانیس (تقریباً ۱۷۵۔۱۶۳ ق م) (۵) یا رومی بادشاہ ہیڈ ریانس (۱۱۷۔۱۳۸ء) کے زمانے میں رونما ہوا اور ان دونوں بادشاہوں نے یہودیوں پر مظالم ڈھائے تھے اور ان کے دینی شعائر اور تعلیمات کو ختم کر ڈالا تھا۔ (محمد تیسیر ظبیان ص ۲۷ نے اسے پہلی کوشش تصور کیا ہے)۔

بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے کہ یہ نوجوان عیسائی تھے، غار میں ملنے والے آثار بھی یہی بتاتے ہیں۔ رہا مسئلہ یہودی علماء کا اس واقعے کا سوال کی حیثیت سے انتخاب، تو شانِ نزول کی روایت صحیح ہونے کی صورت میں بھی، یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ یہ واقعہ عیسائیت سے پہلے پیش آیا ہو۔ مدینے کے یہودی اس وقت کے علمی طبقے کی نمائندگی کرتے تھے اور انہیں تاریخ وغیرہ مختلف علوم پر دسترس حاصل تھی، چوں کہ یہ واقعہ دور دراز

علاقے کا تھا، اس لیے انہوں نے اس واقعے کو دریافت کرنے کے لیے کہا تا کہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ اس واقعے کے نوجوان یہودی تھے یا عیسائی، اس سے بڑا فرق نہیں پڑتا، عبرت تو ان قصوں میں ہے۔ اس بارے میں محمد تیسیر ظبیان تحریر فرماتے ہیں: اس بات کے غلط ہونے کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ یہودیوں نے (باوجودیکہ وہ اپنے سورماؤں کی تقدیس میں مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں) خود اس واقعے کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے۔ اسی طرح تمام اسرائیلی کتابوں میں اس عظیم تاریخی واقعے اور خداوندی معجزے کا ذکر نہیں ملتا۔

عیسائی مآخذ جن پر جمہور مفسرین اور مسلم مؤرخین نے اصحاب کہف کے واقعے کی تفصیل کے سلسلے میں اعتماد کیا ہے، وہ ایسے اہم واقعات ہیں جو قدیسوں سے مروی ہیں۔ ان نوجوانوں کی تعداد، ان کے ظہور کے زمانے اور کہف میں گزاری گئی مدت کے بارے میں ان مآخذ کی روایات میں بھی اختلاف ہے۔ نئے اور پرانے عیسائی مآخذ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ اصحاب کہف کے موضوع پر سب سے پہلے سریانی زبان میں جیمس ساروغی نے لکھا ہے۔ یہ عراق میں ساروغ نامی ضلعے یا صوبے کا کاہن تھا۔ یہ ۴۵۲ء میں پیدا ہوا اور ۵۱۸ء میں اس کا انتقال ہوا یعنی شاہ تھیوڈوسیس دوم معروف بہ تھیوڈوسیس اصغر (وفات ۴۰۸ء) کے بعد اس کی پیدائش ہوئی۔

چیمبرس آف ٹورس، انسائیکلو پیڈیا کے مطابق فرانس کے شہر ٹور کے قدیس گریگوری کی توجہ سے تقریباً چھٹی صدی عیسوی میں اس قصے کو سریانی سے لاطینی میں منتقل کیا گیا۔

ماہر آثار قدیمۂ اردن مرحوم رفیق الدجانی جن کا غار کہف کی کھدائی میں بڑا حصہ تھا کہتے ہیں کہ وہ (یعنی ساروغی) شاہ جسٹینیوس اوّل (زمانۂ حکومت ۵۱۸۔۵۲۸ء) کا ہم عصر تھا اور اسی کے زمانے میں کہف پر عبادت خانہ (کنیسہ) تعمیر کیا گیا تھا، جیسا کہ کھنڈرات سے پتا چلتا ہے۔ بنیادوں میں اس کے سکّے بھی ملے ہیں۔

یہ قصہ سریانی سے یونانی، لاطینی، حبشی، ہندوستانی [؟] اور فارسی زبانوں میں منتقل ہوا پھر عربی میں۔ اسی پر مفسرین اور مسلم مؤرخین نے اس قصے کی تفصیل کے سلسلے میں

اعتماد کیا ہے۔

اخلاق اور مذاہب کے دائرۃ المعارف میں اس قصے پر یوں تبصرہ کیا گیا ہے:

''سات سونے والوں کا قصہ ذہنی لطف اور آسودگی کے ان بڑے قصوں میں سے ہے جو عیسائی مقدس ہستیوں (قدیسوں) سے مروی ہیں اور پوری دنیا میں مقبول عام ہیں۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ عشائے ربانی (Lord's Supper) کے مشرقی عیسائیوں کے اجتماعات میں، ان نوجوانوں کی یادگار اب بھی منائی جاتی ہے۔ محمد تیسیر ظبیان (ص ۲۹) کا بیان ہے کہ عمان میں مجھے ایک کاہن نے بتایا کہ ان کے یہاں، ایک خاص دعا ہوتی ہے جسے جبل الرقیم کی طرف نسبت کرتے ہوئے صلاۃ الرقیم کہتے ہیں۔

اسلام کے ظہور کے بعد اس واقعے کے سلسلے میں بعض عیسائی مؤرخین اور مستشرقین کا رجحان یہ ہوگیا کہ قرآنِ کریم میں بیان کردہ واقعہ، اہل کتاب سے سن کر ہی تیار کیا گیا ہے۔

یہ قصہ عیسائیوں کا مذہبی قصہ ہے، اس کے باوجود اس قصے کے بارے میں بھی ان میں سے بہت سوں کو شک رہا، بعض تو یہاں تک کہہ گئے کہ یہ واقعہ خیالات واوہام اور خرافات سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ان لوگوں میں فرانسیسی مستشرق ماسینوں بھی ہے۔

اس خام خیالی اور غلط تصور کو ختم کردینے کے لیے اصحاب کہف کے غار کا انکشاف بہت کافی ہے۔ ایسے علمی قراین اور تاریخی ثبوت سامنے آچکے ہیں جو قرآن مجید میں مذکور واقعے کی پوری تائید کرتی ہیں۔

یہ بھی قرآن کا معجزہ ہے کہ ہر زمانے میں اس زمانے کے لحاظ سے ایسے امور ظاہر ہوتے رہتے ہیں جن سے قرآن کی حقانیت اور اس کے مُنزّل منَ اللہ ہونے کے مزید ثبوت سامنے آتے ہیں۔

جیمس ساروغی، اس موضوع پر سریانی زبان میں سب سے پرانے لکھنے والوں میں ہے، اس لیے محمد تیسیر ظبیان نے ۱۹۷۲ء کے موسم گرما میں سریانی فرقے کے سربراہ پٹریارک اغناطیوس یعقوب سوم (رکن اکادمی زبانِ عربی، دمشق) سے ملاقات کی غرض

سے دمشق کے محلے باب توما میں واقع اس فرقے کے پٹریارکیٹ پہنچے۔ ملاقات ہونے پر انہوں نے اس بات کی تائید کی کہ عیسائیوں کی پرانی کتابوں میں اصحاب کہف کا قصہ ملتا ہے، اور یہ کہ ساروغی ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے سریانی زبان میں اس قصے کو منظوم کیا ہے۔

بطریرک نے ساروغی کی منظوم کہانی کے کچھ اشعار انہیں سنائے۔ ان میں سے وہ اشعار جو محمد تیسیر ظبیان کو یاد رہے، وہ، وہ تھے جو ان نوجوانوں کی زبان میں اس وقت کہے گئے تھے جب انہوں نے اپنے ساتھیوں میں سے ملیخا نامی نوجوان کو کھانا لینے شہر بھیجا تھا۔ وہ اشعار یہ ہیں:

قم يا عيني و اذهب إلى المدينة
و اشتر لنا خبزا و طعاماً
فقد كان الطعام قليلاً
و تناولناه في عشائنا أمس

اے میرے پیارے اٹھو، شہر جاؤ
اور ہمارے لیے روٹی اور کھانا خرید کرلاؤ،
کھانا [پہلے ہی] تھوڑا تھا
اور ہم نے کل رات [ہی] کے کھانے میں کھالیا تھا۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ساروغی کی وفات ۵۲۰ء میں ہوئی۔

اسلامی ماخذ میں اصحابِ کہف کا قصہ

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اصحاب کہف ورقیم سے متعلق تمام تفصیلات جو اکثر تفسیروں اور اسلامی تاریخی کتب میں مذکور ہیں وہ سب کی سب کسی ایک عیسائی ماخذ سے ماخوذ ہیں اس لیے کہ ان کی تفصیلات میں کوئی حدیث یا کسی صحابی کا قول نہیں ملتا۔

اس مختصر واقعے کا اصل ماخذ قرآن کریم ہے، جس میں یہ واقعہ سورۂ کہف میں بیان کیا

گیا ہے اور اس کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ جسموں کو دوبارہ زندہ کرنے، دنیاوی نظام اور فطری طریقۂ کار کو بدلنے پر اللہ تعالیٰ کو پوری قدرت حاصل ہے۔ اور یہ کہ شرک کی آلائشوں سے پاک عقیدے کی بنیاد رکھی جائے اور اللہ کی وحدانیت کو اعلیٰ و بہتر اور واضح طریقے پر ثابت کیا جائے۔ اس قصّے کو بیان کرنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ ان کو ڈرایا جائے جو کہتے تھے کہ اللہ نے بیٹا بنا رکھا ہے: ﴿وَ يُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ سورۃ الکہف ۴، اور مؤمنین کو بہترین اور دائمی اجر کی بشارت دی جائے۔ ان مقاصد کے لیے اس بات کی ضرورت نہ تھی کہ تفصیلات میں جایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ غار کی جائے وقوع کہاں تھی اور اصحابِ کہف کس زمانے میں تھے اور کتنے تھے، کیسے تھے اور ان کے نام کیا کیا تھے وغیرہ وغیرہ۔

البتہ جمہور مفسّرین اور مسلمان مؤرخین نے اس موضوع کی تفصیلات میں دلچسپی لی اور اس واقعے کو پوری تفصیل سے بیان کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی تعداد کیا تھی، وہ کیسے تھے، ان کے نام کیا تھے، یہ کہف کہاں واقع ہے اور یہ لوگ کس زمانے میں تھے۔ اس موقع پر مختلف روایتیں اور متضاد آراء بیان کی گئی ہیں، ان تفصیلات میں سے اکثر ایسی باتیں ہیں جو تاریخی حقائق اور علمی نظریات سے دور ہوسکتی ہیں۔ مزید برآں یہ کہ ان واقعات میں عیسائی اور اسرائیلی نظریات کی آمیزش ہے جن کا کسی بھی طرح اس عظیم الشان واقعے کے مقاصد اور اس سے مقصود نصیحتوں سے کوئی میل نہیں۔

اب ہم ان مفسّرین و مؤرخین کے مطابق مختصراً یہ واقعہ، کچھ تصرّف کے ساتھ پیش کر رہے ہیں جو بڑی حد تک عیسائی روایتوں سے ماخوذ ہے:

اسلامی مآخذ کے مطابق قرآن مجید میں مذکور اصحاب کہف ایک ظالم رومی بادشاہ کے زمانے میں تھے۔ اور بادشاہ اپنی شان و شوکت، تشدّد اور سخت گیری اور اپنی رعایا کو بتوں کی پوجا اور ان کو سجدہ کرانے میں بہت مشہور تھا، لیکن ان پختہ عقیدے اور ایمان صادق والوں نے بتوں کی پوجا سے انکار کر دیا، اور خدائے واحد واحد کی عبادت میں یکسو ہوگئے، جب انہوں نے دیکھا کہ یہ ظالم بادشاہ اپنے طریقے سے باز نہیں آرہا اور اپنی پیروی نہ

کرنے والوں کو دھمکیاں دے رہا ہے تو یہ لوگ اس شہر سے چلے گئے جہاں اس کی حکومت تھی اور شہر کے قریب ایک غار میں پناہ گزیں ہوگئے، ان کے ساتھ ان کا کتا بھی تھا جو ان کی نگرانی کیا کرتا تھا اور یہ لوگ عبادت و دعا اور گریہ وزاری میں مصروف ہوگئے کہ اللہ انہیں اس حاکم کے شر سے نجات دے اور ان پر اپنا سایۂ رحمت ڈال دے، پروردگار نے ان کی دعا سن لی اور انہیں اپنے آغوش رحمت میں لے لیا اور گہری نیند سلا دیا۔ پھر ظالم بادشاہ مرگیا اور اس کے بعد کئی صدیاں گزر گئیں، یہاں تک کہ ایک نیک بادشاہ تخت و تاج کا مالک ہوا جو اللہ پر ایمان رکھتا تھا اور بتوں کی پوجا سے نفرت کرتا تھا۔ اس زمانے میں لوگ اس بات پر بحث و مباحثہ کرنے لگے کہ مرنے کے بعد انسان کو دوبارہ کیسے اٹھایا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلے میں اپنی قدرت کا اظہار فرمادیا اور اس نے ان نوجوانوں کو تین سو نو سال یا کم و بیش مدّت کے بعد بیدار کردیا۔ اٹھنے کے بعد ان لوگوں کا خیال تھا کہ انہوں نے صرف ایک ہی رات یا کچھ وقت گزارا ہے۔ انہیں بھوک لگ رہی تھی، تو انہوں نے اپنے میں سے ایک شخص کو اس کی ہیئت بدل کر شہر بھیجا، تاکہ وہ ان کے لیے کھانا لائے لیکن لوگوں کو اس شخص کے معاملے میں شبہہ ہوگیا اور اس کو حاکمِ وقت کے پاس لے گئے۔ جب بادشاہ نے اس سے واقعہ سنا اور اسے یقین آگیا تو سب کو ان نوجوانوں کے فرار ہونے اور ظالم بادشاہ کے زمانے میں روپوش ہونے کا واقعہ یاد آگیا، کیوں کہ یہ واقعہ وہ لوگ اپنے اجداد سے سنتے آئے تھے۔

بادشاہ اس غار کی طرف گیا اس کے ساتھ اس کا لشکر اور اس کے مصاحبین بھی تھے تاکہ سب کے سب اس عظیم معجزۂ الٰہی کا بچشم خود مشاہدہ کرسکیں، جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو ان نوجوانوں کی روح پرواز کرگئی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ غار کے دروازے پر عبادت گاہ بنائی جائے اور سال میں ایک دن مقرر کیا تاکہ ہر سال اس دن، ان کا جشن منایا جائے۔

عیسائی مآخذ سے ماخوذ اسلامی مآخذ کا کہنا ہے کہ اصحابِ کہف کو دقیانوس یا دقیوس (دورِ حکومت: ۲۴۹ء تا ۲۵۱ء) کے زمانے میں آزمائش میں مبتلا کیا گیا تھا اور بادشاہ کے مصاحبین میں سے دو نیک آدمیوں نے جو اس جگہ سے واقف تھے، ان نوجوانوں کے نام

اور ان کا واقعہ ایک لوح (الرقیم) پر لکھ دیا اور اس کو تانبے کے تابوت میں رکھ دیا اور اس تابوت کو اس عمارت میں رکھ دیا جس کی تعمیر کا حکم بادشاہ نے اس غار کو بند کرنے کی غرض سے دیا تھا۔ پھر سال گزرتے رہے یہاں تک کہ اس علاقے میں ایک نیک بادشاہ تخت نشیں ہوا، جس کا نام تھیوڈوسیوس تھا، اس کو الحاد، خرابیِ عقیدہ اور دوبارہ زندہ کیے جانے کے انکار کے فتنوں کا سامنا کرنا پڑا جس سے اسے تکلیف ہوئی تو وہ اللہ سے دعا کرنے لگا کہ وہ اس مصیبت کو دور کرنے میں اس کی مدد فرمائے اور اس کی قوم کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس معجزے کو ظاہر فرمایا۔

ابوالفرج الملطی کی کتاب "تاریخ مختصر الدول" میں ہے کہ اس بادشاہ نے بیالیس سال حکومت کی اور اس کے زمانے میں اصحابِ کہف تقریباً دو سو چالیس سال کے بعد بیدار ہوئے تو بادشاہ (تھیوڈوسیوس)، بڑے بڑے پادری، مقدس ہستیوں اور دینی سربراہوں کے ساتھ وہاں گیا اور انہیں دیکھا اور ان سے بات چیت کی۔ جب یہ لوگ اصحابِ کہف سے بات کر کے واپس ہوئے تو اصحابِ کہف پر وہیں موت طاری کر دی گئی۔ عیسائی مآخذ میں ان کے زمانے کے تعیّن کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ ان میں سے بعض کا خیال ہے کہ وہ ۲۰۰ سال تک سوتے رہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ ۵۱۷ سال تک سوتے رہے۔ یہاں مدّت کے تعیّن میں عیسائی روایتیں اسلامی روایتوں سے مختلف ہو جاتی ہیں۔

الطبری نے اپنی تفسیر میں اس واقعے کو اور طریقے سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عکرمہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا: اصحابِ کہف رومی بادشاہوں کی اولاد تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو اسلام سے سرفراز فرمایا۔ وہ اپنے دین کو لے کر یکسو ہو گئے اور اپنی قوم کو چھوڑ کر غار کی طرف چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے کانوں پر پردہ ڈال دیا وہ عرصۂ دراز تک اسی حال میں رہے یہاں تک کہ ان کی قوم ختم ہو گئی اور ان کی جگہ پر ایک مسلمان قوم آئی۔ ان کا بادشاہ مسلمان تھا۔ ان لوگوں میں روح اور جسم کے سلسلے میں اختلاف ہو گیا۔ کوئی کہتا کہ روح اور جسم دونوں کو دوبارہ اٹھایا جائے گا دوسرا کہتا صرف روح کو اٹھایا جائے گا، جسم

کو تو زمین کھا جائے گی اور اس میں سے کچھ باقی نہ رہے گا۔ یہ اختلاف بادشاہ پر بڑا شاق گزرا۔ اس نے بہت ہی عاجزی اور انکساری سے اللہ سے دعا کی کہ اے اللہ یہ اختلاف تو دیکھ رہا ہے، ان کے لیے کوئی ایسی دلیل بھیج دے جو ان کے سامنے اس معاملے کو واضح کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو ظاہر فرما دیا۔ پھر باقی قصہ بیان کیا ہے۔

اصحابِ کہف کی تعداد

اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے۔ یونانی اور لاطینی ـل کے مطابق یہ سات تھے۔ سریانی روایت کے مطابق اصحابِ کہف کی تعداد آٹھ تھی، اس واقعے کو سب سے پہلے سریانی باشندے جیمس ساروغی (۴۵۲-۵۲۱ء) نے قلمبند کیا، جو عراقی صوبے ساروغ کا کاہن تھا اور جسٹینوس اوّل (عہد حکومت ۵۱۸-۵۲۷ء) کا ہم عصر تھا، اسی کے زمانے میں الرجیب (یعنی الرقیم) کے کہف پر کنیسہ (عبادت خانہ) تعمیر کیا گیا، جیسا کہ آثار قدیمہ کے دلائل و قرائن سے ثابت ہو چکا ہے۔ اس عبادت گاہ کی بنیادوں سے اس کے عہد کے سکّے بھی ملے ہیں۔ جیمس ساروغی کا تحریر کردہ واقعہ عرب اسلامی مآخذ کے بیان کردہ واقعے کے مطابق ہے۔ (رفیق ۲۲-۲۳)۔

اسلامی روایات میں بھی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے کیوں کہ قرآن مجید نے خود، کسی عدد کی تعیین نہیں کی ہے۔ ﴿قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا یَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِیْلٌ﴾ "کہو میرا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنے تھے، کم ہی لوگ ان کی صحیح تعداد جانتے ہیں۔" (سورۃ الکہف آیت ۲۲)۔

محمد بن اسحاق نے ان کی تعداد آٹھ بتائی ہے۔ حضرت ابنِ عباسؓ کی روایت ثعلبی کی کتاب "قصص الأنبیاء" میں ہے کہ یہ نوجوان دقیانوس بادشاہ سے ڈر کر رات میں بھاگ نکلے اور یہ سات تھے۔ وہ ایک چرواہے کے پاس سے گزرے، اس کے ساتھ اس کا کتا بھی تھا، وہ ان کے دین پر تھا۔ اس طرح تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔

ثعلبی نے اپنی مذکورہ کتاب میں حضرت علیؓ بن ابی طالب سے ایک روایت ذکر کی

ہے کہ ''ملکِ روم میں ایک شہر تھا جسے افسوس کہا جاتا تھا... جب اسلام آیا تو اسے طرسوس کہنے لگے، اس شہر میں ایک ظالم و کافر بادشاہ تھا... اس نے اپنے محل میں سونے کا ایک تخت بنا رکھا تھا... اس نے علماء کی اولاد میں سے چھ لڑکوں کو وزیر بنا رکھا تھا، ان کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرتا تھا۔ ان میں سے تین کو دائیں طرف اور تین کو بائیں طرف کھڑا رکھتا تھا، وہ بھی اس کے ہم مذہب اور کافر تھے''۔ اس کے بعد ثعلبی نے ان نوجوانوں کی اس ظالم بادشاہ سے نفرت کی وجہ بیان کی اور یہ کہ کس طرح وہ دین توحید اختیار کرنے کے بعد بھاگ نکلے۔ راستے میں وہ ایک چرواہے کے پاس سے گزرے وہ بھی مع اپنے کتے کے ان کے ساتھ ہولیا۔ اس طرح ان کی تعداد سات ہوتی ہے اور آٹھواں کتا۔ ان کے نام حسب ذیل بیان کیے جاتے ہیں:

۱۔ مکملینا ۲۔ تملیخا ۳۔ مرطلیوس ۴۔ بنیوس ۵۔ ساونوس ۶۔ اوتوس ۷۔ کشطیوس (چرواہا) اور کتے کا نام قطمیر بتایا جاتا ہے۔

یہ روایت یونانی روایات کے مطابق ہے (رفیق ۲۴ بحوالہ کتاب القدیسین)، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ یونانی روایات سے واقف تھے، یونانی میں ان کے نام اس طرح ہیں:

۱۔ مکسیمیانوس ۲۔ اکساکوثوذنیانوس ۳۔ املیخوس ۴۔ مرتینانوس ۵۔ دیونیسیوس ۶۔ اندونیوس ۷۔ قسطیطیوس

یہاں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سریانی روایات کے مطابق اصحاب کہف کی تعداد آٹھ اور یونانی ولاطینی روایات کے مطابق سات تھی۔ قرآن میں کوئی معیّن تعداد بیان نہیں کی گئی ہے، چنانچہ ان کی تعداد سات بھی ہو سکتی ہے، سات سے زیادہ یا کم بھی ﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلَاثَةٌ، رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ...﴾: ''کچھ لوگ کہیں گے: (اصحابِ کہف) تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا...'' (سورۃ الکہف: ۲۲)۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت النعمان بن بشیر نے بیان کیا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو الرقیم کا ذکر کرتے سنا حدیث شریف میں تین آدمیوں کا واقعہ آتا ہے جو بارش

سے بچنے کے لیے ایک غار میں چلے گئے اور ایک پتھر سے غار کا منہ بند ہو گیا اور ہر ایک نے اچھے عمل کا واسطہ دے کر دعا کی تو تھوڑا تھوڑا کر کے وہ پتھر پورا ہٹ گیا اور لوگ بچ گئے۔ بخاری و مسلم کی روایت میں الرقیم کا ذکر نہیں ہے، لیکن مسند احمد بن حنبل میں یہی روایت حضرت النعمان بن بشیرؓ سے کچھ اختلاف کے ساتھ مروی ہے لیکن قصّے کا مفہوم ایک ہی ہے۔

اس روایت کے شروع میں ہے، میں نے رسول اللہ ﷺ کو الرقیم کا ذکر کرتے سنا، آپ ﷺ نے فرمایا تین آدمی ایک غار میں تھے۔ غالباً اسی روایت کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ ہے: ﴿ثَلَاثَةٌ، رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ (تو کہیں گے کہ) ''اصحابِ کہف تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا''۔ ہوسکتا ہے کہ یہ واقعہ بھی الرقیم (موجودہ الرجیب) کے غار ہی میں پیش آیا ہو، لیکن اس حدیث کا اصحابِ کہف و رقیم کے واقعے سے کوئی تعلق نہیں۔

اصحابِ کہف کا کتا

ابھی ذکر ہوا کہ اصحابِ کہف کے کتے کا نام قطمیر بتاتے ہیں، ظاہر ہے ان معلومات کی کوئی اسلامی اصل نہیں، اسلامی اعتبار سے تو صرف یہ ہے کہ قرآن مجید کے مطابق ان کے ساتھ ان کا کتا بھی تھا۔

اسلامی، سریانی اور یونانی مآخذ میں کتے کے ذکر کے بارے میں بھی اختلاف ہے، اسلامی مآخذ میں کتے کا ذکر ملتا ہے جب کہ سریانی اور یونانی وغیرہ روایات اصحابِ کہف کے کتے کے ذکر سے خالی ہیں۔

قرآن کریم نے ان کی تعداد کے بارے میں لوگوں کے اقوال بیان کرتے ہوئے کتے کا ذکر کیا ہے: ﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلَاثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ، وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ، وَ يَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ، قُلْ رَّبِّيْ أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ، مَا يَعْلَمُهُمْ إِلَّا قَلِيْلٌ﴾ (کچھ تو) کہیں گے کہ (اصحابِ کہف) تین تھے، چوتھا ان کا کتا تھا، اور (کچھ) کہیں گے کہ (وہ) پانچ تھے، چھٹا ان کا کتا تھا، غیب (کی باتوں) میں

انکل سے تیر چلاتے ہوئے، اور کچھ کہیں گے (وہ) سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا، آپ کہہ دیجیے میرا پروردگار ہی ان کی تعداد (کے بارے میں) زیادہ جاننے والا ہے، انہیں (صحیح طور پر) بہت کم لوگ جانتے ہیں (سورۃ الکہف آیت ۲۲)۔

اس سے قبل (آیت ۱۸ میں) فرمایا ہے: ﴿وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ﴾ ان کا کتا چوکھٹ پر ہاتھ پھیلائے ہوئے تھا۔

حضرت ابنِ عباسؓ نے ''وصید'' کی تفسیر، غار کے دروازے سے کی ہے، اس بات کا ذکر الدّمیری نے کتاب الحیوان میں کلب کے تحت (ص ۲۵۰/ رفیق ۲۶)، القزوینی نے عجائب المخلوقات میں، الطبری نے اپنی تاریخ وتفسیر (ص ۷۷۵) میں اور الثعلبی نے اپنی کتاب قصص الأنبیاء میں اصحابِ کہف کے واقعے کے بیان میں کیا ہے۔

کتے کے رنگ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ الثعلبی (ص ۴۲۷/ رفیق ۲۶) کے مطابق حضرت ابنِ عباسؓ نے اس کا رنگ سرخ بتایا ہے، مقاتل کے مطابق وہ زرد رنگ کا کتا تھا۔ محمد بن کعب کا کہنا ہے کہ اس کی گہری سرخی اور زردی سرخی کی طرف مائل تھی۔ کلبی کہتے ہیں کہ وہ برف کی مانند سفید تھا، بہر حال کسی نے کچھ بتایا ہے کسی نے کچھ، اسی طرح کتے کے نام کے بارے میں بھی مختلف اقوال ملتے ہیں، حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ اس کا نام ریان تھا۔ حضرت ابنِ عباسؓ اس کا نام قطمیر بتاتے ہیں۔ اسی طرح مختلف نام بیان کیے گئے ہیں۔ ظاہر ہے اسلام میں ان کی اصل کچھ نہیں، صحابہؓ نے جیسا کسی اہل کتاب سے سن لیا، بیان کر دیا۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہئے کہ یہ واقعہ اسلام سے پہلے کا ہے اور اصحابِ کہف یا ان کی قوم کی زبان عربی نہیں تھی، اس لیے یہ نام ترجمہ در ترجمہ کے ذریعے عربی میں آئے ہیں۔

کتے کا نام خواہ کچھ بھی ہو لیکن یہ بات قرآن مجید سے ثابت ہے کہ ان کا ایک کتا تھا، جب کہ سریانی و یونانی روایتوں میں کتے کا ذکر نہیں ہے۔ کتے کا ہونا الرجیب میں کہف کے اصلی ہونے کے ثبوت کے لیے ایک اہم نکتہ ہے (رفیق ۲۷)۔

اصحابِ کہف کے محوِ خواب رہنے کی مدت

سونے کی مدّت کے بارے میں بھی اسلامی، سریانی اور یونانی مآخذ میں اختلاف ہے۔ اسلامی مآخذ نے قرآن مجید کے مطابق ۳۰۹ سال کی مدت کو اختیار کیا ہے ﴿وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا، قُلِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾: وہ (یعنی اصحابِ کہف) اپنے غار میں تین سو سال تک رہے اور نو سال اور زیادہ گزارے۔ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ لوگ (غار میں) کتنی مدت ٹھہرے رہے۔

یونانی اور سریانی مراجع کا کہنا ہے کہ ان کے سونے کی مدت دو سو سال یا اس سے بھی کم تھی۔ میریکیوس کی یونانی کتاب ''کتاب القدّیسین'' (ص ۲۱۹/ رفیق ۲۸) میں ہے کہ وہ ملاطیوس کے زمانہ حکومت سے ۱۸۴ سال تک سوتے رہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ وہ ۱۹۴ سال تک سوتے رہے۔ اس کتاب کا سب سے قدیم نسخہ یونان میں اتھینز کے قریب واقع دیر جبل اقوس المقدس میں ہے۔ (رفیق ۲۸)

مدّت کے بارے میں مفسّرین نے زیادہ تر یہی قول اختیار کیا ہے کہ اصحابِ کہف شمسی حساب سے تین سو سال اور قمری لحاظ سے ۳۰۹ سال تک سوتے رہے لیکن مدت بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿قُلِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا...﴾ ''آپ کہہ دیجیے کہ ان کے ٹھہرے رہنے کی مدت اللہ ہی زیادہ جانتا ہے''، سے بعض مفسّرین کو اشکال ہو گیا، وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ مدت حقیقی ہوتی تو پھر اس قول کا کیا مطلب!، چنانچہ ان کے نزدیک یہ بھی کہنے والوں کا قول ہے۔

مولانا عبد الرشید نعمانیؒ لغات القرآن (۱۴۶/۱) میں فرماتے ہیں: عبد الرزاق، ابنِ جریر، ابن المنذر [اور] ابنِ ابی حاتم نے قتادۃ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کی قراءت میں ''قالوا'' کا لفظ آیا ہے یعنی انہوں نے اس طرح قراءت کی ہے ''وقالوا ﴿لبثوا في كهفهم.﴾''، اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ لوگوں کا مقولہ ہے۔

قادہ کہتے ہیں: تم نہیں دیکھتے اللہ نے اس کے ساتھ فرمایا: ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ (بحوالہ تفسیر فتح القدیر ۳/ ۲۷۰)۔

حافظ ابن کثیر اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں: (حضرت) ابنِ مسعود کی قراءت کے متعلق قتادہ کی روایت منقطع ہے نیز یہ قراءت جمہور کے لحاظ سے شاذ بھی ہے لہٰذا اس سے استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ (بحوالہ تفسیر ابنِ کثیر ۶/ ۱۳۳ طبع مصر ۱۳۰۱ھ)

علامہ محمود آلوسی کہتے ہیں کہ "ابنِ مسعود کی قراءت سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو اصحاب الکہف کے معاملے میں بحث کر رہے تھے، رہا اس کے بعد اللہ کا فرمانا ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اصحاب الکہف کی تعداد کے بارے میں تیسرے قول کو بیان کر کے فرمایا، اس سے اس قول کی تردید کا پتا نہیں چلتا۔"

پھر مولانا عبد الرشید نعمانی فرماتے ہیں: "غرض [یہ کہ] اکثر مفسرین اسی کے قائل ہیں کہ اصحاب الکہف کے غار میں رہنے کی یہ تین سو نو (۳۰۹) برس کی مدت خود اللہ تعالیٰ کی بیان کی ہوئی ہے۔" (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے لغات القرآن ۱/ ۱۴۶ اور مابعد)۔

خلاصہ یہی ہوا کہ ۳۰۹ سال کی نہ نفی کی ہے نہ توثیق۔

اصحابِ کہف کا ظالم بادشاہ اور ان کے ظہور کا زمانہ

قرآن کریم نے اس واقعے کی تفصیل میں نہ جاتے ہوئے اس ظالم بادشاہ کا ذکر نہیں کیا ہے جس کے زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا، لیکن اسلامی مؤرخین و مفسرین، سریانی و یونانی روایتوں سے متفق ہیں کہ وہ ظالم بادشاہ داقیوس (عہدِ حکومت ۲۴۹ ـ ۲۵۱ء) تھا۔ اس نام کو مختلف طریقوں پر لکھا گیا ہے: داقیوس، داقینوس اور داقیانوس وغیرہ، لیکن اصحابِ کہف کے سوئے کی مدت کے بارے میں اسلامی مآخذ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، وہ اس مدت کو قرآن کریم کے مطابق تین سو نو سال (۳۰۹) ہی مانتے ہیں۔ اگر ہم ۲۵۱ میں ۳۰۹ جمع کریں تو ۵۶۰ ہو جاتا ہے، یہ وہ زمانہ ہے جب عیسائیت کا دور دورہ تھا اور اس زمانے میں بت پرستی اور دین توحید میں کوئی عقائدی جھگڑا نہ تھا، اس لیے اس زمانے میں

اصحاب کہف جیسی کسی نشانی یا معجزے کے ظہور کی ضرورت نہ تھی (رفیق ۲۸)۔

اسلامی، سریانی اور یونانی روایات اس بات پر متفق ہیں کہ جس صالح نصرانی بادشاہ کے زمانے میں یہ حضرات بیدار ہوئے وہ تھیوڈوسیس دوم (عہد حکومت ۴۰۸ ـ ۴۵۰ء) تھا، جو ارکیڈیس بن تھیوڈوسیس اعظم کا بیٹا تھا (رفیق ۲۸ ـ ۲۹)۔

الثعلبی نے اپنی کتاب قصص الأنبیاء میں لکھا ہے کہ پھر اس ملک کی حکومت ایک نیک آدمی کے ہاتھ میں آگئی جس کا نام تندوسیس تھا، اس نے ۸۸ سال [؟] تک حکومت کی، اس کی حکومت میں لوگ مختلف گروہوں میں بٹ گئے، ان میں سے کچھ تو اللہ پر ایمان رکھتے تھے اور قیامت کو برحق سمجھتے تھے اور بعض اس کے منکر تھے۔ اس نیک بادشاہ کو یہ بات بڑی گراں گزری، اور اسے بڑا غم ہوا جب اس نے دیکھا کہ اہل باطل بڑھتے جا رہے ہیں اور اہل حق پر غالب آرہے ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں کہ دنیاوی زندگی ہی سب کچھ ہے، صرف ہماری روحوں کو دوبارہ اٹھایا جائے گا، ہمارے جسموں کو نہیں، انہیں تو زمین کھا کر ختم کر ڈالے گی، وہ قیامت کو جھٹلانے لگے یہاں تک کہ لوگوں کو حق اور حواریین کے راستے سے ہٹانے لگے تو اس نیک بادشاہ نے اللہ کے سامنے اپنا شکوہ رکھا، آہ وزاری کی۔ اللہ نے ایک بندے کے دل میں یہ بات ڈالی کہ غار کے منہ پر لگے پتھر کو ہٹا دے اور وہاں اپنے ریوڑ کو رکھنے کا بندوبست کرے، غار کا کھلنا تھا کہ اصحابِ کہف بیدار ہو گئے۔

اسی نیک بادشاہ کے زمانے میں اس کا رشتے دار (داماد یا بہنوئی) قسطنطیوس مغرب میں حکومت کرتا تھا، اس کا ذکر الثعلبی نے قسطیطوس کے نام سے کیا ہے، اس کے عہد کا ایک سکہ، الرجیب کی قبروں میں ملا ہے (رفیق ۹۲)۔

السمعانی نے اپنی لاطینی کتاب (Bibliot Oriental) جلد ۲ صفحہ ۳۳۶ و ۳۳۸ میں بیان کیا ہے کہ اصحابِ کہف کے ظہور کا زمانہ سلوقی کلنڈر کے مطابق ۷۳۶ رومی یعنی ۴۲۵ء یا ۴۳۷ء تھا۔ اور یونانی مؤرخ فوٹیس کے مطابق وہ تھیوڈوسیس کی حکومت کے ۳۸ ویں سال میں نیند سے بیدار ہوئے، یعنی ۴۳۹ یا ۴۴۲ء۔ (گبن The Decline

and Fall of the Roman Empire ص ۲۴۱ حاشیہ نمبر ۴۲) جیمس ساروغی اصحابِ کہف کے متعلق لکھنے والا پہلا شخص ہے۔ اس نے یہ قصہ ۴۷۴ء میں تحریر کیا، تمام مؤرخین ومفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اصحابِ کہف کا ظہور تھیوڈوسس دوم کے زمانے میں ہوا اور قرآن مجید کے مطابق ان کے سونے کی مدت ۳۰۹ سال تھی، اس لیے اگر ہم اس بادشاہ کے درمیانی عہد یعنی ۴۲۱ میں سے ۳۰۹ کم کردیں تو ۱۱۲ء نکلے گا۔ یہ زمانہ عیسائیوں پر ظلم وزیادتی کا زمانہ تھا۔ اس سنہ کے بارے میں اگر ہم تاریخ پر روشنی ڈالیں تو واضح ہوجائے گا کہ ٹراجن نے ایک فرمان جاری کیا تھا جو عیسائی حکومت اور شاہی دیوتاؤں کی پرستش سے انکار کرے اس پر ایک غدار کی حیثیت سے مقدمہ چلایا جائے اور اسے سزائے موت دی جائے۔ یہ فرمان دو صدی تک نافذ رہا۔ اس زمانے میں عیسائی بڑی پریشانیوں اور سزاؤں سے دوچار ہوئے (رفیق ۳۰ بحوالہ فلپ حتّی ۲۳۲)۔

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جب ہم قرآن مجید میں مذکور سونے کی مدت کا اعتبار کرتے ہیں تو وہ ظالم بادشاہ ٹراجن قرار پاتا ہے نہ کہ اسلامی وغیر اسلامی ماٰخذ کا بیان کردہ داقیوس بادشاہ، اس کا ثبوت کہف کے آثاری قرینوں اور دلائل سے بھی ملتا ہے۔

ٹراجن نے ۱۰۶ء میں مشرقی اردن کا علاقہ فتح کیا، اور ۱۰۷ء میں البتراء کو بھی اس نے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا، اسی طرح ۱۰۸ء میں اس نے رومی شہر ایلہ (عقبہ) بسایا اور وہ سڑک بنوائی جو آج بھی اسی کے نام سے مشہور ہے، اس پر اس نے سنگ میل نصب کرائے۔ کونڈر نے اپنی کتاب (Survey of Eastern Plaestine) میں لکھا ہے کہ ٹراجن نے جب اس علاقے کو فتح کیا تو اس نے بہت سے پرانے عیسائیوں کو البلقاء میں پایا جو طیطس کے ہاتھوں ۷۰ء میں بیت المقدس کی تباہی کے بعد یہاں بھاگ آئے تھے۔ ٹراجن نے فلاڈلفیا (حالیہ عمّان) کی تعمیر پر خاص دھیان دیا اور اس میں مشہور آڈیٹوریم بنوایا۔ اس وقت یہ بڑا پُر رونق شہر تھا۔

الرقیم کی تشریح

اس سے قبل کہ الرقیم کی تشریح کی جائے، اس طرف بھی اشارہ ضروری ہے کہ بعض حضرات کو یہ وہم ہوگیا کہ اصحاب الکہف والرقیم دو الگ الگ واقعے ہیں یکسانیت کی وجہ سے دونوں نام یکجا کردیے گئے ہیں، اس وہم کی اصل وجہ مسند احمد ابن حنبل میں مذکور حضرت النعمان بن بشیر سے مروی حدیث ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ لیکن تحقیق شدہ بات یہی ہے کہ اصحاب الکہف والرقیم کا ایک ہی واقعہ ہے۔

الرقیم سے کیا مراد ہے؟ یہ بات مؤرخین ومفسرین کی توجہ کا باعث رہی ہے، اس سلسلے میں ان کی آراء مختلف ہیں، اان میں سے کچھ کا خیال ہے کہ الرقیم پہاڑ کا نام ہے، جب کہ دوسروں کا کہنا ہے کہ یہ کتے کا نام ہے۔ بعد کے مؤرخین سریانی روایت سے اتفاق کرتے ہیں کہ الرقیم سے مراد تانبے کی تختی ہے جس پر اصحابِ کہف کا واقعہ لکھ کر ان کے ساتھ دفن کردیا گیا تھا۔ (رفیق ۲۰)

علی بن ابی طلحہ کہتے ہیں کہ الرقیم تحریر کو کہتے ہیں، بہرحال لغوی طور پر الرقیم کے معنی نقش وتحریر یعنی ”لکھا ہوا“ اور ”نقش کیا ہوا“ کے ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے سورۃ المطففین (آیت ۲۰-۲۱) میں فرمایا ہے: ﴿كِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ يَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ﴾ (وہ تو) لکھی ہوئی کتاب ہے، مقرب (فرشتے) اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

بخاری شریف کے باب ﴿أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ﴾ میں سورۂ کہف کی تشریح میں الرقیم کے معنی کتاب یعنی مکتوب اور تحریر کے دیے ہیں، اسی طرح تفسیر القرآن، سورۃ الکہف میں بھی یہی تشریح کی ہے۔ بخاری شریف میں یہاں پر حضرت ابن عباس سے مروی حضرت سعید کی روایت بھی بیان کی ہے کہ الرقیم سیسے کی وہ پلیٹ یا تختی ہے، جس پر (اصحاب کہف کے زمانے کے) گورنر نے ان کے نام کندہ کرادیے تھے اور وہ تختی اپنے خزانے میں ڈلوادی تھی۔

الرقیم کے لفظ کی مناسبت سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اصحاب کہف کا وہ غار جس

میں انہوں نے پناہ لی، اندر سے پرانی تحریروں وغیرہ سے مزیّن تھا۔ غور سے دیکھنے پر عمان کے قریب موجود کہف میں بہت سی تحریریں نظر آتی ہیں۔

عرب جغرافیہ دانوں کا خیال ہے کہ الرقیم ایک جغرافیائی مقام کا نام ہے، چنانچہ ابنِ خرداذبہ نے اپنی کتاب السلسلة الجغرافية میں الرقیم اس غار کا نام بتایا ہے، لیکن اس کے نزدیک بھی یہ واقعہ شہر افسس میں رونما ہوا۔ (رفیق ۲۰ بحوالہ ابنِ خرداذبہ)۔

المقدسی [أحسن التقاسيم في معرفة الأقاليم] کے مطابق الرقیم عمان سے ایک فرسخ کی دوری پر صحراء کی سرحد پر ایک گاؤں ہے جس میں ایک غار ہے جس کے دو دروازے ہیں، ایک بڑا اور ایک چھوٹا،...اس غار میں تین قبریں [بھی] ہیں (رفیق ۲۰ بحوالہ المقدسی)۔

الثعلبی نے اپنی کتاب قصص الأنبياء میں حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا ہے: الرقیم غطفان اور ایلہ کے درمیان فلسطین کے قریب ایک وادی کا نام ہے جہاں اصحابِ کہف ہیں۔ اسی طرح یہودی عالموں کے امام حضرت سعید بن جبیرؒ سے روایت بیان کی گئی ہے کہ الرقیم پتھر یا سیسے کی ایک تختی ہے۔ (رفیق ۲۱)۔

رفیق الدجانی کی رائے میں الرقیم جگہ کا نام ہے جیسا کہ عرب جغرافیہ دانوں نے بیان کیا ہے۔ اگر المقدسی کا بیان کردہ الرقیم کا غار، وہ جگہ ہے جہاں اصحابِ کہف روپوش ہوئے تھے تو الرجیب کا غار وہی ہے، اس کی صفات اس غار پر پوری طرح منطبق ہوتی ہیں۔ الرجیب کے غار کی اندرونی دیواریں ثمودی اور قدیم کوفی تحریروں اور نقوش سے بھری پڑی ہیں۔ اس غار کے علاوہ کہیں بھی اتنے نقوش اور تحریریں نہیں ملتیں۔

اصحابِ کہف کے غار کے پہاڑ کا نام

الطبری نے اپنی تاریخ میں اس پہاڑ کا نام بنجلوس بتایا ہے جب کہ الثعلبی نے اپنی کتاب قصص الأنبياء میں ناجلوس بیان کیا ہے۔ امریکن یونیورسٹی، بیروت میں قدیم سامی زبانوں کے پروفیسر انیس فُریحہ کا کہنا ہے کہ اس پہاڑ کا نام انکلوس ہے۔ یہ یونانی

نام ہے، عربوں نے یونانی ناموں کو اپنی زبان میں بڑی تبدیلیوں کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ (رفیق ۳۶)

غارِ افسوس کے پہاڑ کا نام آجکل بیناریواغ ہے۔ رفیق دجانی مرحوم کے مطابق عربی مآخذ میں مذکور ناجلوس پہاڑ سے غالباً الرجیب کا وہی پہاڑ ہی مراد ہے، جس میں اصحابِ کہف کا غار دریافت ہوا ہے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ یونانی نام ہے۔ اس رائے کو مزید تقویّت اس بات سے ملتی ہے کہ عمان کے شمالِ مشرق میں ایک آثاری جگہ کا نام نو یجیس ہے۔ آثاری دلائل و قرائن سے یہ بات پوری طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ عمان کے قریب کہف الرجیب ہی قرآن میں مذکور اصحابِ کہف کا غار ہے (رفیق ۳۶)۔

اصحابِ کہف کے غار کا محلِّ وقوع

کچھ عربی اسلامی مآخذ اس شہر کو جس کے مضافات میں اصحابِ کہف کا غار واقع تھا شہر افیسس یا افسوس بتاتے ہیں، جیسا کہ الثعلبی کی قصص الأنبياء، البیرونی کی الآثار الباقية، الطبری کی تاریخ وتفسیر، یاقوت کی معجم البلدان اور ابنِ خرداذبہ کی السلسلة الجغرافية میں آیا ہے۔

مستشرق کیبرڈی گوپے بھی اس رائے سے اتفاق کرتا ہے کہ شہر افیسس یا افسوس سے اس کی مراد ایشیائے کوچک میں واقع صوبے قبد وقیا کا قدیم شہر، افسوسین ہے۔ اسے ابسوس بھی کہتے ہیں، اس کا موجودہ نام ریبوز ہے۔

الثعلبی نے حضرت علیؓ سے روایت بیان کی ہے، جیسا کہ اوپر ذکر ہوا کہ روم میں افسوس نامی ایک شہر تھا، کہا جاتا ہے کہ وہی طرسوس ہے، اس کا نام عہد جاہلیت میں افسوس تھا، اسلام میں اس کا نام طرسوس ہوگیا۔ (رفیق ۲۲ بحوالہ قصص الأنبياء ۲۴۶)۔

بعض مؤرخین اس سے مراد ایونی شہر افسوس لیتے ہیں جو ایشیائے کوچک کے مغرب میں ساحل کے قریب واقع تھا اور اب کھنڈرات میں تبدیل ہوچکا ہے، اور اس کے قریب اب ایک میل کی دوری پر شمال مشرق میں ایاسولوک نامی ترکی گاؤں ہے۔ ابنِ بطوطہ نے

یہ مقام دیکھا ہے اور اس کا ذکر اپنے سفر نامے میں کیا ہے (رفیق ۲۲)۔
اصحاب کہف کے غار کے محلِ وقوع کے بارے میں صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اقویلیا شہر کے شماس نے اپنی لاطینی کتاب (De Geotis Langhrum.pp 745-46) میں کہا ہے کہ اصحابِ کہف کی تعداد سات تھی اور ان کا غار اسکنڈینیویا میں تھا۔
بعض کا خیال ہے کہ شام میں واقع کہف الأربعین نامی غار، اصحاب کہف کا غار ہے، کچھ کا کہنا ہے کہ یہ غار، اردن کے مقام البتراء میں واقع ہے۔ رفیق الدجانی مرحوم کا خیال ہے کہ الثعلبی نے جو حضرت ابنِ عباسؓ کا قول بیان کیا ہے کہ الرقیم، غطفان اور ایلہ کے درمیان وادی ہے، اس سے ان کی مراد البتراء ہی ہے (رفیق ۲۲ بحوالہ قصص الأنبیاء ۲۴۵)۔

اصحابِ کہف کا غار، عیسائی روایات کی روشنی میں

سب سے پہلا سوال ذہن میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ غار ہے کہاں؟ غار کے محلِ وقوع کے بارے میں مفسّرین اور مسلم مؤرخین کے مختلف اقوال ہیں کیوں کہ قرآن کریم نے اس کی کوئی تعیین نہیں کی ہے۔ اسی طرح احادیث شریفہ سے بھی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں ملتی۔ تمام اسلامی روایتوں کا دار و مدار عیسائی مآخذ پر ہے جو بعض وجوہات کی بنا پر کہتے ہیں کہ ان سات اصحاب کہف کے غار کا محلِ وقوع، روم (اناضول، ترکی) کے ایک شہر میں ہے جس کو افسوس (افیسس) کہتے ہیں اور جو بحرابیض متوسط کے قریب ہے۔ وہ اپنے اس قول کی تائید میں کسی قسم کی تاریخی، جغرافیائی، یا آثاری ثبوت پیش نہیں کرتے۔
افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اکثر مؤرخین و مفسّرین قرآن مجید میں وارد تمام قصوں کے سلسلے میں انہی کے نقش قدم پر چلے ہیں اور اس سلسلے میں اسرائیلی روایات نے خوب خوب گل کھلائے ہیں جیسا کہ اکثر قصوں کے ضمن میں دیکھا جا سکتا ہے۔ عیسائی مؤرخین اور ان کے مذہبی علماء کے اس قول پر مصر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ شہر افسوس عیسائی دعوت کے بنیادی مرکزوں میں سے تھا اور یہ شہر عیسائی مرکز ہونے سے قبل یونانی دیوی

ارتمیس کی پوجا کا مرکز تھا اور اس کا مجسمہ وسط شہر میں نصب تھا۔
محمود العابدی نے الرجیب (الرقیم) سے متعلق اپنی تیار کردہ نوٹ بک (محمد تیسیر ص ۴۴) میں لکھا ہے:
اس زمانے میں کنیسہ کو جو مسئلہ درپیش تھا، وہ لوگوں کا مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا تھا۔ شہرِ "افسوس" کے مفکرین اس مسئلے کی بحثوں میں سرگرم تھے، بہت ممکن ہے کہ ان آٹھ نوجوانوں اور ان کا دوبارہ زندہ ہونے کا قصہ اس بات کے ثبوت کے لیے وضع کیا گیا ہو کہ دوبارہ زندہ ہونا جسم کے ساتھ ہوگا۔
قدیم ترین عیسائی مآخذ میں فرانسیسی مؤرخ السمعانی کی لاطینی میں ایک کتاب ہے، فرانس کے شہر ٹور کے اسقف گریگوری نے اس قصے کو یونانی سے لاطینی میں ترجمہ کرنے کی ذمہ داری اس مؤرخ کو سونپی تھی، لیکن اس یونانی اصل کا کوئی پتا نہیں چلتا، اکثر عیسائی مآخذ کہتے ہیں کہ ان سوئے ہوئے لوگوں (اصحاب کہف) کے بارے میں سب سے پہلے جیمس ساروغی نے سریانی زبان میں لکھا جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ (محمد تیسیر ص ۴۴)
اس موضوع پر لکھنے والوں میں اڈورڈ گبن ہیں، جنہوں نے اپنی کتاب زوال روما میں یہ واقعہ السمعانی کی تحریر اور مبریکیوس کی کتاب اوقات الصلاۃ (جو ۱۸۸۲ء میں قسطنطنیہ میں قدیم یونانی میں لکھی گئی تھی) سے نقل کر کے لکھا ہے۔ محمد تیسیر ظبیان نے ۱۹۸۷ء میں شائع ہونے والی اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جرمن یہودی مستشرق ڈاکٹر شاخت نے بیس سال سے زیادہ عرصے قبل ایک سوال کے جواب میں لندن سے نکلنے والے مجلے المستمع العربي میں اس بات کو ترجیح دی ہے کہ یہ غار، شہر افسوس میں ہے، ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ یہ بھی بعید نہیں ہے کہ یہ غار (عمان کے قریب) الرقیم میں ہو۔
اس موضوع پر ڈاکٹر انیس فریحہ استاذ امریکن یونیورسٹی، بیروت نے بھی رسالہ الأبحاث میں ایک مضمون لکھا ہے جس میں یونانی اور سریانی مآخذ سے نقل کرتے ہوئے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ غار، افسوس میں ہے۔
اسی طرح فرانسیسی مستشرق لویس ماسینیوں نے (Les sept Dor mants)

کے عنوان سے فرانسیسی میں اصحاب کہف پر ایک کتاب ۱۹۶۱ء میں شائع کی ہے جس میں اپنے مذہبی نظریے کی تائید میں بعض وضاحتیں اور نتائج ذکر کیے ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر لوئیس گینسڈ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے شہر افسوس میں ابتدائی دور کے عیسائیوں کے ایمان کی تقویت کے لیے اصحابِ کہف کا بڑا احسان ہے کیوں کہ ان کا نظریہ ہے کہ سیدہ مریم المجدلیہ اور قدیس یوحنا کا سونا (بھی) اصحابِ کہف کے سونے کی طرح ہے کیوں کہ وہ عرصۂ دراز تک سوتے رہے اور پھر بیدار ہوئے۔

ماسینیوں کے بعد جان کلوڈ پیکارڈ نامی شخص نے ان کی تائید کی اور اس دینی قصے کو اسلامی اور عیسائی بات چیت کے لیے بنیاد قرار دیا ہے۔ اس کے خیال میں اسلام اور عیسائی دونوں مذہب خلوص اور اللہ کی عبادت میں فنا ہوجانے کی تعلیم دیتے ہیں، اسی طرح مصائب وشدائد کے مقابلے پر جم جانے اور جسم و روح کے ساتھ دوبارہ زندہ ہونے پر متفق ہیں۔

اصحابِ کہف کا غار، اسلامی روایات کی روشنی میں

اگرچہ اکثر مفسّرین و اسلامی مؤرّخین، عیسائی مآخذ کی اتباع میں کہف الرقیم کو افسوس میں بتاتے ہیں، لیکن ایسے صحابہؓ، امراء اور قائدین (حتی کہ مفسّرین و مؤرّخین) کی تعداد بھی کم نہیں ہے جو اصحابِ کہف کا غار، اسی جگہ بتاتے ہیں، جہاں دریافت ہوا ہے۔

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ الکہف اور الرقیم کے الفاظ، جزیرۂ عرب کے لوگوں کی زبان پر تھے۔ امیہ بن ابی الصلت (متوفی ۵ھ/۶۲۶ء) کے ایک شعر میں دونوں لفظوں کا ذکر موجود ہے:

و لَیسَ بِھَا اِلَّا الرَّقِیمُ مُجاوِرًا
وَصِیدَھُمُ و القَومُ فِي الکَھفِ هُجَّدُ

یعنی وہاں صرف الرقیم ہے اور اس کے قریب میں ان (اصحابِ کہف کے غار) کی چوکھٹ ہے اور وہ لوگ (اصحابِ کہف) غار میں سوئے ہوئے ہیں۔ یہ شعر اس قصیدے

میں آیا ہے، جس کا مطلع یہ ہے:

لَكَ الحَمدُ و النَّعماء و المُلكُ رَبَّنا
فَلا شَيءَ أعلَى مِنكَ مَجدًا و أمجدُ

اے ہمارے پروردگار تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں، تمام نعمت و اکرامات تیرے ہی ہیں اور تمام (چیزوں) کی ملکیت تیری ہی ہے، لہٰذا عزت و بلندی میں تجھ سے بڑھ کر کوئی بھی چیز نہیں ہے، اور تو بڑا بزرگ و اعلا ہے۔

یہ معلوم ہے کہ امیہ دورِ جاہلیت کا شاعر ہے اور وہ اہل کتاب میں سے تھا، غالباً انہی سے اس نے یہ قصہ سنا ہوگا۔

اسلامی روایات میں سے ایک روایت یہ ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے عبادۃ بن الصامت صحابیؓ کو بادشاہِ روم کے پاس، اسلامی دعوت کا پیغام لے کر بھیجا۔ چنانچہ وہ ایک ایسے غار سے گزرے، جس میں غیر بوسیدہ نعشیں تھیں، یہ جبل الرقیم میں تھیں اور ان کا خیال رکھا جاتا تھا، یہ پہاڑ اس راستے کے قریب ہے جہاں سے شام اور حجاز کے درمیان جانے والے قافلے گزرتے ہیں۔ "و إنه مرّ علی مغارة فیها أجسام غیر بالیة و یعتنی بها في جبل الرقیم علی مقربة من طریق القوافل بین الشام و الحجاز"۔

وہ جگہ، جہاں غار دریافت ہوا ہے، وہ بھی شام و حجاز ہی کے راستے ہی پر واقع ہے۔

بعض تفسیروں میں ہے کہ سعید بن جبیرؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم حضرت معاویہؓ کے ساتھ غزوۂ مضیق میں شرکت کے لیے روم کی طرف بڑھے۔ راستے میں ہمارا گزر اس غار سے ہوا جس میں قرآن میں مذکور اصحاب کہف ہیں تو معاویہؓ نے کہا کہ اگر ان کو ہمارے لیے ظاہر کردیا جاتا تو ہم انہیں دیکھ لیتے۔ حضرت ابن عباسؓ نے ان سے کہا ایسا آپ کے لیے نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ نے ان کو جو آپ سے بہتر تھے، ان کے دیکھنے سے روک دیا، چنانچہ حضور اکرم ﷺ سے اللہ نے مخاطب ہوکر فرمایا ہے: ﴿لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ الکہف: ۱۸ (اے مخاطب) اگر تم ان کو (اس حال میں اوپر سے) جھانک کر دیکھتے

تو ضرور الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہوتے اور ان (کی صورتِ حال) سے تم میں ایک دہشت سما جاتی۔

حضرت معاویہؓ بولے: میں نہیں رکوں گا میں ان کے بارے میں جانکاری حاصل کر کے رہوں گا۔ حضرت معاویہؓ نے کچھ لوگوں کو بھیجا کہ وہ جائیں اور غار میں داخل ہو کر دیکھیں چنانچہ وہ لوگ چل دیے، جب وہ غار میں داخل ہوئے تو ایسی ہوا چلی جس نے انہیں باہر نکال پھینکا۔

عکرمہؓ ہی کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت ابنِ عباسؓ حبیب بن مسلمہ کے ہمراہ ایک غزوہ میں شریک ہوئے راستے میں وہ کہف سے گزرے تو دیکھا کہ اس میں اصحابِ کہف کی ہڈیاں تھیں۔ حضرت ابنِ عباسؓ نے فرمایا: ''لقد ذهبت عظامهم منذ أكثر من ثلاث مئة سنة'' تین سو سال سے زیادہ عرصے سے یہ لوگ ہڈیاں ہوئے پڑے ہیں۔

ان تینوں روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائے اسلام میں اصحابِ کہف کے غار کا محلِ وقوع معلوم تھا، جن صحابہ کرامؓ کا ذکر اوپر آیا ہے وہ اسی علاقے سے گزرے ہیں جہاں غار دریافت ہوا ہے، کسی دوسرے علاقے سے نہیں۔

رازی نے اپنی تفسیر میں ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے: وہ یہ کہ القفال نے محمد بن موسیٰ الخوارزمی منجم سے حکایت بیان کی ہے کہ واثق نے انہیں اصحابِ کہف کا حال معلوم کرنے کے لیے روم بھیجا۔ وہ کہتے ہیں کہ شاہِ روم نے میرے ساتھ کچھ لوگ اس مقام کی راہ نمائی کے لیے بھیجے جہاں وہ غار بتایا جاتا ہے (یقیناً ان کی مراد، کہفِ افسوس ہے)۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اس جگہ پر مقرر شخص نے مجھے اندر داخل ہونے سے ڈرا دیا، لیکن میں اندر چلا گیا اور میں نے ان [مزعومہ اصحابِ کہف] کے سینوں پر بال دیکھے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ یہ مکاری اور چالبازی ہے اور یہ کہ لوگوں نے ان نعشوں پر دوائیں لگا رکھی ہیں تاکہ ان کے بدن سوکھ جائیں اور خرابی سے محفوظ رہیں۔ پھر القفال نے کہا: ہماری معلومات کی حد تک اس جگہ کو اصحابِ کہف کے مقام کی حیثیت سے نہیں جانا جاتا، اہلِ روم کی اس بات کا کوئی اعتبار نہیں کہ یہ مقام اصحابِ کہف کا ہے۔ ''ثم قال القفال و

الذي عندنا لا يعرف أنّ ذلك الموضع هو موضع أصحاب الكهف''۔

جن لوگوں کے خیال میں اصحابِ کہف کا غار افسوس میں ہے، ان کے مزاعم کو باطل قرار دینے کے لیے قدیم اسلامی تاریخ میں اس سے بڑھ کر اور کون سی دلیل ہو سکتی ہے۔

اسلامی روایات میں ایک اور اہم، موثوق اور قابلِ اعتبار روایت وہ قصہ ہے جسے الواقدی نے اپنی کتاب فتوح الشام میں ذکر کیا ہے۔ یہ واقعہ دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ کے دور کا ہے، جب صحابی حضرت سعید بن عامرؓ اس علاقے سے گزر رہے تھے۔ اس واقعے کا ذکر عنقریب آ رہا ہے۔ یہ روایت اس بات کے تاریخی دلائل میں سب سے قوی تر ہے کہ شروع دور کے مسلمان الرقیم کے غار کو اصحابِ کہف کے غار کے طور پر جانتے تھے۔

کُثَیِّر عزّہ کے اشعار

ابو عبد اللہ البشاری المقدسی نے اس مقام کو عمان کے قریب بتایا ہے اور اموی شاعر کثیرِ عزّہ کے اس قصیدے کے اشعار استشہاد کے طور پر پیش کیے ہیں، جن میں اس نے یزید بن عبد الملک کو خلافت کی خوشخبری دی ہے:

يَزُرنَ عَلَى تَنَائِيهِ يَزِيدا ... بِأكنافِ المُوَقَّرِ وَ الرَّقِيمِ

تُهَنِّئُهُ الوُفُودُ إذا أتَوهُ ... بِنَصرِ اللهِ وَ المُلكِ العَظِيمِ

(بہترین اور طاقتور اونٹنیاں لوگوں کو سوار کیے) دور دراز (علاقوں) سے یزید (بن عبد الملک) سے ملاقات کی غرض سے الموقر اور الرقیم کے اطراف میں آ رہی ہیں۔

آنے والے وفود یزید کو اللہ کی مدد اور عظیم سلطنت پر مبارکباد دے رہے ہیں۔

الموقر اور الرقیم دونوں گاؤں عمان کے قریب واقع ہیں اور ان میں اموی اور رومی دور کے محل ہیں۔

محمود العابدی اپنی کتاب الآثار الإسلامية میں فرماتے ہیں کہ المقدسی نے قصر الموقّر کے قریب [اصحاب کہف کے] مقام کو تلاش کیا یہاں تک کہ وہ الرجیب (الرقیم) گاؤں تک پہنچ گئے اور انہوں نے کہا کہ یہ الرقیم کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ حقیقت میں اس

کے قریب کئی غار ہیں جو غور و فکر کے متقاضی ہیں۔

اس خیال کی تائید کرنے والوں میں یاقوت الحموی بھی ہیں جنھوں نے اپنی کتاب معجم البلدان [۴/۱۵۱] میں تحریر کیا ہے کہ عمان اطراف شام میں ایک شہر ہے۔ (یہ) البلقاء کا ایک قصبہ تھا، کہا جاتا ہے کہ دقیانوس کا شہر تھا۔ اس کے قریب ''الکہف والرقیم'' ہے۔ اس علاقے کے لوگ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔ واللہ اعلم [الکہف والرقیم کے بارے میں] اس کے علاوہ بھی کہا گیا ہے۔ [لیکن یاقوت الحموی نے دوسری جگہ اصحاب کہف کا غار، شہرِ افسوس میں ہونے کو ترجیح دی ہے]۔

اصحابِ کہف کے غار کے بارے میں دلائل و قرائن

اس بات کے ثبوت کے لیے کہ یہ وہی غار ہے جس کا ذکر قرآن کریم میں آیا ہے، دلائل و قرائن کو تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: دینی، تاریخی اور آثاری۔

دینی دلائل:

اس سلسلے میں سب سے اہم اور قابلِ اعتماد دلیل قرآن پاک کی آیت شروق و غروب شمس کا اس جگہ پر پوری طرح منطبق ہوجانا ہے، چنانچہ آیت کریمہ میں ارشادِ باری ہے:

﴿وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ إِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾ (اے مخاطب) تم دیکھو گے کہ جب سورج نکلتا ہے تو ان کے غار سے داہنی طرف بچا ہوا رہتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں طرف کو کترا جاتا ہے، وہ غار کے اندر بڑی کشادہ جگہ میں ہیں۔

امامِ بیضاوی اس آیت کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں:

جب سورج نکلتا ہے تو وہ غار سے دائیں جانب کٹ جاتا ہے، اس کی شعاعیں ان پر نہیں پڑتی ہیں کہ انہیں ضرر پہنچائیں، اس لیے کہ وہ غار جنوبی تھا، یا اللہ تعالیٰ نے [اپنی قدرت سے] سورج کو ان سے کاٹ دیا تھا۔ جب سورج غروب ہوتا ہے تو وہ بائیں

جانب کٹ جاتا ہے۔ وہ غار کے اندر بڑی کشادہ جگہ میں ہیں یعنی وسط میں، اس طور پر کہ انہیں ہوا کا اصل فائدہ تو حاصل ہوتا ہے لیکن غار کی تکلیف اور سورج کی تپش انہیں نقصان نہیں پہنچاتی۔ یہ سب اس لیے ہوتا ہے کہ غار کا دروازہ بنات نعش نامی ستاروں کے بالمقابل ہے، اور سورج طلوع و غروب ہونے کی جگہوں (مشارق و مغارب) میں سے اس دروازے سے قریب ترین جگہ رأس السرطان کا مشرق و مغرب ہے۔ جب سورج کا مدار رأس السرطان ہوتا ہے تو سورج دائیں جانب بچ کر طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتے وقت بائیں جانب کٹ جاتا ہے، اس لیے شعاعیں صرف دائیں اور بائیں جانب ہی پڑتی ہیں، جس کی وجہ سے سیلن کی بساند یا عفونت ختم ہوجاتی ہے اور ہوا صاف و معتدل ہوجاتی ہے اور شعاعیں (براہ راست) ان (اصحابِ کہف کے جسموں) پر نہیں پڑتی ہیں کہ ان کے جسموں کو ضرر پہنچائیں اور ان کے کپڑوں کو پرانے اور بوسیدہ بنا دیں۔

''﴿إِذَا طَلَعَتْ تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ﴾ تميل عنه ولا يقع شعاعها عليهم فيؤذيهم، لأنّ الكهف كان جنوبيًا، أو لأنّ الله تعالىٰ زوّرها عنهم ... ﴿ذَاتَ الْيَمِيْنِ﴾ جهة اليمين وحقيقتها الجهة ذات اسم اليمين. ﴿وَ إِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ﴾ تقطعهم و تصرم عنهم ﴿ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ يعني يمين الكهف و شماله لقوله ﴿وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾ أي و هم في متّسع من الكهف يعني في وسطه حيث ينالهم روح الهواء ولا يؤذيهم كرب الغار ولا حرّ الشمس و ذلك لأنّ باب الكهف في مقابلة بنات نعش، وأقرب المشارق و المغارب إلى محاذاته مشرق رأس السرطان و مغربه، و الشمس إذا كان مدارها مداره تطلع مائلة عنه مقابلة لجانبه الأيمن و هو الذي يلي المغرب و تغرب محاذية لجانبه الأيسر فيقع شعاعها على جانبيه و يحلل عفونته و يعدل هواء ه و لا يقع عليهم فيؤذي أجسامهم و يبلي ثيابهم''۔

یہ وصف مکمل طور پر اس کہف پر صادق آتا ہے اس کا محلِ وقوع اسی طرح ہے، اور سورج نکلتے وقت اس میں جھانکتا ہے اور اس کی شعاعیں اس کے دروازے پر رک جاتی

ہیں اور اندر تک نہیں جا پاتیں وہاں فجوہ (کشادہ جگہ یا چبوترا) ہے جس پر یہ لوگ رہا کرتے تھے اور یہ کیفیت غروب تک برقرار رہتی ہے۔

قرطبی کے مطابق خلاصہ یہ ہے کہ اس [کیفیت] میں اللہ کی نشانی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کو ان صفات والے غار میں پناہ دی، کسی اور غار میں نہیں جس میں وہ تمام دن دھوپ سے تکلیف اٹھاتے۔ یہ ممکن ہے کہ دھوپ کو روکنے کے لیے اللہ تعالیٰ ان پر بادل کا سایہ فرما دیتا ہو یا کسی اور ذریعے سے یہ سہولت مرحمت فرماتا ہو۔ اصل میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اجسام اور رنگ وغیرہ کو کسی طرح کی تبدیلی سے محفوظ فرما دیا تھا، اسی طرح ان کو سردی اور گرمی سے بھی کسی قسم کا نقصان نہیں ہوتا تھا۔ وہ غار میں ایک کشادہ مقام پر تھے جہاں وہ بادِ نسیم سے بہرہ ور ہوتے رہتے تھے۔

''ويقول القرطبي: "و علی الجملة فالآية في ذلك أنّ الله تعالیٰ آواهم إلی كهف، هذه صفته لا إلی كهف آخر يتأذون فيه بانبساط الشمس عليهم في معظم النهار، و علی ذلك فيمكن أن يكون صرف الشمس عنهم بإظلال غمام أوسبب آخر، و المقصود بيان تحفّظهم عن تطرّق البلاء و تغيّر الأبدان والألوان إليهم و التأذي بحرّ أو برد. ﴿وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾ أي من الكهف. و الفجوة "المتّسع" ....أي كانوا بحيث يصيبهم نسيم الهواء''۔

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ فجوہ الرقیم کی غار میں موجود ہے۔

کتاب البدایہ والنہایہ میں ہے:

(اس قصے میں یہ) بتایا ہے کہ گرمی اور اس جیسے موسم میں سورج شروع میں مغربی جانب سے غار میں داخل ہوتا ہے پھر تھوڑا تھوڑا نکلنا شروع ہو جاتا ہے یہ ہے ''دائیں طرف بچنے یا کٹ جانے'' کا مطلب، چنانچہ (سورج) آسمان کی طرف فضا میں بلند ہو جاتا ہے اور غار کے دروازے کی طرف سے کم ہوتا چلا جاتا ہے، پھر جب غروب کی طرف مائل ہوتا ہے تو غار میں مشرقی جانب تھوڑا تھوڑا داخل ہوتا ہے جیسا کہ اس جیسے مقامات پر ہوا کرتا ہے، کچھ اوقات اس میں سورج کے داخل کرنے کی حکمت یہ ہے کہ

(وہاں) کی ہوا خراب ہونے سے محفوظ رہے۔

''فأخبر أنّ الشمس [يعني] في زمن الصيف و أشباهه تُشرق أول طلوعها في الغار في جانبه الغربي، ثمّ تشرع في الخروج منه قليلا قليلا، و هو "ازورارها ذات اليمين" فترتفع في جو السماء و تتقلص عن باب الغار، ثم إذا تضيّفت للغروب تشرع في الدخول فيه من جهته الشرقية قليلا قليلا إلى حين الغروب، كماهو المشاهد بمثل هذا المكان. و الحكمة في دخول الشمس إليه في بعض الأحيان أن لا يفسد هواؤه''۔

امامِ طبری اس آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں: ''ہم نے ان نوجوانوں کے ساتھ جن کا قصہ ہم نے آپ کو سنایا ہے یہ معاملہ جو کیا کہ جب ہم نے ان کے کانوں پر پردے ڈالنے کا ارادہ کیا، تو سورج طلوع ہوتے وقت ان کے سونے کی جگہ سے دائیں طرف کٹ جاتا اور غروب ہوتے وقت ان سے بائیں طرف کترا جاتا حالانکہ وہ ایک وسیع و کشادہ جگہ پر تھے، ایسا اس لیے کیا تا کہ سورج انہیں جلا کر ان کے رنگ نہ بدل ڈالے اور طویل عرصے تک سوتے رہنے کی وجہ سے ان کے کپڑے بوسیدہ کر کے سڑا نہ ڈالے۔ [یہ سب کچھ] اللہ کے دلائل میں سے ہے کہ اس نے [سب کو] پیدا کیا ہے۔

''ففعلنا هذا الذي فعلنا بهؤلاء الفتية التي قصصنا عليكم أمرهم من تصييرناهم إذا أردنا أن نضرب على آذانهم بحيث تزاور الشمس عن مضاجعهم ذات اليمين إذا هي طلعت، و تقرضهم ذات الشمال إذا هي غربت مع كونهم في المتسع من المكان بحيث لا تحرقهم الشمس فتشحبهم و لا تبلي على طول رقدتهم ثيابهم [فتعفن] على أجسادهم من حجج الله و أدلته على خلقه''۔

شیخ ابو علی الفضل بن الحسن الطبرسی اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں: پھر اللہ سبحانہ نے اپنے لطف و کرم کا ذکر فرمایا ہے اور یہ کہ ان (اصحابِ کہف) کو ان کے سونے کی جگہ میں محفوظ رکھا اور ان کے سونے کے لیے مناسب ترین مقام کا انتخاب فرمایا، انہیں

کہف میں ایسی جگہ ٹھہرایا جو بناتِ نعش نامی ستاروں کے بالمقابل تھا، (اس لیے) سورج طلوع اور غروب کے وقت ان سے کٹ جاتا تھا تاکہ اس کی گرمی انہیں ایذا نہ پہنچائے اور دھوپ ان کے رنگ تبدیل نہ کر دے اور ان کے کپڑوں کو پرانا نہ کر ڈالے، وہ ایسی کشادہ جگہ پر تھے جہاں انہیں ہوا کا اصل فائدہ ملتا تھا۔

"ثم أخبر سبحانه عن لطفه و حفظه بهم إياهم في مضجعهم و اختياره لهم أصلح المواضع لرقادهم فبوّأهم مكانامن الكهف مستقبلا بنات النعش، تميل الشمس عنهم طالعة و غاربة كيلا يوذيهم حرها أو تغيّر ألوانهم أو تبلي ثيابهم، و هم في متسع ينالهم روح الريح".

دینی دلائل میں سے اس مسجد کی دریافت بھی ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے:
﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾ (سورۃ الکھف: ۲۱)۔ ان (اصحابِ کہف) کے بارے میں جن کی رائے غالب رہی، انہوں نے کہا ہم تو ان (کے غار) پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔

یہاں مسجد سے مراد سجدہ گاہ ہے۔ یہ مسجد ملبہ وغیرہ ہٹانے کے بعد کہف کے اوپر ملی ہے۔ اس میں پرانے ستون ملے ہیں جو غالباً ان کے عدد کو ظاہر کرنے کے لیے بنائے گئے تھے۔ کہف کی جنوبی جانب ایک دوسری مسجد کے آثار بھی ملے ہیں جن سے پتا چلتا ہے کہ مختلف عہدوں میں مسلمانوں کی توجہ اس متبرک مقام کی طرف رہی ہے۔ اسی طرح قرآن میں مذکور کہف کے اندر فجوہ (کشادہ جگہ) بھی موجود ہے۔

تاریخی اور آثاری ثبوت

کہف کے محلِ وقوع کی تفصیل کے موقع پر کچھ تاریخی دلائل بھی بیان کیے جا چکے ہیں۔ وہ تمام کی تمام دلیلیں صحابہؓ اور ان کے بعد کے ان امراء، قائدین اور مسلم علماء سے مروی ہیں جنہوں نے اس مقام کی زیارت کی ہے، یا عہدِ اسلامی و جاہلیت کے شعراء کے کلام سے ان کا پتا چلتا ہے اور بعد میں ہونے والی کھدائی سے ان سب کی تائید ہوتی ہے۔

کھدائی میں قبریں، دو مسجدیں اور فجوہ (کشادہ جگہ) ملا ہے۔ طرزِ تعمیر، نقش و نگار، تحریروں اور بیزنطی عہد کے سکوں وغیرہ سے صاف طور پر اس زمانے کا پتا چلتا ہے جس میں اصحاب کہف ظاہر ہوئے اور جو بڑی حد تک قرآن مجید میں موجود قصے اور مختلف زمانوں کی اسلامی روایات کے مطابق ہے۔ اس سلسلے کا ایک اہم واقعہ الواقدی نے فتوح الشام میں بیان کیا ہے جو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

حضرت سعید بن عامر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت سعید بن عامر کا واقعہ اس کہف کے محلِ وقوع کے بارے میں سب سے قدیم اور معتبر روایت ہے۔ حضرت سعید بن عامر بن خدیم الجمحی القرشی، مہاجرین میں سے ہیں۔ واقعۂ خیبر سے پہلے اسلام لائے۔ ان کا نام حضرت عمر بن الخطابؓ کی خلافت میں بار بار آتا ہے۔ شام کی فتوحات میں ان کے کارناموں کے بارے میں مختلف روایات ملتی ہیں۔ کتبِ تاریخ میں مذکور ہے کہ انہوں نے ایک بار امیر المومنین حضرت عمرؓ کو نصیحت کی: ''اے عمر اللہ سے ڈرو، اہلِ اسلام کے لیے وہی چاہو جو اپنے لیے چاہتے ہو....

جنگِ یرموک کے موقع پر جب رومی فوجیں جنگ کے لیے جمع ہوگئیں اور حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراح نے خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ سے مدد طلب کی تو انہوں نے حضرت سعیدؓ بن عامر ہی کے ذریعے کمک بھیجی، مجاہدین کی فوج کو لے کر جانے کا واقعہ واقدی نے فتوح الشام میں اس طرح بیان کیا ہے:

عمرو بن العلاء نے مجھ سے بیان کیا، انہوں نے کہا کہ ہمیں ماجد نے ثقات سے روایت بیان کی ہے کہ عبداللہ بن قرط مدینے سے جمعے کے دن چلے، پھر جب ہفتے کا دن آیا تو اس دن ہم نے صبح کی نماز حضرت عمر بن الخطابؓ کے پیچھے پڑھی۔ نماز کے بعد ہم لوگ قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے کہ اچانک ہم نے ایک زور کا شور اور ہولناک ہنگامے کی آواز سنی، ہمارے دل دہل گئے اور ہم بھاگتے ہوئے باہر آئے تو دیکھا کہ یمن،

سبا اور حضر موت کے بہت سے آدمی جہاد میں جانے کی غرض سے وہاں جمع ہیں۔ ان کی تعداد چھ ہزار تھی اور ان کے پیشرو جابر بن خول الربعی تھے۔ ان کے سرداران پیدل ہو گئے اور امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کو سلام کیا۔ حضرت عمرؓ نے انہیں وہاں پڑاؤ ڈالنے کا حکم دیا۔ شام تک مکہ، طائف، وادیِ نخلہ اور ثقیف کے ایک ہزار سوار بھی آ پہنچے جن کے پیشرو حضرت سعید بن عامرؓ تھے۔ انہوں نے بھی آ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سلام کیا، پھر یہ لوگ وہیں یمن والوں کے بالمقابل خیمہ زن ہو گئے۔ اگلے دن اتوار کو حضرت عمرؓ نے ان میں سے [مالی طور پر] کمزور لوگوں کو سہارا دیا اور انہیں راستے کے لیے ساز و سامان مہیا کرایا۔ پھر ایک سرخ پرچم قدِ آدم عصا پر نصب کر کے حضرت سعید بن عامر کو دے دیا۔ ابنِ عامر کہتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ کوچ کا حکم ہے۔

حضرت عمرؓ نے فرمایا اے ابنِ عامر ٹھہرو، میں تمہیں نصیحت کر دوں۔ پھر حضرت عمرؓ پیدل چلتے ہوئے آئے، ان کے ساتھ حضرت عثمان بن عفان اور حضرت عباس، حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم بھی تھے، جب یہ لوگ لشکر کے قریب پہنچے تو حضرت عمرؓ رکے، لوگوں نے آپ کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ اب آپ نے حضرت سعید بن عامرؓ سے فرمایا:

اے سعید! میں نے تمہیں اس لشکر کا سردار بنایا ہے، تم ان میں سب سے بہتر نہیں ہو، الا یہ کہ تم اللہ سے ڈرتے رہو، جب تم انہیں لے کر چلو تو جس قدر ممکن ہو ان کے ساتھ نرمی برتنا، ان کی عزت نہ اچھالنا، ان میں سے چھوٹے [مالی یا کسی اور وجہ سے کمزور اور معمولی] کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھنا اور نہ ہی ان میں سے کسی طاقت ور [مالی یا کسی اور وجہ سے مضبوط] شخص کو ترجیح نہ دینا، اپنی ذاتی خواہش اور مرضی کی پیروی نہ کرنا، ان کو پر خطر راستوں پر لے کر مت چلنا، [حتی الامکان] انہیں ہموار راستے پر ہی چلانا، نرم [اور اچھی جگہ] پر ہی سلانا، اللہ تعالیٰ ہی میری طرف سے تمہاری اور تمہارے ساتھ [جانے والے] مسلمانوں کی دیکھ بھال کرنے والا ہے، [یعنی میں تو تمہیں نہیں دیکھ سکتا، اللہ ہی ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے، وہی دیکھے گا کہ تم نے کس حد تک میری ہدایتوں پر عمل کیا ہے]۔

"یا سعید إنّي ولّيتك على هذا الجيش و لستَ بخير رجل منهم إلا أن تتقي الله، فإذا سرت فارفق بهم ما استطعت و لا تشتم أعراضهم، و لا تحتقر صغيرهم و لا تؤثر قويهم، و لا تتبع هواك، ولا تسلك بهم المغاور، و اقطع بهم السهل، و لا ترقد بهم إلا على جادّة الطريق، و اللّٰه تعالىٰ خليفتي عليك و على من معك من المسلمين"۔

راوی کا بیان ہے کہ حضرت سعید بن عامر یہ اشعار پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

نَسِيْرُ بِجَيْشٍ مِنْ رِجَالٍ اَعِزَّةٍ
عَلٰى كُلِّ عَجْعَاجٍ مِنَ الْخَيْلِ يَصْبِرُ
اِلىٰ شِبْلِ جَرَّاحٍ وَ صَحْبَ نَبِيِّنَا
لِنَنْصُرَهٗ وَاللّٰهُ لِلدِّيْنِ يَنْصُرُ
عَلٰى كُلِّ كَفَّارٍ لَعِيْنٍ مُعَانِدٍ
تَرَاهُ عَلَى الصُّلْبَانِ بِاللّٰهِ يَكْفُرُ

ہم ایسے لشکر میں جا رہے ہیں، جس کے افراد اقویاء اور باوقار ہیں اور اصیل گھوڑوں پر صبر کے ساتھ رواں دواں۔

جراح [حضرت ابوعبیدہ کے والد نام ہے] کے شیر بچے کی طرف اور اپنے نبی ﷺ کے اصحاب کی جانب، ان کی مدد کے لیے [جا رہے ہیں] اور اللہ تعالیٰ [اپنے] دین کو مدد و نصرت سے نوازتا ہے۔

بڑے ناشکروں، ملعونوں اور میانہ روی سے ہٹنے والوں کے خلاف، جو صلیبوں کے لیے اللہ کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔

راوی کا بیان ہے کہ حضرت سعید بن عامر روانہ ہو گئے۔ سعید بن عامر کہتے ہیں کہ میں ملکِ شام اور اس کے راستوں سے واقف تھا۔ میں وہاں سال میں ایک دو بار عام راستے سے ہٹ کر [بھی] جایا کرتا تھا۔ سفر میں ستارے میرے رہنما ہوا کرتے تھے۔ جب میں مسلمانوں کے ہمراہ مدینے سے نکلا تو میں انہیں بصریٰ کے راستے پر لے کر چلا،

میں راستہ بھٹک گیا اور عام راستے سے ہٹ گیا۔ مجھے دشمنوں سے [بھی] بچنا تھا اور اپنے لوگوں کا خیال بھی رکھنا تھا، اس لیے میں نے اللہ کی توفیق وعنایت کی امید کے ساتھ اور مسلمانوں کے آرام کا خیال رکھنے کی غرض سے آبادیوں کا راستہ چھوڑ کر صحرا کا راستہ اختیار کیا۔ جب میں راستہ بھول گیا تو مجھے اس راستے کے بارے میں شبہ ہونے لگا اور مجھے ایسا لگا جیسے میں اس راستے سے کبھی گزرا ہی نہیں، لہٰذا میں حیران وپریشان رک گیا، جب میرے ساتھی میرے پاس پہنچ گئے تو میں نے انہیں اس کی خبر نہیں ہونے دی، (بس) میں "لا حول ولا قوة إلا بالله العلي العظيم" کا ورد کرتا رہا۔ اس طرح میں لوگوں کو دو دن دو رات تک نامعلوم راستے پر لے کر چلتا رہا جب وہ لوگ مجھ سے پوچھتے تو میں کہہ دیتا کہ ہم صحیح راستے پر چل رہے ہیں، راستہ مجھے معلوم ہے۔ مدینے سے روانگی کے دسویں دن، ہمیں ایک بڑا پہاڑ نظر آیا۔ میں نے اسے دیکھ کر پہچاننا چاہا لیکن پہچان نہ پایا۔ میں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا کہ واللہ میں لوگوں کو دھوکا دے رہا ہوں، ساتھ ہی دل میں یہ خیال آتا تھا کہ شاید یہ بعلبک کا پہاڑ ہے اور اب راستہ آسان ہو گیا ہے۔ شروع دن ہی میں ہمیں دور سے یہ پہاڑ نظر آنے لگا تھا، لیکن وہاں پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ جب ہم اس پہاڑ کے قریب پہنچے تو ہمیں ایک وادی ملی جس میں ایک بہت بڑا درخت تھا..

وہ مزید بیان کرتے ہیں: جب میں نے اس درخت کو غور سے دیکھا تو پہچان لیا، میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا مبارک ہو، ہم شام پہنچ گئے اور فتح سے قریب ہو گئے ہیں۔ ہم لوگ وادی میں داخل ہوئے، وہاں نہ تو کوئی پگڈنڈی تھی نہ کوئی راستہ، مسلمانوں کو اس وادی کی ہولناکی سے بہت تکلیف پہنچی۔

سعید بن عامر کہتے ہیں کہ ہمارے اکثر لوگ پیدل تھے اور اونٹ اور گھوڑوں پر باری باری سواری کر رہے تھے۔ جب مسلمانوں نے اس وادی کی ہولناکی اور راستے کی دشواریاں دیکھیں تو کہنے لگے، سعید! ہمارا خیال ہے کہ آپ ہمیں غلط راستے پر لے آئے ہیں۔ ہمیں یہاں تھوڑی دیر آرام کر لینے دیجیے، [اس طرح] چلتے رہنے سے ہمیں کافی تکلیف ہوئی ہے۔ میں نے ان کی بات مان لی۔ وادی میں ایک چشمہ تھا جس میں بہت

پانی تھا، مسلمان وہاں اتر گئے، خود پانی پیا اور اپنے گھوڑوں اور اونٹوں کو پانی پلایا۔ اونٹوں اور گھوڑوں نے درخت کے پتے کھانے شروع کر دیے۔ اکثر لوگ سو گئے اور کچھ لوگ درود شریف پڑھنے لگے۔

حضرت سعید بن عامر کہتے ہیں کہ میں لوگوں میں سب سے پیچھے بیٹھا ان کی نگرانی کر رہا تھا، ساتھ ہی قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا، نیز خدا سے سلامتی کی دعاء مانگ رہا تھا، اچانک مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا اور میں [بھی] سو گیا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک سرسبز وشاداب باغ میں ہوں جس میں بہت سے درخت اور پھل ہیں، میں پھل کھا رہا ہوں اور باغ کی نہروں کا پانی پی رہا ہوں اور اس کے پھل توڑ کر اپنے ساتھیوں کو دے رہا ہوں، وہ بھی کھا رہے ہیں اور میں بہت خوش ہوں۔ اسی دوران درختوں میں سے ایک شیر نکلا اور میرے سامنے [آکر] دہاڑا اور مجھے پھاڑ ڈالنا چاہا۔ میں خوف زدہ ہوا اور گھبرا گیا، پھر کیا دیکھتا ہوں کہ اچانک دو شیر نمودار ہوئے اور انہوں نے اس شیر پر حملہ کر دیا اور اس کو اسی جگہ ڈھیر کر دیا، میں نے مرنے والے شیر کی زبردست دہاڑ سنی، جس سے میری آنکھ کھل گئی۔ ان پھلوں کی مٹھاس مجھے ابھی تک محسوس ہو رہی تھی اور وہ شیر مجھے اپنے سامنے معلوم ہو رہے تھے۔

سعید بن عامرؓ کہتے ہیں: میں نے اس کی تعبیر یہ نکالی کہ یہ باغ مالِ غنیمت ہے جو مسلمانوں کو حاصل ہوگا اور کوئی چیز رکاوٹ بنے گی لیکن ہم اس پر قابو پالیں گے۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ جنت (باغ) دراصل شہادت سے تعبیر ہے۔

سعید بن عامر کہتے ہیں کہ میں برابر بیٹھا قرآن مجید کی تلاوت کرتا رہا اور میں کچھ پریشان سا ہو گیا تھا کہ اچانک میں نے وادی کی دائیں طرف سے ایک غیب کی آواز سنی، کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا:

يَاعُصْبَةَ الْهَادِي إِلَى الرَّشَادِ لَا تَفْزَعُوْا مِنْ وَعْرِ هٰذَا الْوَادِي

مَافِيْهِ مِنْ جِنٍّ وَلَا مُعَادِي سَتَعْلَمُـــــوْنَ مَعْشَرَ الْعِبَادِي

لُطْفُ الَّذِي يَرْفُقُ بِالْأَوْلَادِ وَيَطْرَحُ الرَّحْمَــةَ فِي الْأَكْبَادِ

اے رشد و ہدایت کی راہ دکھانے والے [حضرت محمد ﷺ] کی جماعت، اس وادی
کی دشوار گزاری سے پریشان و خوف زدہ نہ ہو۔
اس میں کوئی جن یا دشمن نہیں ہے جیسا کہ تمہیں خود معلوم ہو جائے گا، اے [اللہ
کے] بندوں کی جماعت!۔
[یہ سب، اس ذات پاک کی] مہربانی ہے جو اولاد کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کراتا
ہے اور دلوں میں رحمت و شفقت کے جذبات کا القاء کرتا ہے۔

سعید بن عامر کہتے ہیں کہ جب میں نے غیب سے یہ اشعار اور ان میں مذکور غنیمت
کی بشارت سنی تو میں اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو گیا۔ اس غیب کی آواز سے ہمارے
ساتھی بھی بیدار ہو گئے۔

سعید بن عامر کہتے ہیں کہ مجھے ایک شعر یاد ہوا اور باقی تین اشعار سماح کو یاد ہو گئے
جو انہوں نے مجھے سنائے۔ غیب کی آواز سن کر ہمارے ساتھی بھی خوش ہو گئے اور غنیمت کی
خوشخبری سے ان کے دلوں کو فرحت ملی۔ ہم صبح ہونے تک اسی وادی میں مقیم رہے۔ فجر کی
نماز میں [سعید بن عامر رضی اللہ عنہ] نے پڑھائی اور سورج نکلنے پر ہم اس وادی سے
روانہ ہو لیے۔ [حضرت سعید بن عامرؓ کہتے ہیں کہ جب] میں نے اس جگہ کو اور پہاڑ کو غور
سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ جبل الرقیم ہے۔ جب میں نے اسے دیکھا تو پہچان لیا اور بلند
آواز سے تکبیر پڑھی اور کہا اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ ساتھی مسلمانوں نے بھی میری تکبیر کے
جواب میں نعرۂ تکبیر بلند کیا۔ پھر انہوں نے دریافت کیا کہ اے ابنِ عامر آپ نے کیا
دیکھا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ہم شام پہنچ گئے ہیں اور یہ جبل الرقیم ہے۔ وہ بولے
سعید! الرقیم [کا] کیا [واقعہ] ہے؟۔ میں نے ان کو الرقیم کا واقعہ بتایا۔ ان لوگوں کو اس
واقعے سے بہت تعجب ہوا۔ پھر میں انہیں اس غار تک لایا، انہوں نے وہاں نماز پڑھی اور
اس کے بعد ہم روانہ ہوئے اور عمان کے قریب پہنچ گئے۔

سعید بن عامر کہتے ہیں کہ میں پھر [اپنے لشکر کو لے کر] ایک گاؤں کی طرف مڑ گیا
جس کا نام ''البجان'' ہے۔ میں نے وہاں کے لوگوں کو دیکھا کہ وہ گاؤں سے باہر نکلے

ہوئے ہیں اور ان کے ہمراہ ان کے اہل و عیال بھی ہیں۔ مسلمانوں نے جب انہیں دیکھا
تو بغیر کسی اجازت کے ان پر حملہ کر دیا اور ان میں سے کچھ کو قیدی بنا لیا، اب یہ لوگ گاؤں
کی طرف واپس ہو لیے جہاں ایک قلعہ تھا اور ہم سے بچنے کے لیے وہاں قلعہ بند ہو گئے۔
حضرت سعید کہتے ہیں کہ میں اس قلعے کے قریب گیا اور انہیں پکار کر کہا: ارے برباد ہو! کیا
بات ہے؟ پہلے تو تم گاؤں سے باہر نکلے کھڑے تھے اور اب اندر گھس گئے تو ان میں سے
ایک شخص بولا: اے عرب کے گروہ! ہم یہاں سے نکل کر جا رہے تھے، پھر آپ لوگوں سے
خوف زدہ ہو کر اپنے گھروں کو واپس ہو گئے۔ ہمارے نکلنے کی وجہ یہ تھی کہ عمان کے حاکمِ
نقیطاس نے ہمیں عمان بلایا تھا تا کہ ہم اس کی پناہ میں آ جائیں۔ اے عرب کے گروہ! کیا
اب ہم تمہاری پناہ میں آ سکتے ہیں؟ حضرت سعید نے جواب دیا: ہاں، ٹھیک ہے۔ پھر دس ہزار
دینار پر ہمارے درمیان صلح ہو گئی اور میں نے انہیں صلح نامہ لکھ دیا۔ جب ہم چلنے کے لیے تیار
ہوئے تو انہوں نے کہا کہ اے عرب کے گروہ! ہم نے تم سے صلح تو کر لی ہے، لیکن ہمیں اپنی قو
م سے [اب بھی] خطرہ ہے اور حاکمِ عمان اس [صلح] کی وجہ سے ہمیں سخت تکلیف پہنچائے
گا۔ اگر تم اس پر بھی غلبہ پا لو تو یہ ہمارے اور تمہارے دونوں کے لیے بہتر ہو گا۔ اور اس
صورت میں تمہیں مالِ غنیمت بھی خوب ملے گا.... حضرت سعید نے پوچھا عمان کے لشکر کی
تعداد کتنی ہو گی؟ انہوں نے بتایا کہ ان کا لشکر پانچ ہزار سواروں پر مشتمل ہے۔

آگے واقدی نے جو واقعہ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت سعید بن عامر
کے لشکر اور عمان کے لشکر کی ٹکڑیوں کے درمیان سخت جنگ ہوئی جس میں مسلمانوں کو فتح
نصیب ہوئی اور ان کے دشمن ذلیل و رسوا ہوئے۔ جب عمان کے حاکم کو شکست کا علم ہوا
تو اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ باقی لشکر، مسلمانوں پر بھرپور حملہ کر دے۔ مسلمانوں
نے ان کو بھی شکستِ فاش دے دی۔ جب بطریق نقیطاس (حاکمِ عمان) کو مسلمانوں کی
کارروائی کا علم ہوا تو وہ بچی کھچی فوج کے ساتھ بھاگ کھڑا ہوا، جس وقت وہ لوگ بھاگ
رہے تھے ان کا سامنا مسلمانوں کے ایک [دوسرے] سوار دستے سے ہو گیا۔ اس دستے
نے بھی ان کا پیچھا کیا۔ انہوں نے اپنے گھوڑوں کو تیزی سے دوڑایا، ان کی لگامیں

چھوڑ دیں اور نیزوں کو سیدھا کر لیا۔ ان کی تعداد ایک ہزار کے قریب تھی۔ اس دستے کی قیادت دو مشہور شہسوار حضرت زبیر بن عوامؓ اور حضرت فضل بن عباسؓ کر رہے تھے۔ ان لوگوں نے رومیوں پر زبردست حملہ کیا اور لاشوں کے ڈھیر لگا دیے۔ حضرت زبیر رضی اللہ نے بطریقِ عمان اور قائدِ لشکر نقیطاس پر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ جب سعید بن عامر نے یہ صورتِ حال دیکھی تو وہ سمجھے کہ شاید مسلمانوں میں آپس میں اختلاف ہو گیا ہے جو وہ اس طرح بٹ گئے ہیں لیکن جب وہ اور ان کے ساتھی مسلمانوں کے [اس دستے] سے قریب ہوئے تو انہوں نے تہلیل وتکبیر کی آواز سنی، اس پر یہ لوگ بولے کہ یہ تو حق کی پکار ہے۔ حضرت سعید ان میں گھس گئے۔ اب انہوں نے حضرت فضل بن عباسؓ کو کہتے سنا کہ میں اللہ کے رسول ﷺ کا چچازاد بھائی ہوں۔ [حقیقت کھل جانے پر دونوں لشکر کے] مسلمان آپس میں ایک دوسرے کو سلام کرنے لگے۔ حضرت زبیر حضرت سعید کے پاس آئے اور بولے: اے ابنِ عامر! ہماری طرف آنے میں تاخیر کیوں ہوئی؟ سالم بن نوفل العدوی نے آکر ہمیں بتا دیا تھا کہ تم ہماری مدد کے لیے چل چکے ہو۔ ہم تمہارے بارے میں تشویش میں مبتلا ہو گئے تھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے ہمیں عمان پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ مسلمان صحیح سلامت ہیں اور مشرکین تباہ و برباد۔ پھر یہ لوگ آگے بڑھے اور حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے پاس اس حال میں پہنچے کہ مقتول رومیوں کے سر ان کے نیزوں پر تھے جب حضرت سعید بن عامر کو یہ کامیابی و فتح نصیب ہوئی اور ان کا خواب پورا ہو گیا تو وہ اللہ عزّ وجلّ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ہو گئے۔

یہ واقعہ اور اس میں مذکور جبل الرقیم اور اس کے کہف کا ذکر ان واضح اور اہم دلائل میں سے ہے جن سے پتا چلتا ہے کہ اسلام کے شروع دور میں یہی جگہ اصحاب کہف کے غار کے لیے مشہور تھی، کوئی دوسری جگہ نہیں۔ واللہ أعلم۔

ہم نے یہ واقعہ من وعن نقل کر دیا ہے اگرچہ اس میں بعض جگہ عبارت واضح نہیں ہے۔ اس کے بیان کرنے سے ہمارا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ ابتدائی دور کے مسلمان جبل الرقیم ہی کو اصحاب کہف کے غار کی حیثیت سے جانتے تھے۔

صلاح الدین ایوبی کے ایک فوجی جنرل کی اس غار پر حاضری

اس جگہ کا مشاہدہ کرنے والوں اور اس کے بارے میں لکھنے والوں میں امیر اسامہ بن منقذ بھی ہیں جو صلاح الدین ایوبی کے ایک جنرل تھے۔ انہوں نے اپنی کتاب ''الاعتبار'' میں اس زیارت کے بارے میں لکھا ہے [الاعتبار تحقیق فلپ حتّی ص ۱۸]:

''نور الدین امیر عین الدولہ الیاروقی نے میرے ساتھ تیس گھوڑسوار روانہ کیے۔ میں راستے میں الکہف اور الرقیم سے گزرا۔ میں اس میں اندر اترا اور وہاں موجود مسجد میں نماز پڑھی۔ میں اس میں موجود تنگ سوراخ [نما راستے] میں داخل نہیں ہوا۔ [اس سے ان کا مقصود غالباً وہ دہانہ ہے جو دریافت شدہ غار میں موجود ہے، اور اوپر واقع مسجد اور الکہف کو ملاتا ہے] میرے ساتھ جو ترک تھے ان میں سے ایک امیر آیا جس کا نام برشک تھا اور اس تنگ سوراخ میں داخل ہونے لگا۔ میں نے اس سے کہا بس نفل نماز پڑھ لو۔ اس نے جواب دیا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اگر میں اس میں داخل نہ ہو سکوں تو میں بے باپ کا۔ میں نے کہا کیا کہتے ہو! اس نے کہا کہ اس میں وہی شخص داخل نہیں ہو سکتا جس کے باپ کا علم نہ ہو، اس کی بات نے میرے لیے بھی داخل ہونا ضروری کر دیا، میں کھڑا ہوا اور اس میں داخل ہوا، نماز پڑھی، اللہ ہی جانتا ہے، میں نے اس کی بات کو سچ نہیں مانا۔ فوج میں سے اکثر سپاہی آئے اور وہ داخل ہوئے اور نماز ادا کی۔ لشکر میں میرے ساتھ براق الزبیدی تھے اور ان کے ساتھ ایک حبشی غلام تھا جو بڑا ہی نمازی اور نیک تھا اور بہت دبلا پتلا اور بڑا مہذب۔ وہ اس مقام پر آیا اور اس میں داخل ہونے کی ہر طرح کوشش کر لی لیکن داخل نہ ہو سکا۔ وہ بے چارا رو پڑا اور بہت ہی شرمسار ہوا، آخر تھک ہار کر لوٹ گیا۔

اصحابِ کہف کا غار، قرآن مجید کی روشنی میں

سورج کے طلوع وغروب کے وقت کی کیفیت

اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکہف (آیت ۱۷) میں فرمایا ہے: ﴿وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ إِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾ آپ دیکھیں گے کہ سورج طلوع کے وقت ان کے غار سے دائیں جانب جھک جاتا ہے اور غروب ہوتے وقت ان کے بائیں جانب کترا جاتا ہے اور وہ اس غار کی کشادہ جگہ میں ہیں۔

اصحابِ کہف کے غار کے محلِ وقوع کی تعیین میں یہ آیت بہت اہم ہے، جس غار پر یہ کیفیت منطبق ہو جائے وہی دراصل قرآن مجید میں مذکور اصحابِ کہف کا غار ہوگا۔

غیر اسلامی مآخذ افسوس کے غار پر اس آیت کے منطبق ہونے کا انکار کرتے ہیں جیسا کہ مؤرخ گبن [ص ۲۴۲ حاشیہ نمبر ۴۶] اس کیفیت اور کتے کو قرآن یا حضرت محمد ﷺ کی ایجاد سے تعبیر کرتا ہے۔ کہف کے صحیح محلِ وقوع کے لیے خواہ وہ الرجیب میں ہو یا کہیں اور اس آیت کا انطباق ضروری ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ کہف میں اور خاص طور پر فجوہ (کشادہ جگہ) پر سورج کی شعاعیں نہیں پڑتی ہیں۔ اس صفت کا انطباق صرف کہف الرجیب پر ہوتا ہے۔

مسجد یا بیزنطی کنیسے کا وجود

اللہ تعالیٰ سورۃ الکہف کی (آیت ۲۱) میں فرماتا ہے: ﴿إِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ

أَمْرَهُمْ، فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا، رَبُّهُمْ أَعْلَمُ بِهِمْ، قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰى أَمْرِهِمْ: لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾ جب کہ وہ اپنے امر (یعنی اس بات) میں آپس میں اختلاف کر رہے تھے، کہنے لگے ان کے غار پر ایک عمارت بنا لو۔ ان کا رب ہی ان کے حال کا زیادہ جاننے والا ہے۔ جن لوگوں نے ان کے بارے میں غلبہ پایا، وہ بولے ہم تو ان (کے غار) پر مسجد بنائیں گے۔

الثعلبی نے اپنی کتاب قصص الأنبياء میں حضرت ابن عباسؓ سے بیان کیا ہے کہ جب اصحابِ کہف کے معاملے کا انکشاف ہوا تو شاہ تندوسیس (تھیوڈوسیس) جلدی سے اصحابِ کہف کے شہر پہنچا، اہلِ شہر بھی اس کے ساتھ تھے، جب ان نوجوانوں نے بادشاہ اور اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگوں کو دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور ان کے سامنے اللہ کے لیے سجدہ ریز ہو گئے۔ پھر انہوں نے بادشاہ سے کہا ہم تمہیں اللہ کے سپرد کرتے ہیں اور تم پر سلام پڑھتے ہیں، اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت فرمائے اور تمہارے ملک کو اور تمہیں انسانوں اور جنات کے شر سے اپنی پناہ میں رکھے۔ ابھی بادشاہ وہاں کھڑا ہی تھا کہ وہ اپنی جگہوں پر لوٹ کر سو گئے اور اللہ نے ان کی روحوں کو قبض فرما لیا... بادشاہ کے حکم سے کہف کے دروازے پر ایک عبادت گاہ بنا دی گئی، اور بادشاہ نے ان کے لیے ایک عظیم جشن (منانے کے لیے ایک دن) مقرر کر دیا۔ البیرونی نے اپنی کتاب الآراء الباقية (ساخاؤ ایڈیشن، ص ۲۹۰) میں ذکر کیا ہے کہ ۵/نومبر کو شہر افسس میں اصحابِ کہف کا جشن منایا جاتا ہے (رفیق ۳۳-۳۴)۔

یونانی مآخذ میں سے شماس ذقیوس مبریکیوس [؟] کی کتاب قصص القدیسین (صفحہ ۲۱۹) میں ہے کہ ۴/اگست (مشرقی) مطابق ۱۷/اگست (مغربی) کو ساتوں اصحابِ کہف کا جشن منایا جاتا ہے۔ (رفیق ۴۳)۔

عمان کے مضافات میں کہف الرجیب کی کھدائی کے دوران دو مسجدیں برآمد ہوئی ہیں۔ ایک مسجد ٹھیک کہف کے اوپر ہے اور دوسری جنوبی جانب میں کہف کے دروازے کے پاس ہے۔ پہلی مسجد صالح بادشاہ جسٹینیوس اوّل کے عہد ۵۱۸ تا ۵۲۷ء کے درمیان

بنے کسی بیزنطی عبادت گاہ (کنیسہ) پر تعمیر کی گئی ہے۔ دوسری مسجد بھی بیزنطی عہد کی دیواروں پر بنائی گئی ہے۔ دراصل یہ قرآن کریم کے مذکورہ بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب جیمس ساروغی موجود تھا، اور اس نے اصحاب کہف کا قصہ تحریر کیا ہے۔ (رفیق ۳۴)

اصحاب کہف کے غار کی دریافت

محمد تیسیر ظبیان کے مطابق ۱۹۵۳ء کے موسمِ خزاں میں ایک دن جمعے کے روز مسجدِ حسین، عمان میں نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد انہوں نے ایک ٹیکسی کرایے پر لی اور اللہ تعالیٰ سے خیر طلب کرتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے جہاں اصحاب کہف کا غار ہے۔ ان کے ساتھ عمان کے ان کے ایک تاجر دوست بھی تھے۔ ان دونوں کو اس جگہ تک پہنچنے میں کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور تقریباً تین کلومیٹر پیدل بھی چلنا پڑا۔ پھر وہ ایک درمیانی بلندی والے پہاڑ تک پہنچ گئے، وہاں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو غار کے بارے میں بتا سکے۔ آخر تھوڑی دیر آرام کیا۔ اسی دوران مویشیوں کا ایک ریوڑ آتا دکھائی دیا جس کے ساتھ چرواہا بھی تھا (جو شوابکہ عرب میں سے تھا جو متصل گاؤں میں رہتے ہیں جو ان کی زبان میں الرجیب کہلاتا ہے)۔ اس سے غار کے بارے میں پوچھا تو وہ انہیں وہاں سے کئی سو میٹر آگے اس مقام تک لے گیا۔ اب یہ لوگ ایک اندھیرے غار کے سامنے کھڑے تھے جو غیر آباد پہاڑ میں واقع تھا۔ اس میں اندھیرے کی وجہ سے داخل ہونا ممکن نہ تھا۔ چرواہے نے بتایا کہ اس میں کچھ قبریں ہیں اور کچھ بوسیدہ ہڈیاں۔ غار کا دروازہ جنوبی جانب ہے اور دروازے کے دونوں جانب دو ستون ہیں جو چٹان کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ان دونوں ستونوں پر بیزنطی نقوش تھے۔ غار تمام اطراف سے پتھروں، مٹی اور ملبے سے پٹا ہوا تھا۔ اس موقع پر سو میٹر کی دوری پر واقع الرجیب نامی چھوٹے سے گاؤں کا بھی معاینہ کیا گیا اور یہ بھی دیکھا کہ اس غار کے قریب کئی اور غار بھی ہیں۔

محمد تیسیر ظبیان نے فوراً ہی اس جگہ کی تصویر لی جو غالباً اس غار کی پہلی تصویر تھی۔ انہوں نے واپس آکر فوراً ہی عمان سے نکلنے والے جریدے الجزیرۃ میں ایک مضمون شائع کیا اور دوسرا مضمون دمشق سے شائع ہونے والے رسالہ "الشرطة و الأمن العام" میں شائع کرایا۔ اس میں انہوں نے اپنی لی ہوئی تصویریں بھی شائع کرادیں۔ ان دونوں مضمونوں میں اصحاب نظر وفکر اور علمائے آثار قدیمہ کو اس بات کی دعوت دی گئی تھی کہ وہ اس جگہ کی طرف توجہ دیں اور اس سلسلے میں تحقیقات فرمائیں اور یہاں پر کھدائی کی جائے۔

محکمۂ آثارِ قدیمہ، اردن سے رابطہ

محمد تیسیر ظبیان لکھتے ہیں (ص ۴۰):

عمان میں اس وقت کے [۱۹۵۳ء میں] محکمۂ آثارِ قدیمہ کے ڈائرکٹر کو (جو انگریز تھے) میں نے ایک خط لکھا اور ان سے گزارش کی کہ وہ اس جگہ کا معائنہ کریں اور اس کی طرف توجہ مبذول کریں۔ اس خط کے ساتھ میں نے اپنے دونوں مضامین بھی منسلک کردیے، لیکن انہوں نے کوئی توجہ نہ دی۔

۱۹۶۱ء میں جب ڈاکٹر عونی الدجانی مرحوم اس محکمہ کے ڈائرکٹر بنے تو میں نے فوراً ان کے دفتر میں جاکر ان سے ملاقات کی۔ ان کے دو معاونین محمود العابدی اور رفیق الدجانی کی موجودگی میں ان کی توجہ اس مقام کی طرف مبذول کرائی اور باصرار گزارش کی وہ خود اس جگہ تشریف لے جائیں اور غار کے پتھر کے دروازے کے اطراف پر بنائے گئے نقش ونگار ملاحظہ فرمائیں۔ چنانچہ انہوں نے میری درخواست منظور کرلی۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

پھر ہم لوگ یعنی وہ، ان کے معاونین اور میں اس جگہ پر پہنچے، جیسے ہی مرحوم نے غار کے بیرونی حصے اور اس پر موجود نقش ونگار پر نظر ڈالی تو انہوں نے فوری کھدائی اور وہاں سے کوڑا کباڑ وغیرہ ہٹانے کی ضرورت محسوس کی اور اپنے دونوں معاونین کو ہدایت دی کہ وہ اس سلسلے میں ضروری کارروائی کریں تاکہ یہ کام رابطۂ علومِ اسلامیہ کے تعاون سے

شروع کیا جا سکے۔ اس کے بعد ہم سب محکمۂ آثارِ قدیمہ کے دفتر واپس آ گئے تاکہ آئندہ کا پروگرام مرتب کیا جا سکے اور اس کا جائزہ لیا جائے کہ رابطۂ علومِ اسلامیہ اس سلسلے میں کیا تعاون کر سکتا ہے۔

کھدائی کے کام میں جلدی کے پیشِ نظر محمد تیسیر ظبیان نے ڈائرکٹر مذکور کو رابطۂ علومِ اسلامیہ کی طرف سے ایک خط نمبر ۳۸ بتاریخ ۲۶/۱۰/۱۹۶۱ء لکھا جس میں انہوں نے اس عظیم مقام اور اس سے متصل دوسرے غاروں کی فوری کھدائی کی ضرورت کے بارے میں لکھا تھا۔ اس کے جواب میں انہیں محکمۂ آثارِ قدیمہ کی طرف سے ایک خط ملا جس میں تحریر تھا کہ الرجیب (الرقیم) سے متصل بعض غاروں کے تحفظ کے جذبے کے لیے ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان تاریخی غاروں کے تحفظ کے سلسلے میں ہم آپ کے ساتھ ممکن حد تک تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں۔

محمد تیسیر ظبیان کہتے ہیں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت محکمۂ آثارِ قدیمہ اپنے بجٹ کی وجہ سے اپنا وعدہ پورا کرنے سے قاصر رہا۔ اوائل اپریل ۱۹۶۳ء میں، میں نے پھر ڈاکٹر عونی الدجانی اور ان کے دونوں معاونین سے رابطہ قائم کیا اور اس موضوع پر دوبارہ گفتگو کی۔ اب اس بات پر اتفاقِ رائے ہو گیا کہ عنقریب اپنا کام شروع کر دیا جائے گا۔ اس زبانی گفتگو کی تائید میں اگلے روز مجھے ڈاکٹر عونی الدجانی کا خط مؤرخہ ۱۵/۴/۱۹۶۳ء ملا، اس میں تحریر تھا کہ محکمۂ آثارِ قدیمہ غار کے اوپر غار کے اندر اور غار کے آس پاس سے کوڑا کباڑ ہٹا دے گا اور اسے اس بات پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے کہ وہ مسجد دوبارہ تعمیر کر دی جائے جو اس غار پر پہلے سے تھی۔ آپ وہاں ایک پارک بھی بنا سکتے ہیں تاکہ اس مقدس جگہ کی خوبصورتی میں اضافہ ہو جائے اور محکمہ اس آثاری جگہ کی مرمت میں تعاون کے لیے بھی تیار ہے، نیز وہ اس جگہ کو زیارت گاہ بنانے کے لیے سہولتیں فراہم کرے گا اور یہ محکمہ اپنا کام خود شروع کر رہا ہے۔

کھدائی اور جانچ کا کام (محکمۂ آثارِ قدیمہ کی رپورٹ)

کھدائی سے پہلے:

محمد تیسیر ظبیان (ص ۵۹) لکھتے ہیں:

رفیق الدجانی مرحوم کی زیرِ نگرانی، محکمۂ آثارِ قدیمہ کی تیار کردہ رپورٹ کے مطابق ۳/ جون ۱۹۶۳ء کو کھدائی عملہ جب یہاں پہنچا تو یہ جگہ، کوڑے کباڑ اور ریت وغبار سے اٹی ہوئی تھی۔ کہف کے اوپر کی مسجد کے جنوبِ مشرق میں بیزنطی پتھروں کی رڈوں کی تین لائنیں اور جنوبِ مغرب کی طرف رڈوں کی دو لائینیں اور مسجد کے مشرقی میدان کے سامنے کے جنوبی ستون کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ مسجد کی دیواروں، محراب اور اذان کے لیے اوپر جانے کے راستے وغیرہ کا کچھ پتا نہیں تھا۔ جنوبی مسجد بھی کوڑے کباڑ سے اٹی پڑی تھی اور کوئی بھی ایسی علامت نظر نہیں آ رہی تھی جس سے مسجد کا پتا چل سکے۔ کہف کے میدان کی مغربی دیوار کے تین یا چار بھاری بیزنطی پتھر نظر آ رہے تھے اور باقی حصہ کوڑا کباڑ اور ریت سے ڈھکا ہوا تھا۔ کہف کا میدان بھی پتھروں، کوڑا کباڑ اور نئی قبروں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ کوڑا کباڑ زمین کی سطح سے ایک سو ستر سینٹی میٹر بلند تھا اور اس کوڑے کباڑ نے غار کے دروازے کا چوتھائی حصہ ڈھانک رکھا تھا۔ غار کے اندر بھی یہی حالت تھی، وہاں بھی اسی سینٹی میٹر کی اونچائی تک کوڑا کباڑ تھا اور بعض جگہ ایک میٹر سے بھی زیادہ۔ کہف کے اندر پرانی اور نئی قبریں بھی بھری پڑی تھیں۔ پتھروں کے چھے تابوتوں میں سے صرف چار نظر آ رہے تھے۔ یہ تابوت انسانی ہڈیوں اور پتھروں سے بھرے ہوئے تھے۔ ہر دو تابوت کے درمیان ایک قبر تھی جس کا بیرونی حصہ پتھر کا تھا۔ غار کے اندر شمالی حصے میں بھی کچھ قبریں تھیں۔ پتھر سے بنی ایک کھوہ بھی ملی جس کا بالائی حصہ پتھروں سے بند تھا۔ کہف کے اندر شمالی میدان کو اس کے وسطی میدان اور قبروں سے ایک رومی ڈاٹ علیحدہ

کرتی ہے جو بھاری پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔ اس پر رومی طرز کے مشہور نقش ونگار تر کھجور وغیرہ کی شکل میں بنے ہیں۔ یہ نقش ونگار اسی طرز کے ہیں جس طرح کے ہمیں عمان کے رومی امفیتھیٹر کی ڈاٹوں اور جبل القلعہ کے رومی معبد اور جرش والبترا ء کی عمارتوں پر ملتے ہیں جو پہلی اور دوسری صدی عیسوی کی یادگار ہیں۔ کہف کے اندر ٹھوس چٹان پر نقوش بھی ملتے ہیں۔ وسطی میدان کی چھت مسطح ہے اور مشرقی میدان کی چھت ڈاٹ نما ہے، اسی طرح اس کا مغربی میدان ہے۔ شمالی میدان میں صلیب کے طرز پر ایک ڈاٹ بنی ہے اور یہ ڈاٹ رومی طرز کے بھاری پتھروں سے بنے ستونوں پر رکی ہوئی ہے۔ اس پر بنے نقش ونگار سے پتا چلتا ہے کہ یہ رومی عہد کی ہے۔

اس رپورٹ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ یہ جگہ درحقیقت ایک چھوٹے پہاڑ (یعنی جبل الرقیم) کے جنوبی دامن میں واقع ہے اس پہاڑ سے دلکش مناظر اور تاحدِ نظر وسیع نشیبی علاقے نظر آتے ہیں، جن کے نظارے سے غور وفکر اور عبادت کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ یہ جگہ شاہراہ سے کٹی ہوئی ہے اور عام (یعنی عمان، مأدبا، الکرک اور العقبہ کے) راستے سے تین کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اس راستے سے گزرنے والا اس غار کو نہیں دیکھ سکتا اور نہ ہی اس کی طرف متوجہ ہوسکتا ہے ہے الّا یہ کہ وہ اس کے قریب ہی پہنچ جائے۔ کھدائی سے پہلے کہف کے قریب واقع علاقے کا جائزہ لیا گیا تو اصحاب کہف کے غار کی مغربی جانب تقریباً پانچ سو میٹر کی دوری پر ایک اور غار ملا جو محکمۂ آثار قدیمہ کے ریکارڈ میں درج ہے۔ یہ غار بہت خوبصورتی سے تراش کر بنایا گیا ہے، اس کا دروازہ زمین کے اندر تک ٹائلوں سے بند ہے اور اس کے سامنے کا حصہ پھول پتیوں اور انگور کی بیلوں کے نقش ونگار سے مزین ہے، اسی طرح ہمیں ایک اور غار ملا جس میں تین مسطح ڈاٹیں ہیں۔ اس میں اترنے کے لیے ایک سیڑھی بنی ہوئی ہے۔ اسی طرح تیسرا غار بھی ہے جس کا دروازہ چھوٹا ہے اور اس میں اترنے کے لیے تین سڑھیاں ہیں۔ اصحاب کہف کے غار کا علاقہ بہت سی رومی اور بیزنطی قبروں سے گھرا ہوا ہے، جو چٹانیں کاٹ کر بنائی گئی ہیں۔

کھدائی کے کام کی ابتداء اور رفیق الدجانی کی رپورٹ

رفیق دجانی مرحوم ٹیکنیکل اسسٹنٹ برائے ڈائرکٹر محکمۂ آثار قدیمہ اردن اور کھدائی ٹیم کے سربراہ کی مرتبہ رپورٹ (ص ۶۲) میں آیا ہے:

۱۰/۶/۱۹۶۳ء سے کچھ پہلے ڈائرکٹر محکمۂ آثار قدیمہ نے مجھ سے کہا کہ میں اس مہم کے لیے تیار ہوجاؤں تا کہ ۱۰/جون سے کام شروع کیا جاسکے، چنانچہ ہم نے پچاس آدمیوں کے لیے سازوسامان تیار کیا اور ایک بڑے خیمے کا انتظام کیا جو دفتر کا کام دے سکے۔ رابطۂ علوم اسلامیہ نے تین خیموں سے ہماری مدد کی تا کہ ہم انہیں اسٹور کے طور پر اور سونے کے لیے استعمال کرسکیں۔ یہ ٹیم مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھی:

(۱) رفیق الدجانی، تکنیکی معاون برائے ڈائرکٹر آثار قدیمہ اور کھدائی وجائزے کے سربراہ

(۲) محمد الغوج، نگرانِ محکمہ، دو ہفتے کے بعد ان کی جگہ پر فائز الطراونہ فائز ہوگئے

(۳) یوسف عبدالرحمٰن، اس مہم کے نگرانِ عام

(۴) پانچ تربیت یافتہ مزدور

(۵) پچاس مقامی مزدور۔

کھدائی کے کام کو آسان بنانے اور مزدوروں کے مفاد کے پیشِ نظر ہم نے قریب میں واقع ابوعلندہ گاؤں کے ایک آدمی کو دکان کھولنے کی اجازت دے دی تا کہ وہ گوشت سبزی وغیرہ ضروری سامان یہاں فروخت کرسکے۔

رفیق الدجانی مرحوم نے کھدائی کے لائحۂ عمل کے بیان کے بعد لکھا ہے کہ پچاسی سینٹی میٹر کی کھدائی پر ہمیں تانبے کے کچھ سکے ملے جو شاہ جسٹینیوس اوّل کے عہد کے ہیں، ان سکوں سے بیزنطی تعمیر کا پتا چلتا ہے۔ بیزنطی عہد کی ٹھیکریاں بھی ملیں، بیزنطی عمارت کے جنوب مشرق میں اسلامی عہد کی دیوار کے پاس کھدائی پر ہمیں الملک الناصر یوسف بن ایوب (صلاح الدین ایوبی) کے عہد کے تانبے کے سکے ملے، جن سے اندازہ ہوا کہ

یہ دیوار ایوبی عہد کی ہے۔ عمارت کی جنوبی جانب ایک اور ٹکڑا ملا، وہ بھی جسٹینیوس اوّل کے عہد کا ہے۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ بیزنطی عمارت اسی بادشاہ کے عہد میں تعمیر ہوئی ہے۔ جنوبی جانب، طول میں کھدائی کرنے پر ایک اسلامی تعمیر ملی جو مسجد کی محراب ہے۔ اس میں بیزنطی تعمیر میں استعمال شدہ بھاری بھرکم پتھروں کے مقابلے میں چھوٹے پتھر استعمال کیے گئے ہیں۔ شروع میں ہمیں شبہ ہوا کہ یہ سیڑھیاں ہیں لیکن تحقیق کرنے سے معلوم ہوا کہ یہ محراب ہے۔ جس کا اضافہ اس وقت کیا گیا ہے جب اسے مسجد میں تبدیل کیا گیا۔

مسجد کی مرمت کا کتبہ

بعد میں جب ہمیں عمارت کے دروازے کے پاس پتھر کا ایک کتبہ ملا جس پر مسجد کی تعمیر کی تاریخ درج ہے تو یہ تحقیق یقین میں بدل گئی۔ یہ کتبہ ٹوٹا ہوا ہے اور قدیم خط کوفی میں تحریر ہے، زبان بھی رکیک ہے۔ پتھر پر موجود تاریخ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ خمارویہ بن احمد بن طولون [متوفی ۸۹۵ء] کے زمانے میں اس مسجد کی تعمیر کی تجدید ہوئی ہے۔ اس وقت سیریا [شام] طولونی حکومت میں شامل ہوچکا تھا۔ کتبہ جس طرح پڑھا گیا، وہ درج ذیل ہے (رفیق ص ۶۵):

بسم الله الرحمن الرحيم

هذا مما أمر به الأمير هبه (هيبه)؟ لتجديد واجهات الكهف ؟ ....

يوسف علاء ..... كهف ...... بن حوه و قد جدد عمارته على

مسجد كهفهم ...... برجيم ....أحمد بن حوه ....

جدد.........سنة ۲۲۷ هـ ....

یہاں کتبے میں درج ۲۲۷ ہجری درست نہیں ہے کیوں کہ مذکورہ بالا طولونی حاکم کی حکومت اس کے والد احمد بن طولون کی وفات پر ۲۷۰ ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ یہ کتابت کی غلطی ہے، کتبے کی تاریخ ۲۷۷ھ ہے جیسا کہ ''قدیم مسجد کی تعمیر کی تاریخ'' میں

بیان کیا گیا ہے۔

رفیق الدجانی مرحوم اپنی رپورٹ (ص ۶۷) میں لکھتے ہیں:

ہم نے اس عمارت کے مشرقی حصے کی صفائی شروع کی تو ہمیں ایک بیزنطی ستون ملا جو دوسرے ملنے والے بیزنطی ستون جیسا تھا۔ پھر ہمیں ایک کنویں کا دہانہ ملا اور کچھ ٹھیکرے ملے جن پر اسلامی عہد کے نقش ونگار بنے ہوئے تھے۔ ٹونٹیاں بھی ملیں جن کی وجہ سے ہمارا یقین بڑھ گیا کہ یہ وضو کے لوٹے رہے ہوں گے۔ کھدائی میں ایک مربع کمرہ بھی ملا جو ۵ء۱×۵ء۱ میٹر کا ہے۔ خیال یہ ہے کہ اس کمرے پر چھت ہوگی جو اذان کے لیے استعمال کی جاتی ہوگی۔

کھدائی کے دوران ایک مسجد کی محراب اور ایک ٹوٹا ہوا کتبہ بھی ملا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ کھدائی کے دوران وسط مسجد میں چار گول ستون ملے جو چٹان سے کاٹی ہوئی بنیادوں پر ٹکے ہوئے ہیں۔ پیمائش کے بعد پتا چلتا ہے کہ بیزنطی عمارت کی پیمائش ۱۰×۱۰ میٹر مربع تھی۔ مسلمانوں نے جب اس کو مسجد میں تبدیل کیا تو اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔

کہف کے اندر کھدائی کا لائحہ عمل

پھر رفیق الدجانی لکھتے (ص ۱۷) ہیں:

ہم نے کہف کے وسطی حصے کو صاف کرنا شروع کیا تو ہمیں میدان کے بیچ میں ایک کچلی دار جانور کا جبڑا ملا جس میں چار داڑھیں ہیں، جس کی حقیقت واضح نہیں ہوسکی ہے۔ اسی طرح ہمیں رومی، اسلامی اور عثمانی عہد کے تانبے کے سکّوں کے ٹکڑے اور مختلف عہدوں کے ٹھیکرے ملے۔ اسی طرح عثمانی عہد کی تانبے کی مہریں، کنگن اور پوتھ وغیرہ کے دانے ملے۔ ہمیں یہاں تابوتوں میں آٹھ انسانی کھوپڑیاں بھی ملیں جو حال ہی کی ہوسکتی ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر بڑے بڑے ڈھانچے اور تانبے کے سکے وغیرہ بھی ملے ہیں۔

مشرقی جانب سے تابوتوں کو ہٹانے کے بعد پتا چلا کہ ان کی تعداد چار ہے، ان میں

سے تین چٹان کاٹ کر بنائے گئے ہیں اور ایک کا بیرونی حصّہ پتھر کا بنا ہے جس پر یونانی زبان میں کچھ عبارت کندہ ہے۔

پتھروں کے ان تابوتوں میں سے ایک پر آٹھ زاویے والا ستارہ بنا ہوا ہے اور اس پر کوفی خط اور قدیم یونانی زبان میں کچھ تحریر ہے۔ دوسرا تابوت دائروں سے مزین ہے، ان تابوتوں کے اندر سے بہت سے انسانی ڈھانچے اور سکّے ملے ہیں۔ اس کہف کی دیواروں پر بہت سی تحریریں کوفی خط اور قدیم یونانی زبان میں موجود ہیں۔

کہف کے میدان میں کھدائی

رفیق الدجانی (ص ۷۵) مزید لکھتے ہیں:

کہف کے بیرونی میدان سے پتھر مٹی اور کوڑا وغیرہ ہٹا دینے کے بعد مختلف چیزوں کے ساتھ ساتھ جسٹینیوس اوّل کے عہد کے سکے ملے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہف کے نقش ونگار اسی عہد کے ہیں۔

زیتون کے ایک پرانے درخت کا تنہ بھی ملا ہے، جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہ رومی دور کا ہے۔ اس درخت کے قریب رومی پتھروں کی محرابوں والا چھت دار گنبد نما کمرہ بھی ہے۔ بعض عمر رسیدہ لوگوں نے بتایا کہ یہ درخت بیس سال قبل موجود تھا، وہ لوگ اس کے پھل کھایا کرتے تھے لیکن ابو علندہ گاؤں کے ایک باشندے نے اس کو کاٹ ڈالا کیوں کہ یہ درخت مشہور ہو گیا تھا اور لوگ اس کو مقدس ومتبرک سمجھنے لگے تھے۔

۱۸۸۱ء میں یورپی عالم کونڈر بھی اس غار پر آیا تھا۔ اس نے مشرقی فلسطین کے مساحت پر اپنی کتاب میں غار کا ذکر کرتے ہوئے مذکورہ درخت کا بھی ذکر کیا ہے۔
(رفیق ص ۷۷، بحوالہ S.E.P. by Conder, p.116)۔

دوسری مسجد کی دریافت

اس کھدائی کے نتیجے میں کہف کے میدان میں (پہلی مسجد کے علاوہ) ایک اور مسجد ملی

ہے جو مستطیل ہے، اس میں محراب ہے اور پتھر کا بنا ہوا تین سیڑھیوں کا ایک منبر بھی ہے۔ مسجد کے اندر اور آس پاس پکی اینٹیں بھی ملی ہیں جو اموی محلوں کی تعمیر میں استعمال کی جاتی تھیں اور آج بھی اردن میں موجود اموی محلوں میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں امویوں نے بھی تعمیری کام کیا ہے۔

یہاں زیتون کا ایک کولھو بھی ملا ہے جو اس مسجد سے پانچ میٹر کی مسافت پر واقع تھا۔ یہ ان بڑے کولھوؤں کے مشابہ ہے جو بڑی تعداد میں اردن کے مغربی حصّے (فلسطین) میں دریافت ہوئے ہیں۔

کھوہ کی دریافت

کھدائی میں ایک اہم چیز وہ کھوہ بھی ہے جو مسجد کے صحن سے کہف کے اندر جاتی ہے۔ اس کھوہ کی لمبائی تقریباً چار میٹر اور چوڑائی ۴۰×۶۰ سنٹی میٹر ہے۔ یہ عمودی شکل میں کہف کے نیچے سے اوپر کی جانب گئی ہے۔ اس کا دہانہ کہف کے اوپر واقع مسجد میں نکلتا ہے، وہ چھوٹا دروازہ ہے جس کا ذکر المقدسی نے یہ کہہ کر کیا ہے کہ کہف کے دو دروازے ہیں ایک چھوٹا اور ایک بڑا۔

ایک ایسا پتھر بھی ملا ہے جس کے بارے میں اندازہ ہے کہ اس سے [ضرورت کے وقت] کھوہ کا دہانہ بند کیا جاتا تھا، اس راستے سے ہوا اندر آتی تھی۔ بہت ممکن ہے کہ یہ راستہ خفیہ طور سے نکلنے کے کام بھی آتا ہو۔ صلاح الدین ایوبی کے فوجی جنرل امیر اسامہ بن منقذ نے بھی اپنی کتاب ''الاعتبار'' میں اس کھوہ کا ذکر کیا ہے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ غار کی یہ کیفیت اس بات کا بھی واضح ثبوت ہے کہ یہ غار، دفن کے کام نہیں آتا تھا بلکہ اس کھوہ کی وجہ سے رہنے کے لیے ایک اچھا مقام تھا۔

کھدائی کے نتائج

محکمۂ آثارِ قدیمہ عمان کی دستاویزوں اور رپورٹوں کے مطالعے سے مندرجہ ذیل نتائج

نکلتے ہیں: (تیسیر ص ۶۴)

(۱) کہف کے اندر چار قبریں مشرقی جانب ہیں اور چار مغربی جانب۔

(۲) (کہف کے اندر) شمالی جانب ایک چھوٹی سی جگہ ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہی وہ فجوہ (کشادہ جگہ یا چبوترا) ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں ذکر آیا ہے۔

(۳) کہف کے اوپر سے ملبہ اور کوڑا کباڑ ہٹانے کے بعد معبد یا کنیسہ ملا ہے جسے مسلمانوں نے مسجد میں تبدیل کر دیا اور خیال کیا جاتا ہے کہ یہ وہی مسجد (معبد) ہے جس کا قرآن مجید میں ذکر ہے۔

(۴) جنوبی جانب ایک اور مسجد ملی ہے جو بیزنطی عہد کے پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔

(۵) ایک کھوہ ملی ہے جو کہف کے نیچے سے اوپر تک گئی ہے اور اس کا دہانہ پہلی مسجد تک جاتا ہے۔

(۶) زیتون کے ایک پرانے درخت کا تنہ ملا ہے جو رومی زمانے کا ہے۔

(۷) کہف کے اوپر سات رومی ستون ملے ہیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ ان ہی پر مسجد قائم تھی۔ یہ اصحابِ کہف کی تعداد کی طرف اشارہ بھی ہو سکتے ہیں۔

(۸) کہف کے ابتدائی حصے میں اور اس کے دروازے کے قریب دو ستون ہیں جن پر نقش و نگار بنے ہوئے ہیں اور ان کا طرز تیسری صدی عیسوی کے رومی عہد کا ہے۔

(۹) چاندی اور تانبے کے رومی بیزنطی، اموی، عباسی اور عثمانی عہد کے سکّے ملے ہیں۔ مختلف زمانوں کے پوتھ کے دانے، مہریں، کنگن اور ہار ملے ہیں جو کہف کے عجائب خانے میں رکھ دیے گئے ہیں۔

(۱۰) ایک کنواں اور وضو کے لیے مٹی کے لوٹوں کے آثار ملے ہیں۔

(۱۱) دونوں مسجدوں میں اذان خانے اور محراب کے نشانات ملے ہیں۔

(۱۲) کھوپڑیاں اور بڑے انسانی ڈھانچے ملے ہیں جن کے دفن کی تاریخ کے

بارے میں محکمۂ آثارِ قدیمہ کوئی تعیین نہیں کر سکا ہے۔

(۱۳) گرد و غبار ہٹانے کے بعد دیواروں پر یونانی اور خط کوفی میں عربی تحریریں ملی ہیں۔

(۱۴) بعض تحریروں سے پتا چلتا ہے کہ خمارویہ بن احمد بن طولون کے زمانے میں دوسری مسجد کی تعمیر نو ہوئی تھی۔ یہ عباسی خلیفہ المعتضد کا دور تھا۔ [تیسیر ص ۶۶ میں یہاں اور نمبر ۱۵ میں سہواً ''الموفق'' کا دور لکھا گیا ہے، الموفق باقاعدہ خلیفہ کبھی نہیں رہے]۔

(۱۵) چٹان میں ''کہف ابن حوا'' خط کوفی میں کندہ کیا ہوا ملا ہے۔ ابنِ حوا کا نام کہف کے اوپر کی مسجد کی تعمیری کتبے میں بھی ملا ہے جس پر ۲۷۰ھ درج ہے یعنی عباسی خلیفہ المعتضد کے زمانے کی تعمیر ہے۔

(۱۶) دروازے کی محراب کی مشرقی دیوار پر یہ عبارت تحریر ہے: (مسجد لله مجدده ۱۱۷ھ) یہ عبارت ہشام بن عبدالملک بن مروان کا عہد بتاتی ہے۔ [مجدده کا لفظ بظاہر کتابت کی غلطی ہے]۔

(۱۷) وسطی محراب پر خط کوفی میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے: (انشأنا.. على المغارة مجدّدا كهفهم، سنة عمارته تسعماية) ہم نے کہف پر ... تعمیر کی، ان کے کہف کی تعمیر نو کرتے ہوئے اس کی تعمیر کا سن ۹۰۰ھ ہے۔ یہ الملک الاشرف قایتبای [متوفی] ۹۰۱ھ [مطابق ۱۴۹۶ء] کا زمانہ ہے۔

(۱۸) وسطی محراب کی دیوار پر مشرقی جانب ۹۱۵ھ تحریر ہے۔ یہ شاہ قانصوہ الغوری [متوفی ۹۲۲ھ مطابق ۱۵۱۶ء] کا زمانہ ہے۔

(۱۹) دیواروں پر متعدد رسم الخط میں "الوحدانیة" تحریر ہے۔

(۲۰) کہف کے اندر پتھر کے ایک تابوت پر ابھرے ہوئے نقش میں آٹھ زاویے والا ستارہ بنا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کا کہنا ہے کہ یہ رومی عہد (تیسری صدی) کا ہے۔ اس کے علاوہ بعض تابوتوں کے بیرونی حصے پر پتیوں کی شکل میں بنے اور نمایاں نقش و نگار بھی ملے ہیں۔ اس طرح کے نقش و نگار کا طریقہ رومی بیزنطی عہد

میں مروج تھا۔

(۲۱) شمالی دیوار پر ایک جانور کی تصویر ہے جو کتے کے مشابہ ہے اور اس کے اردگرد قدیم یونانی میں تحریریں اور اشارات ہیں (رفیق الدجانی کے مطابق) ماہرِ آثار قدیمہ مکسمان نے اس کی جانچ پڑتال کی تھی اور انہوں نے اس بات سے اتفاق کیا تھا کہ یہ کتے کی تصویر ہے اور نقوش و تحریر فنیقی اور قدیم یونانی میں ہیں۔

(۲۲) کھدائی کے نتیجے میں رومی عہد کا زیتون کا ایک کولھو ملا ہے۔

کہف افسوس اور کہف الرقیم کا موازنہ

عیسائی علماء و مؤرخین کا خیال ہے کہ اصحاب کہف کا یہ غار، اناضول کا کہف افسوس ہے۔ اس رائے کو بعض مفسّرین اور مسلم مؤرخین نے بھی اختیار کیا ہے۔ محکمۂ آثار قدیمہ اردن نے ۲۴/۷/۱۹۶۲ء کو باضابطہ طور پر عمان میں ترکی سفارت خانے کو خط لکھا اور اس سے کہف افسوس کے بارے میں تمام معلومات اور تصویریں مہیا کرنے کی درخواست کی (رفیق ص ۱۰۰)۔

ترکی سفارت خانے کے جواب سے تشفی نہیں ہوئی تو رفیق الدجانی نے ذاتی طور پر اپنے دوست چارلس ہورٹون سے جو ترکی جا رہے تھے، درخواست کی کہ وہ شہر افسوس جا کر مطلوبہ معلومات اور تصاویر لے کر آئیں۔ ہورٹون اردن میں اقوامِ متحدہ کے ایک فنی ماہر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے اور خود بھی آثار قدیمہ میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔ انہوں نے سفر کے دو ہفتے بعد ہی وہاں کے غار اور اس کے قریب واقع شہرِ افسوس کے بارے میں معلومات اور تصاویر ارسال کر دیں جن سے یہ باتیں معلوم ہوئیں۔ (رفیق ص ۱۰۳-۱۰۴):

(۱) کہف کے اوپر براہِ راست کوئی عمارت نہیں ہے۔

(۲) غار کے اندر ہزاروں قبریں ہیں جو پکی اینٹوں سے بنی ہوئی ہیں۔

(۳) کہف کا دروازہ شمال مشرق میں ہے

(۴) یہ غار، شہر افسوس سے آدھا یا ایک کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔

(۵) کہف کے اندر کسی قسم کی تحریر یا نقش و نگار نہیں ہیں۔ صرف ایک کتبہ ہے جو جدید یونانی زبان میں تحریر ہے۔

محمد تیسیر ظبیان (ص ۹۷) کے مطابق مختلف معلومات و تحقیقات کے بعد مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

(۱) قرآن مجید میں جس مسجد کا ذکر ہے اس کا افسوس کے غار میں کوئی نام و نشان نہیں ہے، کیوں کہ اس کے اوپر کوئی عمارت ہی نہیں ہے اور نہ ہی اس کے آس پاس اور قرب و جوار میں کوئی دوسری مسجد ہے۔

(۲) افسوس کے غار کی کھدائی میں پختہ اینٹ کے سینکڑوں تابوت ملے ہیں۔ عمان کے قریب غار کی کھدائی میں چٹان میں بنے ہوئے آٹھ تابوت ملے ہیں، جن کے نقش و نگار اور وہاں ملنے والے سکوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ بیزنطی عہد کے ہیں۔

(۳) افسوس کے غار میں کسی قسم کے نقش و نگار اور تحریروں کا کوئی وجود نہیں جن سے پتا چلے کہ یہی اصحاب کہف کا غار ہے جب کہ عمان کے کہف الرقیم کی دیواریں نقش و نگار اور یونانی و کوفی اور ثمودی تحریروں سے بھری ہوئی ہیں۔

(۴) یہ بھی پتا چلا ہے کہ غارِ افسوس کا دروازہ شمال مشرق میں واقع ہے، اس لیے آیت شروق، اس پر منطبق نہیں ہوتی جب کہ کہف الرقیم کا دروازہ جنوب میں واقع ہے اور اس پر قرآنِ کریم کی آیتِ شروق مکمل طور پر منطبق ہوتی ہے۔

(۵) غارِ افسوس میں کوئی فجوہ (کشادہ جگہ یا چبوترہ) نہیں ہے جب کہ کہف الرقیم میں قرآن میں مذکور فجوہ موجود ہے ﴿وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾۔

(۶) افسوس میں سب سے پرانا کلیسا پہلی صدی عیسوی کا ہے جب کہ کہف الرقیم کے معبد (مسجد) جو اصحاب کہف کے جاگنے پر بنایا گیا تھا شاہ تھیوڈیس دوم کے زمانے یعنی پانچویں صدی عیسوی کا ہے۔ یہاں اس بادشاہ کے زمانے کے سکے اور بیزنطی عہد کے ٹھیکرے ملے ہیں۔

الرقیم کی مسجد کی تاریخ اس زمانے کے مطابق ہے جس میں جیمس الساروغی نے اصحابِ کہف کے بارے میں لکھا ہے یعنی ۲۲۷ء میں۔ مسلمانوں کے اس معبد کو مسجد میں بدلنے اور اس کی تعمیر نو کرنے کی وجہ صرف اس جگہ کا مقدس ہونا اور اس جگہ کی دینی اہمیت تھی۔

الرقیم اور البتراء (پیٹرا)

ہندوستانی مصنفین خاص طور پر محققِ کبیر مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کا خیال یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں الرقیم، البتراء (بطرا، پیٹرا) کے لیے استعمال ہوا ہے اور کتابِ مقدس سے رقم یا راقم کا ذکر نکال بھی لائے، لیکن مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے اس کو بڑے محققانہ طریقے سے رد کیا ہے اور بتایا ہے کہ کتابِ یشوع میں رقم یا راقم کا ذکر بنی بن یمین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے اور اس قبیلے کی میراث کا علاقہ، دریائے اردن اور بحرلوط کے مغرب میں واقع تھا جس میں پیٹرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔

اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ لاہور کا مضمون اگرچہ بہت محققانہ نہیں لیکن صاحبِ مقالہ نے ایک اور نکتہ ذکر کیا ہے کہ رقم (Rakam) یا ریقم (Rekem) یسعیاہ ۱۸: ۲۷ کو عربی تورات میں راقم لکھا گیا ہے جو زیادہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ عبرانی میں، اس کا جو املا ہے، اسے رقم پڑھا جا سکتا ہے اور بلیک کی بائبل ڈکشنری کے مطابق یہ رقم جگہ غیر متعین ہے۔

مجلہ الأسبوع العربي میں شائع ہونے والے رفیق الدجانی کے مضمون کے جواب میں بھی ڈاکٹر یوسف شویحات نے مذکورہ ہفت روزے کے ایڈیٹر کو ایک خط لکھا تھا، جس میں اصحابِ کہف کے غار کے البتراء میں ہونے کے مندرجہ ذیل دلائل لکھے تھے:

۱۔ آیت کریمہ ﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ، كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا﴾ البتراء کا بہترین اور بڑا دقیق وصف ہے۔

۲۔ الرقیم جس کا مطلب نقش کیا ہوا اور سجایا ہوا کے ہوتے ہیں اور عربوں کے

یہاں البتراء کا نام الرقیم [بھی] ہے، جو البتراء کی رنگ برنگی بناوٹ پر دلالت کرتا ہے۔

۳۔ اس میں موجود غار، فن و جمال کی بہترین مثالیں ہیں، خاص طور الدیر اور الخزنة نامی دو غار۔

۴۔ رومی، ۶۰۱ عیسوی سے پہلے البتراء میں داخل نہیں ہو سکے، یہاں آنا ان کے لیے اس وقت ممکن ہوا جب سمندری راستہ دریافت ہو جانے پر، یہ علاقہ قافلوں کا راستہ نہیں رہا۔

۵۔ عیسائیوں کی آمد کا سلسلہ رومیوں کے ساتھ شروع ہو گیا ہوگا، جو البتراء کے شمالی جانب رہنے لگے۔ یہ علاقہ اب مغر النصاریٰ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ لوگ چھپ کر یہاں کسی غار میں اپنے مذہبی فرائض انجام دیتے ہوں گے۔ جب کسی بت پرست رومی حکمراں کو اس بات کا علم ہوا تو اس نے ان پر غار کا دروازہ بند کر دیا۔ اس طرح اصحابِ کہف کا قصہ وجود میں آیا۔

اس کے جواب میں رفیق الدجانی نے مندرجہ ذیل حقائق تحریر کیے ہیں:

۱۔ ہمارے پاس ایسی دستاویزات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ٹرجن نے یہ علاقہ ۶۰۱ء میں فتح کیا تو اس وقت پرانے عیسائی البلقاء میں موجود تھے، ہمیں ایسی دستاویزات نہیں ملتیں، جن سے یہ پتا چلے کہ البتراء میں عیسائی رہے ہوں۔ مغر النصاریٰ جو البتراء شہر کے شمال مشرق میں واقع ہے، وہاں عیسائی ترجیحی قول کے مطابق بیزنطیوں کے عہد میں رہتے تھے، رومی عہد میں نہیں۔

۲۔ قرآنِ کریم میں وارد لفظ الرقیم کی لغوی تشریح کی بنیاد پر، اس کا مطلب البتراء سمجھنا درست نہیں، اس لیے عرب جغرافیہ دانوں، مؤرخین اور شعراء نے الرقیم جگہ کے نام کے لیے استعمال کیا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

یزرن علی تنائیه یزیدا بأکناف الموقر و الرقیم

یہاں مذکور الموقر، عمّان کے جنوب مشرق میں واقع ہے، ظاہر ہے الرقیم بھی اس کے قریب ہی ہوگا [جیسا کہ واقعہ ہے]۔

۳۔ البتر اء میں کوئی بھی ایسا غار نہیں ہے جس کی اندرونی دیواروں پر اس قدر نقش و نگار ہوں، جتنے کہ الرجیب [الرقیم] کے کہف کی دیواروں پر ہیں۔

۴۔ البتر اء کے غاروں میں جغرافیائی محلِ وقوع کے اعتبار سے ایسا کوئی غار نہیں ہے جس پر مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ کے اوصاف صادق آتے ہوں، جب کہ الرجیب [الرقیم] کے غار پر یہ اوصاف پوری طرح صادق آتے ہیں: ﴿وَ تَرَى الشَّمْسَ، إِذَا طَلَعَتْ تَّزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ، ذَاتَ الْيَمِيْنِ، وَ إِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ، ذَاتَ الشِّمَالِ، وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾۔

۵۔ کیا البتر اء کے غاروں میں کوئی ایسا غار ہے، جس میں آیت میں مذکور فجوۃ ہو۔ پھر یہ کہ المقدسی یا اسامہ بن منقذ [وغیرہ] نے البتر اء کے کسی غار کا ذکر کیا جیسا کہ الرجیب [الرقیم] کے غار کا ذکر کیا ہے۔

۶۔ کیا قرآن میں مذکور دیگر اوصاف البتر اء کے کسی غار پر منطبق ہوتے ہیں؟، کیا البتر اء کے کسی غار پر الرجیب [الرقیم] کے غار کی طرح مسجد یا کنیسہ کے آثار ملے ہیں؟

۷۔ اصحاب کہف کے غار کا البتر اء میں ہونا، اس لیے بھی سمجھ میں نہیں آتا، کیوں کہ یہ علاقہ شہر کے اندر کا ہے، یہاں کسی کو تلاش کرنا بہت آسان ہے۔

۸۔ البتر اء کے علاقے میں ہمیں عمان کی طرح کنیسے بھی نہیں ملتے ہیں۔

۹۔ رومی عہد میں البتر اء گمنام سا ہو گیا تھا، اس کی شہرت تو انباط کے عہد میں تھی۔ ٹراجن نے بُصریٰ۔عمان۔ایلہ (العقبہ) شاہراہ تعمیر کر دی تھی، جس کی وجہ سے، رومی عہد میں یہ تجارتی راستہ بھی نہیں رہا تھا۔

ان حقائق کی روشنی میں، یہ ممکن نہیں لگتا کہ البتر اء اصحاب کہف کا شہر ہو یا ان کا غار اس میں رہا ہو۔

اختلاف کا خاتمہ

اصحاب کہف کے غار کے انکشاف کے نتیجے میں ظاہر ہونے والے حقائق کی بنیاد پر

اسلامی اور عیسائی روایتوں کا اختلاف ختم ہو جاتا ہے۔ یہ انکشاف اس کھدائی مہم کے بعد ہوا ہے، جس کا اہتمام، محکمۂ آثارِ قدیمہ اُردن نے کیا۔ اس کھدائی کے نتائج سے تمام حقائق ہمارے سامنے اظہر من الشمس ہو جاتے ہیں۔ آثاری تحقیقات کے مطابق وہ نوجوان (اصحاب کہف) جن کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے، دوقیوس یا دوقیانوس کے زمانے میں موجود نہیں تھے بلکہ یہ شاہ ٹراجن کے زمانے میں تھے، جس کا عہد ۹۸ تا ۱۱۷ء ہے جیسا کہ آثارِ قدیمہ کے قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ تاریخی کتب میں اس بات کا بھی ذکر ملتا ہے کہ یہ ظالم بادشاہ خود بت پرست تھا اور دیوتاؤں پر نذرانے چڑھاتا تھا اور جو شخص اس کے دیوتاؤں کی پرستش سے انکار کرتا یہ اسے قتل کروا دیتا تھا، اس نے اس سلسلے میں ایک شاہی فرمان بھی جاری کیا تھا۔ اس کے دورِ حکومت میں عیسائیوں کا تعاقب کیا جاتا تھا اور جو شخص دیوی دیوتاؤں کی پرستش سے انکار کرتا اسے قتل کرا دیا جاتا تھا (دیکھیے Hitti, Phillip K., History of Syria, p 332)۔

پھر یہ لوگ نیک بادشاہ کے زمانے میں ۴۰۸ء اور ۴۵۰ء کے درمیان نیند سے بیدار ہوئے۔ قرائن و دلائل یہ بھی بتاتے ہیں کہ ظالم بادشاہ ٹراجن نے مشرقی اردن کو ۱۰۶ء میں فتح کیا تھا اور عمان میں رومی ایمفی تھیٹر (المدرج الروماني) بنایا تھا جو آج تک موجود ہے اور اس میں بیک وقت ساٹھ ہزار آدمی سما سکتے ہیں۔ اس تھیٹر میں پتھر کے بنے ہوئے دیوتاؤں کے مجسمے اور بت موجود ہیں جن کی اس زمانے میں رومی پرستش کیا کرتے تھے۔ اس عہد کی تعیین کے قرائن میں سب سے واضح قرینہ کہف میں ملنے والے ٹراجن کے عہد کے بیزنطی سکے ہیں۔ ان تمام قرائن و دلائل سے پتا چلتا ہے کہ اصحابِ کہف کے سونے کی مدت قرآن مجید کے مطابق یعنی تین سو شمسی سال اور تین سو نو قمری سال ہے۔ و الله أعلم بالصواب۔

اصحابِ کہف و رقیم کی مسجد

گزشتہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ کھدائی کے دوران دو مسجدوں کا سراغ ملا ہے۔

پہلی مسجد وہ ہے (جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہ وہی مسجد ہے) جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اسے کہف کے اوپر بنایا گیا تھا یہ عیسائی عہد میں گرجا گھر (معبد) تھا۔ عہد اسلامی میں اسے مسجد میں تبدیل کردیا گیا۔ یہاں ہم کھدائی ٹیم کے سربراہ رفیق الدجانی مرحوم کی رپورٹ کے مطابق مسجد کی تعمیر وغیرہ کے سلسلے میں تفصیل تحریر کرتے ہیں۔

پرانی مسجد کی تعمیر کی تاریخ

یہ مسجد کہف کے اوپر عبدالملک بن مروان اور اس کے بیٹے ہشام کے عہد میں ۱۱۷ھ میں بنی ہے۔ مسجد کا رقبہ ۱۰x۱۰ میٹر مربع ہے، اس کی دیواروں کی ضخامت ۹۰ تا ۱۰۰ سینٹی میٹر ہے۔ دروازے کا عرض ایک میٹر ہے، محراب ایک میٹر بیس سینٹی میٹر کی ہے۔ اور اس کی محراب کا نصف قطر (radius) ڈیڑھ میٹر ہے۔ یہ سب بیزنطی گرجا گھر کی عمارت پر تعمیر کیا گیا تھا اور اس کے رقبے میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں کی گئی تھی۔ عمارت کے وسط میں پتھروں کے چار ستون ہیں، خیال ہے کہ ان کا گنبد ٹھہرا ہوا تھا۔ مسجد کا فرش اور دیواریں ریت اور کنکر کے بنے ہوئے ہیں۔ دروازے کے پاس اندرونی حصے میں پتھروں سے بنا کھوہ کا دہانہ ہے جو مسجد سے کہف کے اندر فجوہ (کشادہ جگہ) تک پہنچا ہے۔ یہ وہی فجوہ ہے، جس کا ذکر المقدسی نے اپنی تاریخ [أحسن التقاسيم في معرفة الأقاليم] اور سیاح الہروی نے اپنی کتاب [الإشارات إلى معرفة الزيارات] میں کیا ہے۔ کھوہ کا دہانہ ۶۰x۶۰ سنٹی میٹر اور اس کی لمبائی تقریباً تین میٹر ہے۔ اس کے نیچے کا حصہ کہف کی مشرقی جانب بنی دیوار میں مسجد کے پاس ہے، یہ مسجد بھاری رومی پتھروں سے بنی ہوئی ہے۔

اس معبد کو اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانے میں مسجد میں تبدیل کیا گیا۔ خمارویہ بن احمد بن طولون کے زمانے ۲۷۷ھ مطابق ۸۹۵ء میں اس مسجد کی مرمت اور تعمیر نو ہوئی۔ عباسی خلیفہ [المعتمد ۲۵۶-۲۷۰ھ] کے زمانے میں احمد بن طولون کے عہد کے دوران ۲۶۷ھ میں سیریا [شام] مصر میں ضم ہوگیا تھا۔

کھدائی اور وہاں پائی گئی تحریروں سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ اس جگہ صلاح الدین

ایوبی بھی آئے تھے اور انہوں نے وضوخانے کی دیوار کا اضافہ کیا تھا اور فرش بنوایا تھا۔ ان کا نام کہف کے اندر محراب کے سامنے کے حصے پر لکھا ہوا ملا ہے۔ ایوبیوں کے بعد قانصوہ الغوری نے اس مسجد کی تعمیر نو کی کیوں کہ تعمیر نو کا ایک سن ۹۰۰ھ بھی ملا ہے۔ مسجد کی تعمیر کی تاریخ ۱۷۷ھ دریافت ہوئی ہے۔

الرجیب کے قدیم نام کی بحالی

رابطۂ علوم اسلامیہ کی کوششوں سے شاہی فرمان کے اجراء اور وزارتی کابینہ کی منظوری کے بعد اعلان نمبر ۴۷۸ مؤرخہ ۴؍فروری ۱۹۷۷ء کے ذریعے، اب الرجیب کا قدیم نام الرقیم بحال کردیا گیا ہے۔

کہف کے علاقے کی اہمیت

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اصحابِ کہف کے غار کا علاقہ، اس راستے پر واقع ہے جسے قدیم زمانے میں عیسائی زائرین بیت المقدس جانے کے لیے استعمال کرتے تھے، اس کے بعد یہی راستہ، بیت اللہ شریف کے حاجیوں کا بن گیا۔ حجاز ریلوے لائن بھی، یہاں قریب سے گزرتی ہے۔

عجیب اتفاق یہ ہے کہ اردنی حکومت نے حال ہی میں ایک شاہراہ تعمیر کی ہے جو اردن کو حجاز اور شام سے ملاتی ہے۔ اب یہی شاہراہ، ترکی، شامی، لبنانی اور عراقی زائرین وحجاج کے دیارِ مقدسہ جانے کے لیے بڑی راستہ ہے۔ یہ شاہراہ اس طرح بنائی گئی ہے کہ چاروں طرف سے عمان کا احاطہ کرتی ہے، جسے الحِزَامُ الْاَخضَر کہا جاتا ہے۔ اور یہ شاہراہ اصحابِ کہف کے غار کے قریب سے بھی گزرتی ہے۔

حال میں تعمیر ہونے والی مسجد

رابطۂ علومِ اسلامیہ اردن کا خیال تھا کہ عبدالملک بن مروان کے زمانے کی اس مسجد

کو دوبارہ تعمیر کر دیا جائے لیکن محکمۂ آثار قدیمہ کی رائے یہ ہوئی کہ اس کی آثاری حیثیت کو برقرار رکھا جائے اور دوسری جگہ ایک نئی مسجد بنادی جائے۔

۱۷/۴/۱۹۶۳ء کو رابطے نے محکمۂ پیمائش واراضی کے ڈائرکٹر کو خط لکھ کر یہ اطلاع دی کہ محکمۂ آثار قدیمہ اور رابطے کے درمیان یہ طے ہوگیا ہے کہ اصحاب کہف کے مقام پر پرانی مسجد کے قرب میں ایک نئی مسجد تعمیر کر دی جائے، اور محکمے سے یہ بھی درخواست کی کہ نقشہ منظور کر دیا جائے تاکہ رقبے کی بھی صحیح تعیین ہوجائے۔

رابطے نے نئی مسجد بنانے کے سلسلے میں بہت کوششیں کیں لیکن کوئی پیش قدمی نہ ہونے کی صورت میں رابطے نے مجبوراً ۱۷/۸/۱۹۶۸ء کو اردنی وزیر اعظم کے نام اس سلسلے میں خط لکھا اور ان کو کہف کے انکشاف کے بارے میں بتایا اور مسجد کی تعمیر میں پیش آنے والی مشکلات کا ذکر کیا اور ان سے یہ گزارش کی گئی کہ وہ متعلقہ محکموں خصوصاً وزارتِ اوقاف اور محکمۂ آثار قدیمہ وسیاحت کو حکم دیں کہ وہ اس کہف کی طرف خصوصی توجہ مبذول کریں اور مسجد کی تعمیر اور اصحاب کہف کے غار تک پہونچنے کو آسان بنانے کی کارروائی میں رابطے کے ساتھ تعاون کریں۔

اردنی وزیر اعظم نے سیاحت و آثار قدیمہ کے وزیر اور وزیر اوقاف و مقاماتِ مقدسہ اور گورنر پایۂ تخت عمان کے نام ایک خط نمبر ۲۹/۱۵-۵-۶۰-۸۷ تحریر کیا اور ان سب کو ہدایت دی کہ وہ اس جگہ کی دینی، تاریخی اور سیاحتی اہمیت کے پیشِ نظر جلد از جلد مجوزہ مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں توجہ دیں۔ مزید یہ بھی تحریر کیا کہ اس سلسلے میں کی گئی کارروائی سے انہیں بھی مطلع کیا جائے، اس خط کی ایک نقل رابطے کے صدر کو بھی بھیجی گئی۔

وزیر اعظم کے خط کا یہ نتیجہ ہوا کہ رابطۂ علومِ اسلامیہ کو ۳/۹/۱۹۶۸ء کو وزیر سیاحت و آثارِ قدیمہ کا خط ملا، جس میں انہوں نے اس جگہ مسجد بنانے کی منظوری دی تھی اور مسجد کا نقشہ طلب کیا تھا تاکہ اس کا جائزہ لے کر منظور کیا جاسکے۔

اسی طرح رابطے کو وزارتِ اوقاف کی طرف سے بھی ایک خط موصول ہوا جس میں مسجد کی تعمیر، جلد کرنے پر رضامندی ظاہر کی گئی تھی، اس لیے رابطے نے مناسب سمجھا کہ

تعمیر کا پروگرام وزارتِ اوقاف کی نگرانی میں ہو، چنانچہ اس نے اس سلسلے میں وزارت مذکور کی منظوری حاصل کر لی۔

۱۲/۳/۱۹۶۹ء کو وزارتِ اوقاف، امورِ اسلامیہ اور مقاماتِ مقدسہ نے پایۂ تخت عمان کے گورنر کو ایک خط بھیج کر اطلاع دی کہ مذکورہ وزارت پروگرام کی نگرانی کے لیے تیار ہے اور یہ بھی بتایا کہ چندہ جمع کرنے کے لیے، مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل ایک کمیٹی "مسجد کہف کی تعمیر کمیٹی" کے نام سے بنادی گئی ہے:

(۱) صدر رابطۂ علومِ اسلامیہ تیسیر محمد ظبیان

(۲) حسن عبداللہ النعہ

(۳) خالد حسن الفراح

اس کے بعد کمیٹی نے بڑی ہمت و مستعدی کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا اور چندہ بھی جمع ہونے لگا۔ وزارت اوقاف کے تعاون کے ساتھ مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہوگیا۔

امید تھی کہ ۱۹۷۰ء کے موسمِ گرما میں مسجد کی تکمیل کا جشن منایا جائے گا۔ شاہِ اردن (شاہ حسین بن طلال متوفی ۱۹۹۹ء) نے ۱۲/۶/۱۹۷۰ء بروز جمعہ کو منائے جانے والے افتتاح کے جشن کی سرپرستی بھی منظور کر لی تھی، لیکن ستمبر ۱۹۷۰ء کی خانہ جنگی سے قبل اردن کے اندرونی حالات خراب ہوجانے کی وجہ سے افتتاح کا یہ جشن مقررہ تاریخ میں منعقد نہیں کیا جاسکا۔

کہف کے پاس نئی بستی

اس جگہ کی دینی، روحانی، تاریخی، سیاحتی اور آثاری اہمیت اور اس جگہ کے تقدس اور کہف میں پناہ لینے والے صالح نوجوانوں کی یاد کو تازہ رکھنے کی غرض سے رابطۂ علومِ اسلامیہ نے یہاں آبادکاری کے لیے ایک بڑے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا، اور ضاحیۃ الکہف (کہف کی بستی) کے نام سے ایک آبادی بسانی شروع کر دی۔

رابطے کے ممبران اور محکمۂ اوقاف و آثار قدیمہ کے افسران اعلی نے یہاں زمینیں

خرید نے میں پہل کی۔ اس علاقے کا نقشہ منظور کرالینے کے بعد، اسے وزارتِ داخلہ برائے دیہی وقصباتی امور میں کہف کی بستی (ضاحیة الکھف) کے نام سے بھی منظور کرالیا گیا۔

رابطے کے صدر محمد تیسیر ظبیان نے کہف کے بالکل سامنے مدرسہ دار العلوم الاسلامیہ کی بنیاد بھی رکھی جسے وزارتِ تعلیم نے کو منظوری بھی دے دی ہے۔ الرقیم گاؤں، قریبی دیہاتوں اور دارالحکومت عمان سے طلبہ کے یہاں پڑھنے کے لیے آنے کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے۔ الرقیم پہاڑ پر جس میں کہف واقع ہے گھنے درخت لگا دیے گئے ہیں۔

اصحابِ کہف کے غار کے بارے میں مختلف آراء

اردنی ماہرینِ آثارِ قدیمہ، مؤرّخین اور علماء کی رائے

محمود العابدی، رفیق الدجانی اور احسان النمر کی یہ آراء مجلّہ ''الشریعة'' کے شمارہ نمبر ۱۴ مؤرّخہ ۳۰/۴/۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی ہیں (محمد تیسیر ظبیان ۱۵۱)۔ [محمود العابدی اور رفیق الدجانی کی بعض آراء مشرقِ وسطی خبر ایجنسی کی آمال سیف الدین کی تحقیق میں مذکور ہیں، دیکھیے محمد تیسیر ۱۲۷-۱۲۸]۔

محکمۂ آثارِ قدیمۂ اردن کے معاون ڈائرکٹر محمود العابدی کی رائے

المقدسی نے اپنی کتاب أحسن التقاسیم في معرفة الأقالیم میں تحریر کیا ہے:

الرقیم مشرقی اردن میں ایک بستی کا نام ہے جو شہر عمان کے قریب ہے جہاں ایک غار ہے جس میں کچھ غیر بوسیدہ لاشیں ہیں..اس کے بعد سیّاح الہروی نے المقدسی سے معلومات اخذ کر کے اپنی کتاب الإشارات إلی معرفة الزیارات میں لکھا ہے:

البلقاء عمان نامی شہر کے قریب ایک آبادی ہے جس میں الکھف اور الرقیم ہے۔ اس میں [دیگر] پرانے آثار [بھی] ہیں، لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ دقیانوس بادشاہ کا شہر ہے۔

یاقوت حموی نے اپنی کتاب معجم البلدان میں لکھا ہے:

شام کے اطراف میں البلقاء کے قریب ایک [جگہ] ہے جسے الرقیم کہا جاتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اصحاب کہف یہیں پر ہیں۔

مستشرق کلیر مونت غانو نے جب عمان کے جنوبِ مشرق میں نو کلومیٹر کی مسافت پر ٹھوس چٹان میں بہت خوبصورتی سے بنائے ہوئے اس غار کو دیکھا تو المقدسی کے قول سے اتفاق کیا کہ یہی وہ جگہ [مقام] ہے، جس کا ذکر قرآن مجید کی سورہ کہف میں الکھف والرقیم کے نام سے کیا گیا ہے۔

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کا فیصلہ ہے کہ الرقیم، ایلہ (العقبہ) کے راستے میں ایک بستی کا نام ہے اور کثیر عزّہ نے اپنے درج ذیل شعر میں اسی کا ذکر کیا ہے:

یزرن علی تنائیه یزیدا ‏ بأکناف الموقر والرقیم

الموقر اموی دور کا ایک محل ہے جس کے بہت سے مواضعات نظر آتے ہیں، جن میں زیزیاء، القسطل، سحاب اور الرجیب (الرقیم) ہیں۔ ابوعلندی اور الرجیب کے درمیان دامنِ کوہ میں کچھ حوض، غار اور سرنگیں ہیں، جن میں سے تین کو خوبصورت طور پر کاٹ کر بنایا گیا ہے اور ان میں خوبصورت نقش ونگار بنائے گئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کسی ممتاز طبقے کے افراد کے مقبرے ہیں جو زندگی میں عزت وجاہ، مالداری یا تقویٰ وپرہیزگاری میں ممتاز رہے ہیں۔ اگر یہ جگہ مشہور کہف نہ بھی ہو، تب بھی یقیناً یہ ایسے نوجوانوں کا مقبرہ ضرور ہے جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے اور (ان کے رب نے) ان کے ایمان میں اضافہ فرمایا، جس کے سبب وہ نیک اور مقتدیٰ لوگوں میں ہوگئے۔ اسی وجہ سے یہاں پر مختلف ادوار میں مسجدیں تعمیر کی جاتی رہیں۔ ان میں سے ایک مسجد صلیبی جنگوں تک باقی تھی، جس کا ذکر اسامہ بن منقذ نے اپنی کتاب الاعتبار میں کیا ہے۔

فلسطینی مؤرّخ محمود العابدی کہتے (محمد تیسیر ص ۱۲۷) ہیں:

المقدسی نے اپنی کتاب احسن القاسیم فی معرفة الأقالیم میں ذکر کیا ہے کہ قدیم رومی حاکم دقلد نایوس نے اس علاقے [الرقیم] پر تقریباً ۳۰۱ء (چوتھی صدی عیسوی) میں حکومت کی ہے اور یہ غار [اس زمانے میں] قدیم قبرستان تھا۔

پھر حضرت ابوبکرؓ کے دور یعنی تقریباً ۶۳۳ء میں حضرت عبادہ بن الصامتؓ کو روم کے اس علاقے میں بھیجا گیا تاکہ وہ انہیں [رومیوں کو] دینِ اسلام کی دعوت دیں۔

حضرت عبادہ نے ان سے کہا: یہاں سات سونے والے سو رہے ہیں۔

عباسی خلیفہ منصور کے زمانے میں کچھ لوگ سرکاری مہم پر آئے تھے، انہیں بتایا گیا، اگر تم اس کہف میں دیکھ لو گے تو اندھے ہوجاؤ گے، چنانچہ یہ لوگ، غار میں داخل ہوئے بغیر ہی واپس ہوگئے۔

مشہور مؤرخ و ادیب احسان النمر کی رائے

جنوب عمان میں کچھ کلومیٹر کی دوری پر ایک چوراہا ہے جو ابو علندہ۔ الرجیب اور سحاب گاؤں کی طرف جاتا ہے، اس سے تین کلومیٹر کی دوری پر ابو علندہ اور الرجیب گاؤں کے درمیان ایک چھوٹا سا پہاڑ ہے جس میں ایک غار اور ایک حوض ہے جن کے درمیان ایک راستہ یا پگڈنڈی ہے اور یہ تینوں چٹان کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں۔ یہ ہے وہ الرقیم نامی پہاڑ میں بنا غار۔

میں وہاں گیا تو مجھے ایسے دلائل وقرائن ملے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہی کہف ہے جس میں اپنا ایمان بچانے کے لیے مؤمن نوجوانوں نے پناہ لی تھی۔ ان کا واقعہ قرآن مجید کی سورہ کہف میں موجود ہے۔

ابن کثیر اور البغوی کی تفاسیر اور اپنے مشاہدے کے درمیان موازنے کے بعد میں مندرجہ ذیل نتائج تک پہنچا ہوں:

(۱) الرجیب بدوی لفظ ہے جس کا مطلب الرقیم ہے، اس لیے کہ بدوی لوگ قاف کو جیم میں اور میم کو با میں بدل لیتے ہیں، چنانچہ اس کہف کی قریبی بستی کا نام الرقیم ہے جس کے معنی چھوٹے اور کم اونچے پہاڑ کے ہوتے ہیں۔

(۲) کہف کی صفت کے بارے میں قرآن میں جو آیا ہے: ﴿وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَ إِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِي فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾ کہف بالکل اسی طرح واقع ہے اور اس میں سورج کی روشنی اور اس کی گرمی پورے دن رہتی ہے۔ سورج، اس کہف کے دائیں جانب نکلتا ہے اور بائیں جانب غروب ہوتا ہے، جس کی وجہ سے کہف ہمیشہ خشک رہتا ہے اور رطوبت سے اصحاب کہف کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا۔

آیت کریمہ میں اصحاب کہف کو سورج سے نقصان نہ پہنچنے کی یہ حکمت بیان کی گئی ہے کہ کہف میں ایک فجوہ (کشادہ جگہ) ہے جہاں سورج نہیں پہنچتا ہے۔ کہف بھی اسی

رخ سے بنا ہوا ہے۔ مفسرین نے (اس رخ کے بارے میں) یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ شمالی رخ ہوگا، جیسا کہ حقیقت میں [بھی] ہے۔

مذکورہ بالا دونوں تفسیروں میں ہے کہ ابن عباس اور سعید بن جبیر اور قتادہؒ کہتے ہیں کہ ﴿تَزَاوَرُ﴾ یعنی ہٹ جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جیسے جیسے سورج افق میں اونچا ہوتا ہے اتنی ہی اونچائی سے اس کی شعائیں نیچے آتی ہیں، یہاں تک کہ زوال کے وقت اس طرح کے محلِ وقوع میں ان شعاعوں کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ﴿وَ إِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ یعنی سورج ان کے غار میں مشرقی جانب سے داخل ہوتا ہے۔ اس سے بھی ہماری بات کی صحت کا پتا چلتا ہے۔ جو شخص ہیئت، چاند سورج اور ستاروں کی گردش کا علم رکھتا ہو اس کے لیے یہ امور بالکل واضح ہیں...

(۳) میں نے اس کہف میں دائیں اور بائیں جانب دو کمرے دیکھے جن میں سے ہر ایک میں پتھر کے دو دو تابوت ہیں یعنی کل چار تابوت ہیں، جن میں سے ہر ایک تابوت میں دو دو (کھوپڑیاں) ہیں۔ ایک تابوت کہف کے باہر دروازے سے متصل رکھا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں غالب گمان یہ ہے کہ یہ کتے کا تابوت ہے۔ غالباً انہوں نے کتے کو غار میں رکھنا مناسب نہیں سمجھا۔

(۴) اصلاً یہ کہف ایک عام غار کی طرح بنا ہوا تھا۔ مگر بعد کے لوگوں نے اس میں نقش ونگار بنائے اور اس کی دیواروں کو بھی پختہ کردیا۔ ظاہر ہے کہ جب تین سو سال کے بعد ان لوگوں کا معاملہ ظاہر ہوا تو لوگوں نے اس کہف کی طرف توجہ دی اور اس کی مرمت کی، اس کے دروازے کو نقش ونگار سے مزین کیا اور انہیں ان تابوتوں میں رکھ دیا۔

(۵) انہوں نے اس مبارک مقام پر کہف کے دروازے پر عبادت کے لیے مسجد تعمیر کی، مسجد کے پتھر آج بھی کہف کے دروازے اور اس کے صحن کے اردگرد موجود ہیں۔

ان سب چیزوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ ان مؤمن نوجوانوں ہی کا مقام ہے جنہوں نے ایمان اور صحیح اصول پر ثابت قدم رہتے ہوئے زندگی گزاری۔

تکنیکی معاون رفیق الدجانی کی رائے

ڈائرکٹر آثارِ قدیمہ، اردن کے تکنیکی معاون رفیق الدجانی مرحوم ایک عرصے تک ہمہ تن اس غار کے انکشاف کے کام میں لگے رہے۔ انہوں نے بہت سے حقائق جمع کیے جنہیں وہ اس بات کا ثبوت مانتے ہیں کہ یہ اصحابِ کہف ہی کا غار ہے۔

انہوں نے پوری دنیا کے مشہور غاروں کا محققانہ مطالعہ کیا ہے۔ ان غاروں میں سب سے اہم ترکی میں افسوس، یورپ کے شمال میں اسکینڈینیویا، جس میں سات رومی نعشیں پائی جاتی ہیں اور شام کے جبل قاسیون کے مقدس غار ہیں۔ جبلِ قاسیون کے دامن میں دمشق شہر واقع ہے۔

ان سب کی تحقیق اور موازنے کے بعد رفیق الدجانی نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اردن کا غار ہی ایسا غار ہے جس پر قرآن میں مذکور اکثر اوصاف منطبق ہوتے ہیں۔

قرآن نے الکہف کو الرقیم کے ساتھ ذکر کیا ہے، جو اردنی گاؤں ہے اور کہف کے قریب صرف دو سو میٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ گاؤں الرجیب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بدوؤں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ قاف کو جیم بولتے ہیں، پھر میم کو تحریف کر کے باء میں بدل لیا، اس طرح الرقیم ''الرجیب'' ہوگیا۔ [احسان الحق کی تحقیق یہ ہے کہ بدوی لوگ قاف کو جیم میں اور میم کو با میں بدل لیتے ہیں۔ دیکھیے اوپر مذکور ان کی رائے]۔

پھر [اس] کہف پر [طلوع وغروب سے متعلق] آیتِ کریمہ منطبق ہوتی ہے، چنانچہ سورج غار کی دائیں جانب طلوع ہوتا ہے اور بائیں جانب غروب ہوتا ہے۔ اس میں قرآن میں مذکور فجوہ بھی موجود ہے۔ اس طرح انتاسیوس کے عہد ۹۴۷ء کا کنیسہ بھی موجود ہے، جسے عبدالملک بن مروان کے زمانے میں مسجد بنا دیا گیا۔ اس کے بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے: ﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾۔ رفیق الدجانی مرحوم کی رائے میں یہاں ''مسجد'' سے سجدہ گاہ مراد ہے، خواہ وہ کنیسہ ہی کیوں نہ ہو۔ [یہی تمام علماء ومفسرین کی رائے ہے، رفیق الدجانی کی رائے کوئی نئی بات نہیں]۔

اردن کے مذہبی علما کی آراء

اردن کے علماء کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہے کہ الرقیم (الرجیب) میں دریافت ہونے والا یہ غار وہی ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ ان میں سے بعض کی یہ رائے کھدائی کا کام شروع ہونے سے پہلے ہی سے تھی۔ ان کی اس رائے کی بنیاد وہ اسلامی روایات ہیں جو اصحابِ کہف کا غار اس علاقے میں ہونے کی تائید کرتی ہیں۔

دفتر قاضی القضاۃ کے مشیر اور دار الفقہ والحدیث۔ اردن کے ناظم شیخ محمد عادل الشریف کی رائے

معتبر تفسیروں کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ نوجوان حسب اختلاف روایات سات، آٹھ یا نو تھے۔ یہ اپنے پروردگار پر ایمان لائے اور ان کے پروردگار نے ان کو مزید ہدایت دی۔ ان کا واقعہ عجیب وغریب اور عام فطرت کے خلاف تھا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے ﴿أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ كَانُوْا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا... نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَأَهُمْ بِالْحَقِّ، إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنَاهُمْ هُدًى﴾ سورہ کہف آیات ۹ تا ۱۳۔

ان کے بارے میں جو روایتیں آئی ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ یہ کافر بادشاہ دقیوس کے شہر کے معزز ترین لوگوں کی اولاد تھے۔ اس بادشاہ کو دقیوس بھی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کا دین قبول کیا جو [اس وقت کا] دینِ اسلام تھا۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کے لوگ تھے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت سے پہلے تھے واللہ أعلم۔

.... [حضرت ابن عباس کے بیان کردہ] ان کے قصے سے پتا چلتا ہے کہ ان نوجوانوں کا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کے درمیانی زمانے کا ہے، چوں کہ دونوں نبیوں کے درمیان تقریباً ساڑھے پانچ سو سال کی مدت ہے۔

.....﴿أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيمِ كَانُوْا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا﴾ میں
مذکور الرقیم کے سلسلے میں مختلف اقوال ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرقیم روم کی ایک بستی کا نام
ہے۔ اس میں ایک غار ہے جس میں اکیس آدمی ہیں وہ اصحاب کہف کی ہیئت پر سوتے
ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے وہ کوئی اور ہوں اور ان کے ساتھ بھی اصحاب کہف جیسا
واقعہ پیش آیا ہو۔

دوسرے قول کے مطابق الرقیم فلسطین کے قریب ایک وادی کا نام ہے جو فلسطین
سے تھوڑی دوری پر واقع ہے۔ یہ وہ کہف ہے جس کے قریب ایک گاؤں ہے جو آج
کل الرجیب کہلاتا ہے اور یہی مؤرخ المقدسی کی رائے ہے۔ ہمارے خیال کے مطابق
الرقیم زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ الرجیب میں بدل گیا اور یہ بات دل کو بھی لگتی ہے
کیوں کہ یہاں نوجوانوں کے کتے کے ساتھ وجود کے آثار موجود ہیں۔ کہف میں
[قرآن میں مذکور] فجوہ بھی موجود ہے جو ایک بڑا ثبوت ہے۔ اگرچہ اس کے علاوہ
اور اقوال بھی ہیں.....

[اس کے بعد ڈاکٹر رفیق الدجانی کی کتاب اکتشاف أهل الكهف کا ذکر کیا
ہے]۔

تفسیر اور تاریخ کی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ تاریخی شہر افسوس اناضول میں شہر ازمیر
کے جنوبِ مغرب میں تہتر (۷۳) کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے اور یہ جگہ آج کل ترکی کے
گاؤں ایا صولوگ کے قریب ہے۔ یہ تاریخی شہر تیرہ صدی قبل مسیح پرانا ہے۔ افسوس کا غار
عیسائیوں کا عبادت خانہ تھا اور اس میں کوئی ایسی علامت موجود نہیں ہے جو قرآن مجید میں
مذکور واقعے کے مطابق ہو۔ سورج کے طلوع وغروب ہونے کے وقت، غار سے کترا کر نکل
جانے سے متعلق آیت غار افسوس پر بالکل منطبق نہیں ہوتی، جب کہ یہ آیت مکمل طور پر
الرجیب کے کہف پر منطبق ہوتی ہے اور اس کہف میں دیگر آثار وقرائن بھی ایسے ہیں جو
اس بات کی تائید کرتے ہیں۔ ﴿قَدْ جَاءَكُمْ بَصَائِرُ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ أَبْصَرَ فَلِنَفْسِهِ
وَمَنْ عَمِيَ فَعَلَيْهَا وَمَا أَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيظٍ﴾ (الانعام آیت ۱۰۴): بلاشبہ تمہارے رب

کی طرف سے تمہارے پاس نشانیاں اور دلیلیں آ چکی ہیں، تو جس نے (انہیں آنکھیں
کھول کر) دیکھا، اس نے اپنا بھلا کیا اور جو اندھا بنا رہا، اس نے اپنے حق میں برا کیا اور
میں تمہارا نگہبان نہیں ہوں۔.....

جمعیۃ دار القرآن اردن کے صدر شیخ حازم ابو غزالہ کی رائے

اللہ تعالیٰ نے ہم پر جو انعامات کیے ہیں، ان میں سے ایک [اس] اسلامی اثر
کا اردن میں ظاہر ہونا ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ ایسے نوجوان۔ تھے جنہوں
نے عظیم عقیدۂ توحید (عقیدۂ لا إله إلا الله) کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر کے ایک
اسلامی نمونہ پیش کیا۔ یہ اسلامی اثر عمّان کے قریب اصحابِ کہف کا غار ہے۔ اس کہف کو
دیکھنے والے پر نہ صرف یہ واضح ہو جائے گا کہ اس میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں، جن کا
قرآن مجید میں ذکر ہے بلکہ ان نوجوانوں کے آثار کی زیارت کر کے روحانی سرور محسوس
ہوگا، ایسے نوجوان جو اپنے رب پر ایمان لائے اور اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ فرمایا۔

ان نوجوانوں کا واقعہ تیسری صدی عیسوی کا ہے، اس وقت عمّان بیزنطی دور کے
مرکزی شہروں میں سے ایک تھا اور وہاں ایک بت پرست بادشاہ حکومت کرتا تھا، اس نے
لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ بتوں کی پوجا کریں اور ان کے سامنے سر جھکائیں۔ جن لوگوں نے
ان بتوں کی پوجا سے انکار کر دیا، ان میں سے یہ نوجوان بھی تھے، جنہوں نے حضرت عیسیٰ
علیہ وعلیٰ نبینا الصلوۃ والسلام کی پیروی اور دین حنیف پر قائم رہنے کو ترجیح دی، یہ بات ہمیں
اس آیت سے معلوم ہوتی ہے ﴿هَؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَوْلَا يَأْتُونَ
عَلَيْهِمْ بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ﴾۔

یہ کہف عمّان سے قریب ہے اور بھاگنے والا اس غار تک جلد پہنچ سکتا ہے کیوں کہ
شاہی لشکر نے ان کا پیچھا کیا تھا اور یہ واقعہ بالکل اسی طرح ہے جس طرح کہ نبی کریم ﷺ
نے ہجرت کی رات مکہ مکرمہ کے قریب غار ثور میں پناہ لی تھی۔ عمّان اور کہف کے
درمیان آٹھ کلومیٹر یعنی پانچ میل سے زیادہ کی دوری نہیں ہے۔ اس غار کے اصحابِ کہف

کے غار ہونے کی دلیلیں یہ ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ سورج کہف کے فجوہ (کشادہ جگہ) میں اب تک صبح یا شام کسی وقت داخل نہیں ہو پاتا جب کہ غار کے اطراف میں سورج آتا ہے مگر وہ فجوہ تک نہیں پہنچ پاتا۔ یہ بات بھی قابل ملاحظہ ہے کہ فجوہ میں ٹھنڈک غالب رہتی ہے جو اب تک کہف کے آخر میں موجود ہے۔ اس میں خدا کی یہ حکمت تھی کہ وہ فجوہ ریفریجریٹر کی طرح اجسام کی حفاظت کر سکے اور ان کے جسموں کو کیمیائی عمل کے ذریعے غذا ملتی رہے جیسا کہ کہ ہم ٹھنڈے خون والے (Cold-Blooded) بہت سے جانوروں میں دیکھتے ہیں کہ وہ سردی میں سست ہو جاتے ہیں اور گرمیوں میں چاق و چوبند رہتے ہیں۔ قرآن مجید کی ان آیتوں پر غور کیجیے ﴿وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ إِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ﴾ اور ﴿وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ﴾۔

(۲) کہف کی واحد چوکھٹ (دروازے) کی دونوں جانب کتے کی ایک تصویر بنی ہوئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ تصویر خواہ مخواہ نہیں بنائی گئی ہے بلکہ اس واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کی تصدیق میں یہ آیت ہے: ﴿وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ﴾۔

(۳) آپ جب ان کی قبر میں دیکھیں گے تو اس بارے میں حیرانی ہوگی کہ وہ چھ ہیں یا سات یا آٹھ۔ یہ بھی خدائی نشانی ہے کہ ان کی تعداد کے بارے میں کم ہی لوگ جانتے ہیں ﴿قُل رَّبِّيْ أَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم﴾۔

(۴) یہاں پر کہف کے قریب اب تک الرقیم نامی گاؤں ہے جو بدوؤں کی بول چال کی زبان میں الرجیب کہلاتا ہے۔ [اس میں بھی غالباً] اس اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو ان کی تعداد اور سوئے رہنے کی مدت کے بارے میں ہے ﴿قُلِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾۔

(۵) یہاں آپ وہ عبادت گاہ بھی دیکھیں گے جسے حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام کے پیروکاروں نے بنایا تھا اور جو اب تک موجود ہے۔ اور اب بھی سات ستون

موجود ہیں۔ شاید اس سے ان کی تعداد کی طرف اشارہ ہے۔ ﴿قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰى أَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾۔

(۶) اس بات کے ثبوتوں میں سے کہ یہ وہی کہف ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے یہ بھی ہے کہ ان لوگوں (یعنی اصحاب کہف) کا خلفاء نے بڑا اعزاز و اکرام کیا، صرف لیے کہ ان کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ بعض خلفائے اسلام نے کہف کے سامنے مسجد کی تعمیر کا اہتمام کیا ہے۔

(۷) [اس واقعے پر کافی] زمانہ گزرنے کے بعد بھی مسلمانوں کو اس بات کا یقین رہا ہے کہ عمان کے مضافات میں موجود غار ہی اصحاب کہف کا غار ہے۔ اس کا بہت سے سیرت نگاروں نے ذکر کیا ہے، جیسے المقدسی، یاقوت، الهروی، البیرونی، اور الواقدی وغیرہ، لیکن زمانے کی گردشوں نے اس غار کو ایک مدت تک ہم سے پوشیدہ رکھا یہاں تک کہ چند سال قبل استاذ فاضل الشیخ محمد تیسیر ظبیان کی ہدایت پر محکمۂ آثار قدیمہ اردن نے کھدائی کے بعد یہ عظیم اسلامی اثر برآمد کیا۔

(۸) ایک بڑی دلیل یہ بھی ہے کہ قدیم زمانے سے عیسائی اور مسلمان اس غار کے قریب اپنے مردوں کو دفنانا برکت کا باعث سمجھتے ہیں۔ یہاں آنے والا بہت سی بیزنطی اور اسلامی قبریں دیکھے گا کیوں کہ قدیم زمانے سے لوگوں کی یہ عادت رہی ہے کہ صالحین کے قریب دفن کیے جانے کی وصیت کرتے ہیں۔

محمد السالک الشنقیطی واعظ و مدرس جامع حسینی، عمان، اردن کی رائے:

محمد تیسیر ظبیان نے غار کے انکشاف کے سلسلے میں ایک خط محمد السالک الشنقیطی کو لکھا تھا، جس کا جواب مندرجہ ذیل ہے:

سلام و تحیات اور اکرام کے بعد،

مجھے آپ کا خط حال ہی میں ۷/ ذی الحجہ کو ملا۔ سرِ دست جو معلومات اصحاب کہف کے بارے میں آپ کو دے سکتا ہوں وہ یہ ہیں۔

اصحابِ کہف کے غار کے محلِ وقوع کے بارے میں ابنِ جریر، ابنِ حاتم نے عوفی کی اسناد سے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ وہ ایک وادی میں ہے جو فلسطین سے ادھر ایلہ کے قریب ہے۔ الرقیم کے متعلق حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ یہ اس گاؤں کا نام ہے جس سے اصحاب کہف بھاگے تھے۔ اس طور پر [اصحاب] الکہف و الرقیم ایک ہی جماعت کا نام ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ الرقیم چٹان کا نام ہے یا اس لوح کا جس پر ان کے نام کندہ تھے۔ حضرت ابنِ جبیر سے یہ بھی مروی ہے کہ یہ ان کے کتے کا نام ہے۔ اس سلسلے میں امیہ بن ابی الصلت کے مندرجہ ذیل شعر کو دلیل کے طور پر پیش کرتے ہیں:

وليس بها الرقيم مجاورا   وسيد هم والقوم في كهف هجد

مشہور یہ ہے کہ وہ نصاریٰ تھے۔ ابن عبدالرزاق اور ابن المنذر نے روایت بیان کی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے ایک شخص اصحابِ کہف کے شہر پہنچا اور اس نے اس میں داخل ہونا چاہا، اس سے کہا گیا کہ اس شہر کے دروازے پر ایک بت ہے، کوئی شخص اس وقت داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کے سامنے سجدہ نہ کرے، چنانچہ وہ اس راستے سے داخل ہونے سے باز آیا اور دوسرے راستے سے شہر میں داخل ہوگیا۔ پھر وہاں ایک حمام میں کام کرنے لگا۔ یہی چیز اصحاب کہف کی ہدایت کا سبب بنی۔ یہ قصہ طویل ہے۔ (الآلوسي کی تفسیر سے ماخوذ)

اصحابِ کہف کے بارے میں عجیب بات تو وہ ہے جو ابنِ مردویہ نے حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ اصحابِ کہف مہدی موعود کے معاونین ہوں گے۔ ابنِ عربی صوفی نے اپنی کتاب ''فتوحات'' میں ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ مہدی کے وزراء ہوں گے [ان کے ساتھ جنگ میں شریک ہوں گے] اور مرج بنی عامر میں ایک کے سوا سب شہید ہوجائیں گے۔

ابوالسعود نے اپنی تفسیر [إرشاد العقل السليم إلى مزايا الكتاب الكريم معروف بہ تفسیر ابوالسعود] میں تحریر کیا ہے کہ الرقیم سیسے یا پتھر کی تختی ہے جس پر اصحاب کہف کے نام کندہ کرکے کہف کے دروازے پر لگا دیا گیا تھا۔ اس غار کا محلِ وقوع وادی غضبان اور

ایلہ کے درمیان فلسطین سے ادھر ہے، یہ نوجوان رومی تھے اور انہوں نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا (تفسیرِ قرطبی سے ماخوذ)

[عجیب بات ہے کہ قرطبی [متوفی ۶۷۱ھ] کے حوالے سے ابو السعود [متوفی ۹۸۲ھ] کا قول نقل کیا گیا ہے جب کہ دونوں کی وفات کے درمیان ۳۰۰ سال سے زیادہ کا فرق ہے]۔

حضرت ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ ایک دقیانوس نامی بادشاہ، شہر افسوس یا ترسوس میں تھا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں بتوں کی پوجا کا حکم دیا... جیسا کہ گذشتہ صفحات میں اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔ حضرت عکرمہؒ نے حضرت ابنِ عباسؓ سے روایت بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ میں سارا قرآن جانتا ہوں، سوائے چار الفاظ کے: غسلین، حنانا، الأواه اور الرقیم (یہ بات فخر الدین رازی نے اپنی تفسیر میں بیان کی ہے)۔

غیر ملکی زائرین کا اعتراف

بیت المقدس میں فرانسیسی قونصل مستشرق کلیر مونت گانو نے ۱۸۶۸ء میں، فلسطین اور مشرقی اردن کے دوسرے آثاری مقامات کے ساتھ اس جگہ کا بھی معائنہ کیا اور ماہر جغرافیہ المقدسی کی رائے کی تائید کی کہ یہ وہی کہف ہے جس کا ذکر عیسائی روایات اور قرآن کریم میں آیا ہے۔ یہ مستشرق اپنے زمانے کے ماہرینِ آثارِ قدیمہ میں سے تھا۔

۱۸۸۰ء میں لندن کے فلسطینی ادارے (Palestine Exploration Fund) نے اپنے دو نمائندے اردن بھیجے، تاکہ وہ اس غار کے علاقے کی جانچ کرسکیں۔ ان دونوں نمائندوں نے اصحاب کہف کے محلِ وقوع کا بھی جائزہ لیا، ان میں سے ایک نے کتاب (Survey of the Eastern Palestine) میں اس جگہ کا تفصیلی وصف بیان کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں کہف کے بارے میں ہے:

غارِ (کہف) عیسائی عہد کے اوائل کا ایک مقبرہ ہے۔ عمان سے آنے والے رومی

راستے سے اس تک پہنچا جاتا ہے اور الرجیب (الرقیم) گاؤں اس کے مشرق میں ہے۔

اس کتاب کے مؤلف نے ایک مربع برج کا بھی ذکر کیا ہے جو کہف کے اوپر بنایا گیا تھا، جس کے بارے میں بعض کا خیال ہے کہ یہ وہی مسجد ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اسی طرح اس کتاب کے مؤلف نے ایک دوسری مسجد کا بھی ذکر کیا ہے جو کہف کے دروازے کے سامنے ہے جسے محکمۂ آثارِ قدیمہ اردن نے ملبہ ہٹانے کے بعد دریافت کرلیا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کہف کے میدان میں زیتون کے دو درخت اور ایک بن (بطم) کا درخت ہے۔ یہ ان درختوں میں سے ہیں جو کہف کے سامنے کی نشیبی زمین کو پر کرتے ہیں۔

اس جگہ کی زیارت کرنے والوں میں محقق ایزیل فیسٹر بھی ہیں۔ انہوں عثمان کے قریب اس کہف کا معائنہ کیا اور اس بارے میں، ان کا ایک تفصیلی مضمون انگریزی میں شائع ہوا۔ انہوں نے اس مضمون میں اپنے مشاہدات اور اس جگہ کے بارے میں مسلم رواۃ کے اقوال اور آثاری قرائن سے استشہاد کرتے ہوئے اپنے نظریات بیان کیے ہیں، ساتھ ہی بیزنطی عہد کے نقوش و آثار اور مسلمانوں کی طرف سے ان میں کی جانے والی تبدیلیوں اور ان کے زمانے کی نگارشات، خاص طور پر دو مسجدوں کی تعمیر کا ذکر کیا ہے۔

اس جگہ کے مشاہدے کے بعد اس نے یوں تبصرہ کیا ہے:

کہف کی قبروں اور اس سے متصل حصوں کی کھدائی سے پتا چلتا ہے کہ سائنٹفک رائے اہل کہف کے بارے میں قرآن مجید کے بیان کردہ وصف کے شانہ بشانہ چلتی ہے۔

ماہرِ آثارِ قدیمہ رفیق الدجانی مرحوم کے مطابق (محمد تیسیر ص ۵۱) ڈاکٹر ہوج نبلی استاد، دینیات و علم آثار، برگھام ینگ یونیورسٹی، ریاستہائے متحدہ امریکہ نے الرجیب میں ہونے والی کھدائی پر مطلع ہونے کے بعد اصحابِ کہف کے محلِ وقوع کے بارے میں ایک تحقیقی مضمون شائع کیا ہے، جس میں پورے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ یہی وہ کہف ہے جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے نزدیک مقدس ہے۔ کہف افسوس وہ کہف نہیں ہے۔ ان کا

خیال ہے کہ اصحاب کہف پہلی صدی عیسوی کے آخر یا دوسری صدی عیسوی کے شروع میں تھے وہ اپنا دین بچا کر بھاگے اور البلقاء میں پناہ گزین ہوگئے جہاں وہ حکمراں طبقے سے چھپ کر عبادت کیا کرتے تھے۔ ۱۱۲ء میں شاہ ٹراجن نے ایک فرمان جاری کیا، جس میں بتوں کو نذرانے نہ چڑھانے والے ہر عیسائی کے مواخذے کا حکم تھا۔

مصر میں انکشاف کا شہرہ

کھدائی کا ابتدائی کام جب مکمل ہوگیا اور اس جگہ کے بارے میں ضروری معلومات حاصل ہوگئیں تو مصری علماء اور اصحابِ فکر کی رائے معلوم کرنے کی غرض سے محمد تیسیر ظبیان نے نومبر۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں مصر کا دورہ کیا۔

مصر پہنچ کر انہوں نے اس وقت کے جامع ازہر کے شیخ ڈاکٹر الفحام سے ملاقات کی اور انہیں اس موضوع اور کھدائی وغیرہ کے سلسلے میں مکمل معلومات فراہم کیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے وعدہ کیا کہ محمد تیسیر ظبیان کی تیار کردہ رپورٹ کو مجمع البحوث الإسلامیہ (اسلامک ریسرچ اکادمی) کے پہلے اجلاس میں پیش کر کے اپنی رائے سے مطلع کریں گے۔ ساتھ ہی انہوں نے محمد تیسیر ظبیان سے کہا کہ وہ اس موضوع پر لکچر دیں تا کہ ازہر کے علماء اور ماہرینِ آثار، اس انکشاف سے واقف ہوسکیں، چنانچہ جمعية الشباب المسلمين (انجمن نوجوانانِ اسلام) کے صدر دفتر میں یہ لکچر ہونا طے پایا۔ محمد تیسیر ظبیان کے اس لکچر میں متعدد دانشوروں، مختلف جامعات کے مذہبی علماء، آثارِ قدیمہ کے ماہرین اور طلباء شریک ہوئے، لیکن انہیں مجمع البحوث الإسلامية کی طرف سے کبھی کوئی جواب نہ مل سکا۔

اس کے بعد العشیرۃ المحمّدیة (جماعتِ محمدی) نامی تنظیم کی طرف سے منعقد ایک شام مذاکرہ میں بھی اس موضوع پر محمد تیسیر ظبیان کی تقریر ہوئی جس کے بارے میں مذکورہ تنظیم کے ترجمان رسالے المسلم نے تعریفی کلمات شائع کیے اور لکھا کہ بعض بڑے بڑے علماء اور محدثین نے اس انکشاف کو قرآن مجید اور نبی کریم ﷺ کے سچ ہونے پر

عظیم معجزہ قرار دیا ہے۔

محمد تیسیر ظبیان (ص ۱۱۹) کہتے ہیں کہ اس مجلس مذاکرہ میں شریک ہونے والوں میں ڈائرکٹر نشریاتِ قرآن، ریڈیو مصر ڈاکٹر کامل البوہی بھی تھے جنہوں نے میری اس تقریر کو بہت پسند کیا اور اگلے روز مجھے اپنے دفتر میں بلایا، وہاں بھی ایک مختصر سی مجلس رہی جس میں بعض حضرات سے تعارف ہوا اور شعبہ نشریات قرآن کے مفید پروگراموں وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں۔

اس ملاقات کے دوران ڈاکٹر البوہی نے انکشاف کہف کے بارے میں مختلف سولات کیے اور انکشاف کے مراحل اور نتائج کے بارے میں مزید معلومات چاہیں۔ میرے جوابات ٹیپ کیے گئے اور فوراً ہی خبروں کے پروگرام میں نشر کر دیے گئے جس کے نتیجے میں عربی روزنامے الأھرام کے ایک سب ایڈیٹر مصطفیٰ الطرابیشی، ڈاکٹر کامل البوہی سے ملے اور مجھ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا، چنانچہ ان سے ہماری ملاقات ہوئی اور تفصیلی گفتگوئی۔

پھر ایک عرصے بعد، محمد تیسر ظبیان موریتانیا سے واپس ہوتے ہوئے قاہرہ سے گزرے۔ اس وقت مصطفیٰ الطرابیشی نے ان سے پھر بات چیت کی اور اس گفتگو کا خلاصہ الأھرام کے ''دینی فکر'' کے مخصوص صفحے پر ۴؍جون ۱۹۷٦ء کو شاہ سرخیوں میں شائع کیا۔

پھر ۳۰؍جون ۱۹۷٦ء کو الأھرام نے اس انکشاف کے بارے میں تصویروں کے ساتھ مختلف بیانات شائع کیے اور اس سلسلے میں وہ دلائل وقرائن بھی تحریر کیے جو اسلامی روایات میں آتے ہیں اور قرآن میں اوصاف پر منطبق ہوتے ہیں۔ ایک ماہر زمین شناس انجینئر کے بارے میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس غار کے مقام پر پہنچ کر وہاں موجود کیمیادی مواد کا معائنہ کیا، جس سے انہیں اندازہ ہوا کہ وہاں پر موجود کیمیائی مواد کا اصحاب کہف کے اجسام کو اتنی مدت تک محفوظ رکھنے میں بڑا اثر تھا۔ دراصل اجسام کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ ایک خدائی تدبیر تھی۔

مخالف آراء اور جواب

الاہرام نے اس سلسلے میں قاہرہ یونیورسٹی کی آثار قدیمہ کی فیکلٹی کی ڈین ڈاکٹر سعاد ماہر سے بھی رابطہ کیا تو انہوں نے کہا:

اصحابِ کہف کا زمانہ جاننے کے لیے غار کی مٹی کا ارضیاتی تجزیہ (geological analysis) بہت ضروری ہے، اس طرح کم از کم ایک کھوپڑی کا سائنسی تجزیہ بھی لازمی ہے، اگر یہ سہولت عمان میں موجود نہیں ہے تو ہم اس مقصد سے اپنے یہاں سے کسی کو بھیج سکتے ہیں۔

ڈاکٹر سعاد مزید کہتی ہیں:

کہف اور عبادت گاہ کے ستونوں کی جو تصویریں میرے سامنے ہیں انہیں دیکھتے ہوئے میں قطعی طور پر کہہ سکتی ہوں کہ یہ تصویریں بیزنطی عہد کی ہیں اور اس زمانے میں عیسائی مذہب مستحکم ہو چکا تھا اور سرکاری مذہب بن گیا تھا جب کہ اصحابِ کہف رومی عہد میں ہوئے ہیں اور رومیوں کے ظلم وستم کے خوف سے انہوں نے غار میں پناہ لی تھی۔ اس بنا پر یہ بات مشکوک ہو جاتی ہے کہ اردن میں ملنے والا غار، اصحاب کہف کا غار ہے۔ پھر بھی یہ ممکن ہے کہ یہ عبادت گاہ بیزنطی عہد میں دوبارہ بنائی گئی ہو، اس لیے علمی، آثاری اور تاریخی تحقیقات ہی اس غار کی حقیقت کو واضح کر سکتی ہیں۔

محمد تیسیر ظبیان جواب میں کہتے ہیں:

ڈاکٹر سعاد نے جو کچھ کہا ہے یہ ان کے حق میں نہیں بلکہ خود، ان کے خلاف دلیل ہے۔ ہم ان کی یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ یہ ستون اور نقش ونگار بیزنطی عہد کے ہیں، رومی یا بت پرستی کے زمانے کے نہیں۔

یہیں ان سے چوک ہوگئی ہے کیوں کہ یہ سب کچھ واقعی اصحابِ کہف کے بیدار ہونے کے بعد بیزنطی عہد ہی میں بنایا گیا ہے، جس سے ہمارے نظریے کی تائید ہوتی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ نیک بندوں کے اکرام میں یہ سب کچھ ایسے زمانے میں تعمیر کیا جائے

جس زمانے میں مسلمانوں اور مؤمنین کو حق ناحق دوڑایا جا رہا ہو اور بت پرستی کی خلاف ورزی کرنے والوں کو قتل و تشدّد کا شکار بنایا جا رہا ہو، جس کی وجہ سے ان کو بھاگنا پڑا تھا۔

عملی مطالعے کی ضرورت

ڈاکٹر فوزی الفخرانی صدر شعبۂ مطالعات علوم قدیمہ جامعۂ اسکندریہ کہتے ہیں کہ کہف کے اندر ملنے والی کھوپڑیوں کے بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ یہ رومی عہد کی ہیں اور اس کی دلیل وہاں ملنے والے پرانے نقش و نگار ہیں، لیکن یہ بھی ہوسکتا کہ یہ کھوپڑیاں ان لوگوں کی ہوں جو عیسائیوں پر مظالم کے رومی دور میں شہید ہو گئے ہوں، جس کی وجہ سے یہ مقبرہ عیسائی عہد میں مقدس بن گیا ہو کیوں کہ یہ ان شہداء کا مقبرہ ہے جنہوں نے رومی مظالم کے عہد میں عیسائی مذہب قبول کیا ہو اور ان کی تقدیس بڑھانے کے لے ان کے قریب میں ایک کنیسہ بنا دیا ہو۔

اس کے بعد شروع اسلامی عہد میں اس مقدس مقام پر کہف کے سامنے مسجد بنادی گئی ہو، اس مسجد کے قدیم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی محراب کا رخ بیت المقدس کی طرف ہے، کعبے کی طرف نہیں۔ اس طور پر یہ خطہ، مسلمانوں اور عیسائیوں دونوں کے لیے مقدس بن گیا۔ ڈاکٹر الفخرانی مزید لکھتے ہیں:

میں پھر یہی کہوں گا کہ ان کھوپڑیوں کی قدامت معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کا تجزیہ کیا جائے۔ رہا حیوانی جبڑے کا سوال، تو یہاں کوئی ایسا قرینہ نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ یہ اصحاب کہف کے کتے ہی کا جبڑا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ کسی بھیڑ بکری کا جبڑا ہو جو یہاں اکثر آتے رہتے ہیں کیوں کہ یہ ایک اچھی چراگاہ ہے۔

اس کا جواب اردن میں آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے رابطۂ علوم اسلامیہ کے صدر محمد تیسیر ظبیان (ص ۱۲۹۔۱۳۰) نے اس طور پر دیا ہے:

میں نے اس موضوع کے سلسلے میں بعض یہودی کتابوں (اسفار) اور نصرانی قسیسوں سے استفادہ کیا ہے۔ ان ہی لوگوں نے ان [اصحاب کہف کے] واقعات کی

تشریح و توضیح میں مدد کی ہے، جن کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے۔

میں نے حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے پہلے کے واقعات کی تفتیش کی یہاں تک کہ میں دمشق میں سریانی فرقے کے پٹریارک کے پاس پہنچا۔ سریانی فرقے کے لوگ اس قدیم زمانے میں موجود تھے۔ میں نے پٹریارک سے پوچھا کہ ان کی کتابوں میں کہف کے بارے میں کیا آیا ہے؟۔ انہوں نے مجھے سریانی زبان کے وہ پرانے اشعار بھی سنائے جن میں اصحاب کہف کا قصہ بیان کیا گیا تھا۔ یہ بھی قرآن مجید کے اعجاز پر دلیل ہے کہ اس نے ان کے بارے میں صحیح صحیح معلومات دی ہیں۔

یہودی علماء (احبار) حضرت محمد ﷺ کی بعثت سے قبل، ان معلومات کو قصے کے طور پر سنایا کرتے تھے۔ علمی، آثاری اور تاریخی طور پر اس بات کی تائید ہوتی ہے [کہ یہ اصحاب کہف ہی کا غار ہے]۔

مصر کے مذہبی علماء اور دانشوروں کی رائے

قاہرہ کے روزنامے الأہرام نے اس موضوع سے بڑی دلچسپی لی اور اس کے نامہ نگار مصطفی الطرابیشی نے علماء اور اصحاب فکر و نظر کی رائے جمع کرنا شروع کی، چنانچہ ۱۱ جون ۱۹۷۶ء کے شمارے میں انہوں نے اس موضوع پر بعض تحقیقات شائع کیں، اس کے علاوہ مصر کے مختلف علماء وزارت اوقاف میں مساجد کے ڈائرکٹر شیخ عبدالرحمٰن النجار، اسلامی دعوت و تمدن کے مدرس ڈاکٹر مصلح بیومی اور جامعہ ازہر میں عربی زبان کی فیکلٹی میں استاد ڈاکٹر ابراہیم الخولی وغیرہ کی آراء بھی شائع کیں، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ قرآن مجید کی صداقت کا ایک ابدی معجزہ ہے اور یہ کہ قرآن مجید اللہ کی ہمیشہ رہنے والی کتاب ہے۔ جس کے قریب یا آس پاس تک باطل کا کوئی گزر نہیں۔ اس انکشاف سے مختلف زمانے کی نسلوں کو فائدہ پہنچے گا۔

ہم امید کرتے ہیں کہ ان جگہوں کے بارے میں جہاں مختلف واقعات رونما ہوئے ہیں، مزید انکشافات اور تحقیقات کی جائیں گی۔ یہ تمام واقعات عرب علاقوں ہی میں رونما

ہوئے ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ کے اس کے قول پر ہمارا یقین اور بڑھ جائے۔ ﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَ فِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ﴾ سورہ حم السجدۃ (فصلت) آیت ۵۳: عنقریب ہم انہیں اپنی نشانیاں اطرافِ عالم میں بھی دکھائیں گے اور خود ان کی اپنی ذات میں بھی یہاں تک کہ ان پر کھل جائے کہ حق یہی ہے۔

اس کے علاوہ جغرافیائی، تاریخی اور تفسیری قرائن سے بھی اس غار کا اصحابِ کہف کا غار ہونا ثابت ہوتا ہے۔

مذہبی علماء کی رائے

کہف کے بارے میں [مصری] علماء کی رائے جن کی نمائندگی استاد عربی فیکلٹی، جامعہ ازہر ڈاکٹر ابراہیم الخولی کرتے ہیں، یہ ہے:

قرآن مجید عموماً اشخاص اور ان کی تعداد وغیرہ سے متعلق غیر ضروری تفصیلات بیان کرنے کی پابندی نہیں کرتا، کیوں کہ اس بات کا قرآن کے اصل جوہر اور اس کے منشا سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ قرآن مجید کچھ ایسے قرائن کی طرف اشارہ کر سکتا ہے جن کے ذریعے باریک بین حضرات بہت سے حقائق معلوم کر سکتے ہیں، گویا اس سے قرآن مجید کا مقصد اپنی عبارتوں کو ایسے مخفی خزانے بنا دینا ہے جنہیں وہ اپنی صداقت وحقانیت کے ثبوت کے طور پر مختلف زمانوں میں ظاہر کرتا رہتا ہے۔

یہی بات اصحابِ کہف کے قصے پر صادق آتی ہے، جس میں [اصحابِ کہف کے غار کی] صحیح تعیین کرنے اور اس [واقعے کی حقانیت] کی تصدیق کے لیے دلائل وقرائن موجود ہیں، مثلاً جغرافیائی قرینے اور سورج کی حرکت سے اس [غار] کا تعلق۔ [مندرجہ ذیل آیت میں انہی قرائن کی طرف اشارہ ہے]: ﴿وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَزَاوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَ إِذَا غَرَبَتْ تَقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَ هُمْ فِي فَجْوَةٍ مِنْهُ﴾۔

اسی طرح یہاں پر تاریخی ومعاشرتی قرینہ بھی موجود ہے کہ یہ واقعہ سرکشی، بت پرستی اور دینی مظالم کے زمانے میں پیش آیا۔ نیز عدد کے بارے میں بھی کئی قول ذکر کیے، جن

میں ترجیحی قول ﴿وَ يَقُولُونَ سَبْعَةٌ وَ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ کو قرار دیا، چنانچہ یہ بہت مشکل ہے کہ کوئی اور ایسا غار ہو جس میں سات انسانی کھوپڑیاں ہوں اور ساتھ ہی ایک کتے کی کھوپڑی بھی ہو اور اس پر قرآن میں بیان کی گئی تمام صفات بھی صادق آتی ہوں۔ ایسا کہف صرف الرجیب گاؤں کا ہی ہے جس کے دریافت ہونے کا حال ہی میں اعلان کیا گیا۔ دس سال کی تھکا دینے والی کھدائی اور کوششوں کے نتیجے میں یہ غار برآمد ہوا ہے، لیکن پھر بھی آخری فیصلہ ماہرینِ تحقیق وتجزیہ ہی کر سکتے ہیں۔

ایران کے شیعہ علماء کی آراء

روزنامہ اطلاعات تہران نے صرف تفاصیل شائع کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اہم مذہبی علماء اور ایران کے شیعہ عالموں سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کیا اور ان کی آراء سے استفادہ کیا۔

اخبار نے ان آراء کی تمہید میں لکھا ہے کہ اردن میں اصحابِ کہف کے غار کا دریافت ہونا ایک عظیم قرآنی معجزہ ہے۔ آجکل یہ مسئلہ ایران اور دیگر ممالک اسلامیہ میں بحث و مباحثے کا موضوع بنا ہوا ہے۔ اس بات کا انتظار ہے کہ علمائے آثار قدیمہ اور اس میدان کے ماہرین کیا نئی معلومات پیش کرتے ہیں۔ ایرانی علماء اور مفکرین کی آراء درج ذیل ہیں:

آیت اللہ الشیخ بہاء الدین نوری (جو تہران کے بڑے شیعہ علماء میں سے ہیں) کہتے ہیں:

”اس جگہ کے انکشاف کے بارے میں جو معلومات ہمیں پہنچی ہیں اگر وہ درست ہیں تو یہ چیز تمام عالم کے مسلمانوں کے لیے باعث فخر ہے۔ اور یہ انکشاف دینی اور علمی نظریات کے یکساں ہونے پر بڑی معتبر دلیل ہے۔

آیت اللہ السید علی اصغر جزائری (یہ بھی ایران کے شیعہ علماء میں سے ہیں) کہتے ہیں:

”کہف کے محلِ وقوع کا انکشاف قیامت کی ان نشانیوں میں سے ہے جو آخری

زمانے میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ انکشاف شیعوں کے اس نظریہ کے مطابق ہے کہ اصحاب کہف امام زماں مہدی علیہ السلام کے اصحاب ہوں گے اور ان کے مکّہ میں ظہور کے وقت یہ لوگ ان کی خدمت میں ہوں گے۔

تہران کے مشہور ومعروف واعظ کمال سنبر واری کہتے ہیں:

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اصحاب کہف کے قصّے کو سمجھنے کے لیے پوری طرح متوجہ ہو جائیں اور ان نوجوانوں کے بارے میں نبی کریم ﷺ کی زبان سے جو رموز واشارات وارد ہوئے ہیں ان کی تشریح کریں۔ اس واقعے میں کچھ باتیں تو ظاہری ہیں اور کچھ باطنی۔

اس انکشاف کے بارے میں ان کے علاوہ ایران کے ممتاز علماء میں سے امام مردوخ اور موسیٰ ذاکری نے بھی لب کشائی فرمائی ہے۔

ایرانی عالم طباطبائی کی تائید

جن علماء نے اصحاب کہف کے غار کے اس جگہ [عمّان میں] ہونے کی تائید کی ہے ان میں موجودہ مفسّرین میں سے علامہ طباطبائی ہیں جو ایران کے بڑے علماء میں سے ہیں اور تفسیر المیز ان کے مؤلف ہیں۔

انہیں جب کہف الرقیم کے انکشاف کی اطلاع ہوئی اور کھدائی کے نتائج کا علم ہوا تو انہوں نے اصحابِ کہف کے واقعے کے سلسلے میں ایک طویل مقالہ تحریر کیا، جس میں انہوں نے اس موضوع سے متعلق اقوال وروایات کے اختلاف کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے افسوس میں اس غار کے ہونے کی روایات کی قطعی نفی کرتے ہوئے لکھا ہے:

کہف الرجیب (الرقیم) اردن کے پایۂ تخت عمّان سے آٹھ کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔ یہ غار الرجیب نامی گاؤں کے قریب ہے اور یہ ایک پہاڑ پر چٹان میں بنا ہوا ہے جو جنوبی دامن کوہ میں ہے۔ مشرقی اور مغربی جانب سے کھلا ہوا ہے۔ جس سے اس پر سورج کی شعائیں پڑتی ہیں۔ کہف کا دروازہ جنوبی جانب ہے۔

کہف کے اندر ایک چھوٹا سا چبوترہ [فجوہ] ہے جو تقریباً تین میٹر لمبا اور ڈھائی

میٹر چوڑا ہے اور غار کی چھت کی جانب اوپر بنا ہوا ہے۔ یہ غار تین میٹر لمبا اور تین میٹر چوڑا ہے۔ غار میں کئی قبریں ہیں جو بیزنطی تابوتوں کے طرز پر ہیں جن کی تعداد سات یا آٹھ معلوم ہوتی ہے، دیواروں پر ثمودی اور قدیم یونانی نقوش اور تحریریں ہیں جو مٹ رہی ہیں، پڑھی نہیں جاتیں۔ ایک کتے کی تصویر ہے جو سرخ رنگ کی ہے اور کچھ دوسرے نقش ونگار بھی ہیں۔ غار کے اوپر بیزنطی کنیسے (مسجد) کے آثار ہیں اور وہاں ملنے والے سکّوں اور دیگر تاریخی چیزوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ [عبادت خانہ] شاہ جوستینوس [دور حکومت: ۴۱۸۔۴۲۷ء] کے زمانے کا ہے۔

دیگر آثار سے پتا چلتا ہے کہ یہ کنیسہ مسلمانوں کے عہد میں مسجد میں تبدیل کر دیا گیا اور اس میں محراب، اذان خانہ اور وضو خانہ بھی شامل کر دیے گئے۔ کہف کے سامنے کے میدان میں ایک دوسری مسجد کے بھی آثار ہیں جسے مسلمانوں نے شروع دور میں تعمیر کیا تھا اور پھر یکے بعد دیگرے اس کی تعمیر نو ہوتی رہی۔ یہ بھی بیزنطی کنیسے کی بنیادوں پر بنائی گئی ہے، جس طرح کہ کہف کے اوپر مسجد بنائی گئی ہے۔

لوگوں کی توجہ کے باوجود جیسا کہ آثار سے ظاہر ہے اس کہف کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ جگہ ویرانے اور کھنڈرات میں تبدیل ہوگئی، یہاں تک کہ حال ہی میں محکمۂ آثار قدیمہ اردن نے کھدائی کی طرف توجہ دی اور یہ کام ۱۹۶۳ء مطابق ۱۳۸۱ھ میں شروع ہوا۔

صاحب تفسیر المیز ان مزید لکھتے ہیں:

ماہرِ آثار قدیمہ رفیق الدجانی نے ان آثار کا ذکر کیا ہے جن کا انکشاف ہوا ہے اور جن سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہ اصحابِ کہف کا وہی غار ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں وارد ہوا ہے۔ بہت سے قرائن اور آثاری ثبوت اس بات کی تائید کرتے ہیں۔ ان دلائل وقرائن کو بیان کرنے کے بعد علامہ طباطبائی نے اپنی بات اس طرح ختم کی ہے:

''سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں مذکور کہف کی علامتیں واضح طور پر الرقیم کے کہف پر صادق آتی ہیں کسی اور غار پر نہیں۔''

علمائے ہندوپاک کی آراء

محمد تیسیر ظبیان (ص ۵۵) تحریر فرماتے ہیں:

جب میں ۱۹۶۷ء اور ۱۹۷۶ء میں پاکستان گیا تو میں نے وہاں کے بڑے بڑے علماء سے ملاقات کی اور انکشاف کے بارے میں ان سے گفتگو کی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ حضرات ہم سے متفق ہیں اور اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ یہ غار یہیں واقع ہے جہاں دریافت ہوا ہے۔

میں نے جن لوگوں سے ملاقاتیں کیں ان میں مولانا کوثر نیازی وزیرِ اوقاف و اطلاعات بھی تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ مولانا ابوالکلام آزاد جو مسلم رہنماؤں میں سے تھے اور آزاد حکومتِ ہند کے پہلے وزیرِ تعلیم تھے، وہ بھی اپنی تفسیر میں اسی رائے سے متفق ہیں۔ یہ تفسیر انہوں نے اردو میں [ترجمان القرآن کے نام سے] لکھی ہے اور اس کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ مجھے مفتیِ پاکستان مولانا محمد شفیع دیوبندی نے کراچی میں بتایا کہ میرا خیال ہے کہ عمان کے قریب دریافت ہونے والے غار کے علاوہ دنیا کے کسی حصے میں کوئی ایسا غار موجود نہیں ہے جس پر وہ اوصاف منطبق ہوتے ہوں جن کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ انہوں نے حال ہی میں لکھی جانے والی اپنی تفسیر میں اس کی تائید کی ہے۔ مولانا مرحوم کا اس کتاب [تفسیر] لکھنے کے دوران انتقال ہو گیا۔

مولانا مودودی مرحوم کی رائے

محمد تیسیر ظبیان (ص ۵۲) مولانا مودودیؒ کی زیارتِ عمان کے بارے میں لکھتے:

جنوری ۱۹۶۰ء کی بات ہے کہ پاکستانی عالم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی عرب ممالک میں اسلامی مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے سلسلے میں عمان پہنچے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے مجھ سے ملاقات کی اور مجھ سے کہا کہ مجھے اس غار تک پہنچا دو جس کا حال ہی میں انکشاف ہوا ہے۔ میں انہیں وہاں لے کر گیا۔

اس کہف اور صحابۂ کرام کے مزارات اور اردن میں واقع اسلامی زیارت گاہوں کی زیارت کے بعد مولانا حجاز اور جزیرۂ عرب کے دیگر ممالک کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے۔

پاکستان واپس ہونے پر انہوں نے اس تاریخی سفر کی روداد سفرنامۂ ارض القرآن کے نام سے اردو میں تحریر کی جس میں جغرافیائی نقشے اور تصویریں ہیں۔ مولانا نے اس کتاب میں اصحابِ کہف کے غار کے بارے میں ایک مستقل فصل لکھی ہے۔ مولانا مرحوم نے اس غار کو کھدائی سے قبل دیکھا تھا۔ اس میں تحریر ہے:

اگلے روز، ۱۰ر جنوری ۱۹۶۰ء کو ہم نے صبح وہ غار بھی دیکھا، جس کے متعلق مقامی روایات یہ ہیں کہ اصحابِ کہف کا واقعہ یہیں پیش آیا تھا۔ یہ غار عمان کے جنوب مشرق میں تقریباً ۱۲ر کلومیٹر (۷ر میل) کے فاصلے پر واقع ہے اور اس کے قریب کی بستی [؟] کا نام رقیب [؟] ہے، جس کا تلفظ اہلِ اردن اپنی عامی زبان میں الرجیب کرتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ لفظ دراصل الرقیم، اصحاب الکہف والرقیم سے بگڑا ہوا ہے۔ اس غار کے اندر اتنی تاریکی ہے کہ ہم نے اس کے اندر جھانکا تو کوئی چیز نظر نہیں آئی۔ اس کے اوپر اور اس سے متصل جگہوں پر قدیم زمانے کی سنگین عمارتوں کے آثار موجود ہیں اور اس کا دروازہ بھی جنوب مشرقی سمت میں اس طرح سے ہے کہ سورج طلوع ہو تو ﴿تَزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ﴾۔

گویا کہ قرآن پاک نے اصحاب کہف کے غار کی جو صفات بیان کی ہیں، وہ اس غار پر صادق آتی ہیں، لیکن مقامی روایت کے سوا کوئی چیز کتبہ وغیرہ کی شکل میں وہاں موجود نہیں ہیں [؟] اور نہ ہی اردن کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے اس کا کوئی پروپیگنڈا کیا ہے، اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے ہیں کہ واقعی یہ اصحاب کہف کا غار ہے کہ نہیں؟۔

مذکورہ بالا عبارت مولانا مودودی کے سفرنامۂ ارض القرآن ص ۳۰۳۔۳۰۴ سے لی گئی ہے، جو محمد عاصم کا مرتب کیا ہوا ہے۔ اس میں محمد تیسیر ظبیان کی عبارت میں مذکور جغرافیائی نقشوں اور تصویروں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ محمد تیسیر کے یہاں سفرنامے کی

عبارت کا جو عربی ترجمہ دیا گیا ہے، خاص طور پر اس کی آخری سطریں، سفرنامے کی اردو عبارت سے زیادہ واضح ہیں۔ اسی طرح اس میں رقیب نام نہیں دیا گیا ہے بلکہ صحیح الرقیم دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اسے بدوی لوگ الرجیب کہتے ہیں، عبارت ملاحظہ ہو:

في ١٠ ينا ير سنة ١٩٦٠ زرنا هذا الغار (كهف الرقيم) و يعتقد السكان المجاورون لهذا الموقع أن أصحاب الكهف الذين ورد ذكرهم في القرآن موجودون في هذا الغار الذي يبعد نحو سبعة أميال عن عمّان، و على مقربة منه توجد قرية صغيرة اسمها الرقيم، و يطلق عليها البدو اسم الرجيب، و هي محرّفة من اسمها القديم "الرقيم" و لدى دخولنا الكهف لم نتمكّن من رؤية أي شيء في داخله لأنّ الظلام كان مخيّما عليه، على الرغم من سطوع الشمس، و قد لاحظنا أنه توجد فوق هذا الغار و في أمكنة قريبة منه آثار أبنية حجرية منحوتة في الصخر، يرجع تاريخها إلى زمن قديم، كما لاحظنا أن الشمس تزاور عن الكهف عند بزوغها و تميل عنه لدى غروبها (محمّد تيسير ظبيان ص ٥٢)۔

اخبارات، مجلات، ریڈیو اور نیوز ایجنسیوں میں انکشاف کی گونج

غار کے انکشاف کے بارے میں لکھنے والا پہلا رسالہ

دمشق سے نکلنے والا عربی رسالہ ''الشرطة والأمن العام'' پہلا رسالہ ہے جس نے عمّان کے قریب موجود اصحاب کہف کے غار کی دریافت کے بارے میں لکھا۔ اس رسالے نے ۱۵؍دسمبر ۱۹۵۳ء کے شمارے میں ایک مضمون شائع کیا، جس میں اس کے محلِ وقوع اور ان قرائن سے بحث کی گئی تھی، جن سے پتا چلتا ہے کہ یہ وہی کہف ہے، جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اس مضمون میں بعض مفسّرین کے اقوال، مسلم مؤرخین و جغرافیہ دانوں اور اس جگہ کی زیارت کرنے والے بعض مستشرقین کی رائیں نقل کی گئی تھیں۔

۳؍جون ۱۹۶۴ء کو عرب نیوز ایجنسی اور مقامی اخباروں نے انکشاف کی خبر اور

کھدائی کے سلسلے میں محکمۂ آثار قدیمہ اردن کی دلچسپی کی خبریں شائع کیں، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ اس جگہ کی کھدائی کی جلدی کی وجہ رابطۂ علوم اسلامیہ اردن کا اصرار تھا۔

۵؍جولائی ۱۹۶۴ء کو ڈاکٹر عونی الدجانی کا بیان نشر ہوا کہ کھدائی کے نتیجے میں بہت سے اہم آثار کا انکشاف ہوا ہے۔ ان کے تکنیکی معاون، رفیق الدجانی کی زبانی یہ بیان بھی نشر ہوا کہ کھدائی کے نتیجے میں دو مسجدیں بھی دریافت ہوئی ہیں، جن میں سے ایک غار کے اوپر ہے اور دوسری اس کے جنوب میں۔ زیتون کے ایک قدیم درخت کا تنہ اور اس کی جڑیں بھی برآمد ہوئی ہیں جس کے بارے میں غار کے قریبی گاؤں ابوعلندہ کے عمر رسیدہ لوگوں نے بتایا کہ ۵۲ سال قبل وہ اس درخت کا پھل کھاتے تھے ... اس گاؤں کے ایک شخص حاجی فلاح الحنیطی نے اس درخت کو کاٹ ڈالا تھا کیوں کہ لوگ اسے مقدس جاننے لگے تھے اور اس کا استعمال تبرک کا کیا کرتے تھے، انہیں خطرہ ہوا کہ کہیں اس کی پوجا نہ ہونے لگے۔ اس بارے مرحوم رفیق الدجانی کے دیگر بیانات بھی نشر اور شائع ہوئے۔

عمّان کے رسالے الجہاد نے ۲۵؍جولائی ۱۹۷۳ء کے شمارے میں کھدائی کے بارے میں بعض معلومات شائع کیں اور تحریر کیا کہ دو مسجدوں، بعض یونانی سکّوں اور پتھر کی تختیاں اور زیتون کے درخت کی جڑوں کا پتا چلا ہے جن میں سے بعض چیزیں طبعی عجائب خانے میں بھیجی گئی ہیں تا کہ ان کی تاریخ معلوم کی جا سکے۔ رسالے نے مزید لکھا ہے کہ اردن میں بعض سفراء پر مشتمل انجمن دوستانِ آثار قدیمہ نے اس بارے میں ایک کتابچہ بھی شائع کیا ہے کہ جس کے پہلے صفحے پر کہف کی تصویر دی گئی ہے۔

اسی زمانے میں بیروت سے باتصویر شائع ہونے والے رسالے "الأسبوع العربي" نے اس عظیم انکشاف کے بارے میں بڑا جامع تحقیقی مقالہ شائع کیا۔ رسالے کی طرف سے بھیجے گئے نمائندے عبدالحفیظ محمد نے محلِ وقوع کی تحقیق کے بعد اپنی تحقیقات کا خلاصہ "أهل الكهف كانوا هنا" (اصحابِ کہف یہاں تھے) کے عنوان سے چار صفحات میں شائع کیا۔ اس رسالے نے پہلے صفحے پر غار کی وہ تصویر چھاپی تھی جو کھدائی کا کام شروع ہونے سے قبل ڈائرکٹر محکمۂ آثارِ قدیمہ اور ان کے دونوں معاونین اور رابطۂ علوم اسلامیہ

کے صدر نے کھینچی تھی۔

اس کے علاوہ اردن کے دیگر جرائد الدستور، الرأي، الشعب، اللواء اور أخبار الأسبوع میں بھی اس موضوع پر مختلف تحقیقات شائع ہوئیں۔

کویتی رسالے "العربي" کا مضمون:

کویت سے شائع ہونے والے مشہور و معروف مجلّہ العربی نے ذیقعدہ ۱۳۹۶ھ مطابق نومبر ۱۹۷۶ء ڈاکٹر عبداللہ العمرانی کی بہت عمدہ تحقیق "النيام السبعة وأصحاب الكهف" کے عنوان سے شائع کی ہے، جس میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی تحقیق اور تفصیل کے ساتھ اس سلسلے میں مغربی مضمون نگار حضرات کی کہف سے متعلق تحریروں کا جائزہ لیا ہے اور ان لوگوں کے ان توہمات اور باطل خیالات کا رڈ کیا ہے، جن کے ذریعے انہوں نے حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر عبداللہ نے سات سونے والوں کے قصے اور اصحابِ کہف کے قصے کی تفصیلات کا جو قرآن مجید میں وارد ہوئی ہیں جائزہ لیا ہے اور کہا ہے کہ اصحابِ کہف اور ان سات سونے والوں کے درمیان کوئی مطابقت نہیں باوجودیکہ اسرئیلیات نے دونوں واقعات کے درمیان ربط ثابت کرنے میں پورا زور صرف کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اصحابِ کہف کے واقعے اور سات سونے والوں کی خرافیاتی داستان کے درمیان تعداد، زمانے اور مقام کے اعتبار سے فرق کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ قرآن مجید میں اصحابِ کہف کے سونے کی مدّت کی تعیین کی گئی ہے جو عیسوی اعتبار سے تین سو سال ہے جس میں قمری اعتبار سے نو سال کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ یہ تعیین بہت ہی باریک بینی اور مکمل تحقیق پر مبنی ہے بلکہ یہ بھی نبی امّی ﷺ کا معجزہ ہے جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور بہت کچھ وہ باتیں جانتے تھے جن سے آج بھی، تعلیم یافتہ طبقہ تک ناواقف ہے۔ ان میں سے کتنے لوگ جانتے ہیں گے کہ شمسی سال میں ۳۶۵٫۲۴۲۳ دن ہوتے ہیں اور قمری سال میں ۳۵۴٫۳۶۷۱ دن ہوتے ہیں، اور یہ کہ تین سو سال میں یہ فرق نو سال ہو جاتا ہے، کسور کا کوئی اعتبار نہیں، کیا یہی دلیل کافی نہیں ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے: ﴿وَ لَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ سورۃ النساء آیت ۸۲:۔ اگر [یہ قرآن] اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بڑا اختلاف پاتے۔

ڈاکٹر العمرانی، الرقیم اور اس کے معانی کے متعلق لکھنے کے بعد کہتے ہیں:

حال ہی میں محکمۂ آثارِ قدیمہ اردن نے بعض ماہرین کے تعاون سے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ اصحابِ کہف کے غار کا محلِّ وقوع دریافت ہو گیا ہے جو الرقیم گاؤں میں ہے، جس کو وہاں کے باشندوں نے الرجیب میں بدل لیا ہے۔ یہ عمّان شہر کے جنوب میں سات کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔

آخر میں ڈاکٹر العمرانی نے اپنی تحقیق پر گفتگو اس طرح ختم کی ہے:

محقق ان تمام امور کے ہوتے ہوئے یہی کہہ سکتا ہے کہ وہ ملکِ اردن میں اپنے بھائیوں کی اس کوشش پر بھلائی کی بشارت قبول کرے اور ان کی طرف سے اصحابِ کہف کے محلِ وقوع کے انکشاف کا خیر مقدم کرے۔ عقل اور تاریخی منطق کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ یہ جگہ تمدنوں کے گہوارے، نبوتوں کے مقامِ آسمانی، مذاہب کے سرچشمے مشرق وسطی میں ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عرصۂ دراز کی بحث و تحقیق کے بعد یہ حقیقت واضح ہوئی ہے۔ ہمیشہ یاد رکھیں کہ حکمت مؤمن کی ایسی گمشدہ دولت ہے وہ ہمیشہ جس کی تلاش کرتا رہتا ہے اور جہاں اس کو پاتا ہے فوراً اٹھا لیتا ہے۔

رسالہ الوعي الإسلامي کا تحقیقی مضمون

کویت سے شائع ہونے والے رسالے الوعي الإسلامي نے اپنے یکم ذیقعدہ ۱۳۹۷ ہجری مطابق اکتوبر ۱۹۷۷ء کے شمارے میں ایک مقالہ الكشف عن أصحاب الكهف والدراسات التاريخية في الإسلام کے عنوان سے شائع کیا ہے جسے ڈاکٹر حسن فتح الباب نے لکھا ہے۔ وہ مقالے کے شروع میں لکھتے ہیں:

حال ہی میں عربی اخباروں میں کہف کے انکشاف کی خبر چھپی ہے جس میں ان نوجوانوں کی ہڈیاں ہیں جنہوں نے رومی بادشاہ دوقیانوس کے ظلم سے بھاگ کر اس میں

پناہ لی تھی۔ ان کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:
﴿إِنَّهُمْ فِتْيَةٌ آمَنُوا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنَاهُمْ هُدًى﴾۔

مذکورہ [انکشاف کا] اعلان اردنی عالم اور رابطۂ علوم اسلامیہ عمان کے صدر محمد تیسیر ظبیان کی طرف سے کیا گیا ہے، جس میں انہوں نے کہا ہے:

تاریخی اور آثاری تحقیق جو اردن کے اندر اور باہر دس سال سے زیادہ مدت تک جاری رہی اس کے نتیجے میں کہف کے محلِ وقوع کا الرقیم گاؤں میں انکشاف ہوا ہے، جو اردن کے پایۂ تخت عمان کے جنوب میں سات کلو میٹر کی دوری پر واقع ہے۔ اس کے نام میں تحریف ہوگئی ہے اور اسے آج کل الرجیب کہا جاتا ہے۔ کہف کے اندر سات انسانی کھوپڑیاں اور ایک کتے کی کھوپڑی ملی ہے اور قرآن مجید میں موجود دلائل اور قرینے اس پر منطبق ہوجاتے ہیں....

مضمون نگار مزید لکھتے ہیں:

اگرچہ عرب اور مسلمان علمائے آثار قدیمہ، ماہرین زمین شناسی اور ازہر کے علماء نے ابھی تک اس انکشاف کے صحیح ہونے کے بارے میں کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے جس سے عالمِ اسلام کے لیے یہ بات یقینی ہوسکے کہ [عمان میں واقع] یہ کہف واقعی وہی مقام ہے جہاں ان سات نوجوانوں نے بت پرستی کے ظلم سے اپنے ذہن کو بچا کر پناہ لی تھی۔ اس انکشاف بارے میں محمد تیسیر ظبیان کی علمی تحقیق اور اس سلسلے میں ان کا اسلوبِ عمل تعریف کے قابل اور گراں قدر ہے کیوں کہ اس سے علمائے سلف کی کوششوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

اس کے بعد مضمون نگار نے اس موضوع پر مزید بحث کی ہے اور کھدائی کے نتائج کا بیان کیا ہے اور اس کے انکشاف کے بارے میں معاصر علماء کی آراء کا ذکر کرتے ہوئے آخر میں یہ خلاصہ کیا ہے کہ اگرچہ بعض مؤرخین افسوس کے غار کو اصحاب کہف کا غار بتاتے ہیں لیکن اس کے اوصاف اور قرآن مجید میں مذکور کہف الرقیم کے اوصاف میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ پھر مضمون نگار کہتے ہیں:

اگرچہ محققین نے اس موضوع کے سلسلے میں کوئی آخری رائے قائم نہیں کی ہے لیکن اس سلسلے میں ہونے والی علمی اور تاریخی کوششوں سے دستیاب ہونے والے تمدنی اور عقائدی دلائل بہت ہیں جو اس بات کی واضح ثبوت ہیں کہ اسلام میں اصلاً تحقیق کی روح پائی جاتی ہے۔

اس لیے تمام ذرائع سے علم حاصل کرنے کوشش کی جائے تاکہ مسلمان بہتر سے بہتر دین معلومات اور نتائج حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے اس پر صادق آئے: ﴿وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ سورۂ طٰہٰ ۱۱۴:۔ اور یہ دعا کیا کیجیے کہ [اے] میرے پروردگار مجھے اور علم دیجیے۔

اس کے نتیجے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان عالمی سطح پر علمی اور ثقافتی تعاون ضروری ہے نیز کتاب اللہ اور اس کی تفسیر کو سمجھنے کے لیے بھی سائنسی طریقوں کا استعمال ہونا چاہیے۔ اسلام کے پیغام کو تمام عالم میں پھیلانے کے لیے بھی علمی طریقوں کا استعمال بہت ضروری ہے۔ یہ طریقہ اس سماج کو مستحکم کرنے کے لیے بھی ضروری ہے جس کو محمد رسول اللہ ﷺ نے مدینے میں قائم فرمایا تھا۔ اس پر حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی دلالت کرتا ہے کہ "تفقهوا قبل أن تسودوا" سردار اور بڑا بننے سے پہلے ہی علم و دانش حاصل کرلو (کیوں کہ بعد میں موقع نہیں ملے گا)۔

مشرق وسطیٰ خبر رساں ایجنسی کی تحقیقات

۴ مئی ۱۹۷۷ء کو عربی کے اخباروں نے مشرق وسطیٰ خبر رساں ایجنسی کے آمال سیف الدین کی تحقیقات شائع کیں اور بعض اصحاب فکر و نظر اور علماء کی رائیں بھی تحریر کیں جن کی اہمیت کے پیشِ نظر ہم یہاں ان کا ذکر کر رہے ہیں۔

حکومت اردن نے فروری میں یہ اعلان کیا کہ اردن کے گاؤں الرجیب کا نام بدل کر الرقیم قرار دے دیا گیا ہے کیوں کہ یہ اصحابِ کہف کے غار کا محلِ وقوع ہے۔

اس اعلان سے علمی اور دینی مباحث کا سلسلہ چھڑ گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ وہی غار

ہے جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اگر اس بات کے ثبوت میں کچھ دلائل ہیں تب بھی یہ بات ضرور ہے کہ اس موضوع پر دینی اور علمی لحاظ سے مطالعہ کیا جائے اور یہ کام ماہرینِ آثارِ قدیمہ، زمین شناس اور بڑے علماء انجام دیں۔

قصے کی ابتداء

یہ قصہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب عمان کے جنوبِ مشرق میں تقریباً آٹھ کلو میٹر دوری پر واقع آثارِ قدیمہ کی کھدائی کی مختلف کوششوں کا سلسلہ شروع ہوا جہاں آسمان و صحراء اور حال ہی میں بنی ہوئی سڑک کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، اس سڑک پر تارکول بچھا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ چمکتی ہے۔ یہ راستہ اردن اور سعودیہ کو باہم ملاتا ہے۔ اس پہاڑی علاقے میں یہاں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں تھوڑے سے بدوی لوگ رہتے ہیں اور یہ الرجیب کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہاں پر مختلف چھوٹے چھوٹے غار اور پرانی چٹانیں ہیں جو پرانی تاریخ بتاتی ہیں۔ اس علاقے کے وسط میں یہ غار دریافت ہوا ہے جو علماء اور محققین کا موضوع بحث بنا ہوا ہے۔

کہف کی دائیں جانب پرانی چٹانوں سے بنائی گئی کچھ دیواریں ہیں جن کی اونچائی ایک میٹر کے قریب ہے۔ ان میں ایک کنیسہ کے آثار قدیمہ ہیں، جسے مسجد میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کے قریب زیتون کے ایک درخت کے باقیات ہیں جو زمانے کی نذر ہو گیا ہے، کہف کی بائیں جانب قدامت میں اپنی مثال آپ چند ستون ہیں جن پر نباتاتی نقش ونگار تراش کر بنائے گئے ہیں۔

چٹانوں میں بنی ہوئی تین سیڑھیوں سے اترنے پر آپ کو سات پرانی کھوپڑیاں اور ایک حیوانی جبڑا ملے گا۔ اسی طرح آپ کہف کے بالائی حصے میں فجوہ (کشادہ جگہ) بھی دیکھیں گے، جس سے روشنی اور ہوا اندر آتی ہے۔ اس کی وجہ سے یہ مقبرہ نہیں رہا ہے بلکہ رہنے کی جگہ بن گیا ہے۔ کہف کی چوٹی پر بھی بیزنطی کنیسہ کے آثار ہیں اس کو بھی مسجد میں تبدیل کیا گیا ہے۔

اردن میں آثارِ قدیمہ کے بعض افسران نے اس وقت کے وزیرِ سیاحت کی سرکردگی میں بعض اسلامی ملکوں کے سفراء کے ساتھ مل کر اس بارے میں پوری تحقیقات کی ہیں، خاص طور پر جب انہیں معلوم ہوا کہ یہاں ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو سات کھوپڑیاں اور ایک کتے کا جبڑا ملا ہے۔

اصحابِ کہف کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے، یونانی اور لاطینی روایتوں میں ان کی تعداد سات بتائی گئی ہے، سریانی روایتوں میں ان کی تعداد آٹھ ہے اور یعقوبی عیسائی تین بتاتے ہیں جب کہ قرآن کہتا ہے ﴿قُل رَّبِّيٓ أَعۡلَمُ بِعِدَّتِهِم﴾ اے محمد! آپ کہہ دیجیے کہ میرا پروردگار ہی ان کی تعداد سے خوب واقف ہے۔

اس کے بعد آمال سیف الدین نے محمود العابدی، رفیق الدجانی، فوزی الفخرانی اور ابراہیم الخوری کی آراء کا ذکر کیا ہے جو اردن اور مصر کے علماء کی آراء میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

انکشاف کی بازگشت ایران میں

محمد تیسیر تحریر فرماتے ہیں (ص ۱۴۱):

روزنامہ اطلاعات، تہران نے جس طرح اس موضوع پر توجہ دی وہ قابل ستائش ہے، کیوں کہ ہمارے خیال میں بھی نہیں تھا کہ ایرانی اخبارات اور علمی حلقے اس موضوع سے اتنی دلچسپی لیں گے، جس طرح کہ ہم توجہ دے رہے ہیں۔ عمان میں ایرانی سفارت خانے نے ہم کو تہران کے اخبار ”اطلاعات“ کے کچھ شمارے دیے یہ اخبار عموماً بڑے سائز کے ساٹھ صفحوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ادارۂ اطلاعات کی طرف سے فارسی زبان میں شائع ہوتا ہے۔ یہ اخبار روزانہ دس لاکھ سے زیادہ چھپتا ہے۔ یہ ادارہ عربی میں بھی ایک ماہنامہ الإخاء کے نام سے نکالتا ہے۔ اس ادارے سے دوسری زبانوں کے مجلات بھی شائع ہوتے ہیں۔

اخبار مذکور نے رجب ۱۳۹۶ھ میں اپنے صفحۂ اوّل پر شاہ سرخی میں اصحابِ کہف

کے محلِ وقوع کے انکشاف کی خبر کچھ تصویروں کے ساتھ شائع کی۔ ہمارا خیال ہے کہ انہوں نے یہ معلومات روزنامہ الأھرام قاہرہ سے نقل کی ہوں گی اور اس میں اس واقعے سے متعلق دیگر تفصیلات کتبِ تفسیر و تاریخ سے نقل کی ہیں۔ ہم نے اس روزنامے کے موقف کا احترام کرتے ہوئے اور اس وجہ سے کہ ایرانی عوام مزید تفصیلات سے آگاہ ہوں اخبارِ مذکور کے مدیرِ اعلیٰ کو شکریہ کا خط لکھا اور اس کے ساتھ مکمل تفصیلات اور مختلف تصاویر بھیج دیں جو اخبار نے شعبان ۱۳۹۶ھ میں صفحہ اوّل پر نمایاں طور پر شاہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیں۔ اسی طرح الإخاء نے ہماری بھیجی ہوئی تمام تفصیلات مع تصاویر کے عربی میں شائع کیں۔ [مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ایران کے شیعہ علماء کی آراء]۔

ضمیمے

ضمیمہ (۱)

علمائے ہند و پاک کے اصحابِ کہف پر مضامین

ترجمان القرآن از ابوالکلام احمد (مولانا آزاد)، جلد چہارم ۳۵۰ اور ۴۰۵ تا ۴۳۰

صفحہ ۳۵۰

۹- آیت (۹) سے اصحابِ کہف کی سرگزشت شروع ہوئی۔ اس کی تشریح سورت کے آخری نوٹ میں ملے گی۔

فرمایا، یہ چند نوجوان تھے جنہوں نے اللہ کی رحمت پر بھروسہ کیا تھا اور ایک پہاڑ کے غار میں جا چھپے تھے۔ کئی برسوں تک یہ اس میں پوشیدہ رہے، آبادی سے ان کا کوئی علاقہ [یعنی تعلق] نہیں رہا۔ زندگی کی کوئی صدا، ان کے کانوں تک نہیں پہنچتی تھی، پھر وہ اٹھائے گئے، یعنی ظاہر ہوئے اور یہ سارا معاملہ اس لیے ہوا کہ واضح ہو جائے، دونوں جماعتوں میں سے کون سی ایسی جماعت تھی جو وقت کے واقعات اور ان کے نتائج کا بہتر اندازہ کر سکتی تھی۔ دو جماعتوں سے مقصود اصحابِ کہف اور ان کی قوم و ملک کے لوگ ہیں۔ یہ گویا اس تمام معاملے کا ماحصل ہے، اس کے بعد اس کی ضروری تفصیلات آتی ہیں، چنانچہ آیت (۱۳) میں فرمایا: ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ﴾:

صفحہ ۳۵۲

۱۳- (الف) ایک گمراہ اور ظالم قوم سے چند حق پرست نوجوانوں کا کنارہ کشی کر لینا اور ایک پہاڑ کے غار میں جا کر پوشیدہ ہو جانا۔ ان کی قوم چاہتی تھی انہیں سنگسار کر دے یا جبراً اپنے دین میں واپس لے آئے، انہوں نے دنیا چھوڑ دی مگر حق سے منہ نہ موڑا۔

صفحہ ۳۵۶

۱۹- (ب) وہ جب غار میں اٹھے تو اس کا اندازہ نہ کر سکے کہ کتنے عرصے تک یہاں رہے ہیں۔ انہوں نے اپنا ایک آدمی شہر میں کھانا لانے کے لیے بھیجا اور کوشش کی کہ کسی کو

خبر نہ ہو لیکن حکمتِ الٰہی کا فیصلہ دوسرا تھا، خبر ہو گئی اور یہ معاملہ لوگوں کے لیے تذکیر و عبرت کا موجب ہوا۔

صفحہ ۳۵۸

۲۱- (ج) جس قوم کے ظلم سے عاجز ہو کر انہوں نے غار میں پناہ لی تھی، وہی ان کی اس درجہ معتقد ہوئی کہ ان کے مرقد پر ایک ہیکل تعمیر کیا گیا۔

صفحہ ۳۵۹

۲۲ و ۲۳- (د) اس واقعے کی تفصیلات لوگوں کو معلوم نہیں، طرح طرح کی باتیں مشہور ہو گئی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ تین آدمی تھے بعض کہتے ہیں پانچ تھے بعض کہتے ہیں سات تھے، مگر یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں، حقیقتِ حال، اللہ ہی کو معلوم ہے، اور غور کرنے کی یہ بات نہیں ہے کہ ان کی تعداد کتنی تھی؟ دیکھنا چاہیے کہ ان کی حق پرستی کا کیا حال تھا؟

آیت (۲۳) میں فرمایا جو کھلی ہوئی اور پکی بات ہے وہ تذکیر و عبرت کے لیے کفایت کرتی ہے، اس سے زیادہ کاوش میں نہ پڑو، اور نہ بحث و نزاع کرو، اور نہ کبھی کسی ایسی بات کے لیے جس کا علم اللہ ہی کو ہے زور دے کر کہو کہ میں ضرور ایسا کر کے رہوں گا۔ یہ اللہ کے ہاتھ ہے کہ جتنی باتیں چاہے، وحی کے ذریعے بتلا دے، غیبی امور میں انسان کی کاوشیں کچھ کام نہیں دے سکتیں۔

صفحہ ۳۶۰

۲۴- (ھ) آیت (۲۴) میں، اس طرف اشارہ ہے کہ عنقریب ایسا ہی معاملہ تمہیں پیش آنے والا ہے، یعنی اپنی قوم سے راہِ حق میں کنارہ کشی کرو گے اور غارِ ثور میں کئی دن تک مقیم رہو گے۔ پھر تم پر فتح و کامرانی کی ایسی راہ کھولی جائے گی جو اس معاملے سے بھی کہیں عظیم تر ہو گی۔

صفحہ ۴۰۳-۴۰۵

سورت کے بعض مقامات کی مزید تشریحات

۱- مسیحی مذہب کے ابتدائی قرنوں میں متعدد واقعات ایسے گزرے ہیں کہ راسخ الاعتقاد عیسائیوں نے مخالفوں کے ظلم و وحشت سے عاجز آ کر پہاڑوں کے غاروں میں پناہ لے لی اور آبادیوں سے کنارہ کش ہو گئے، یہاں تک کہ وہیں وفات پا گئے، اور ایک عرصے کے بعد ان کی نعشیں برآمد ہوئیں، چنانچہ ایک واقعہ روم کے اطراف میں گزرا تھا، ایک انطاکیہ (Antioch) کی طرف منسوب ہے، ایک افیسس (Ephesus) میں بیان کیا جاتا ہے۔

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سورت میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے، وہ کہاں پیش آیا تھا؟

قرآن نے ''کہف'' کے ساتھ الرقیم کا لفظ بھی بولا ہے، اور بعض ائمہ تابعین نے اس کا یہی مطلب سمجھا تھا کہ یہ ایک شہر کا نام ہے، لیکن چوں کہ اس نام کا، کوئی شہر عام طور پر مشہور نہ تھا، اس لیے اکثر مفسّرین اس طرف چلے گئے کہ یہاں ''الرقیم'' کے معنی کتابت کے ہیں یعنی ان کے غار پر کوئی کتبہ لگا دیا گیا تھا، اس لیے کتبے والے مشہور ہوئے۔

لیکن اگر انہوں نے تورات کی طرف رجوع کیا ہوتا تو معلوم ہو جاتا کہ ''الرقیم'' وہی لفظ ہے، جسے تورات میں ''راقیم'' کہا گیا ہے اور یہ فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا، جو آگے چل کر پیٹرا (Petra) کے نام سے مشہور ہوا، اور عرب اسے ''بطرا'' کہنے لگے۔

۱۹۱۸ء کی عالم گیر جنگ کے بعد اور آثار قدیمہ کی تحقیقات کے جو نئے نئے گوشے کھلے ہیں، ان میں ایک پیٹرا بھی ہے اور ان کے انکشافات نے بحث و نظر کا ایک نیا میدان مہیا کر دیا ہے۔

جزیرہ نمائے سینا اور خلیجِ عقبہ سے سیدھے شمال کی طرف بڑھیں تو دو پہاڑی سلسلے متوازی شروع ہو جاتے ہیں اور سطحِ زمین، بلندی کی طرف اٹھنے لگتی ہے۔ یہ علاقہ نبطی قبائل کا علاقہ تھا اور اسی کی ایک پہاڑی سطح پر ''راقیم'' نامی شہر آباد تھا۔ دوسری صدی عیسوی

میں جب رومیوں نے شام اور فلسطین کا الحاق کر لیا تو یہاں دوسرے شہروں کی طرح راقیم نے بھی ایک رومی نوآبادی کی حیثیت اختیار کر لی اور یہی زمانہ ہے جب پیٹرا کے نام سے، اس کے عظیم الشان مندروں اور تھیٹروں کی شہرت، دور دور تک پہنچی۔ ۶۴۰ء میں، جب مسلمانوں نے یہ علاقہ فتح کیا تو راقیم کا نام، بہت کم زبانوں پر رہا تھا، یہ رومیوں کا پیٹرا، اور عربوں کا بطرا تھا۔

جنگ کے بعد سے اس علاقے کی، از سرِ نو اثری پیمائش کی جا رہی ہے، اور نئی نئی باتیں روشنی میں آ رہی ہیں، از اں جملہ، اس علاقے کے عجیب و غریب غار ہیں جو دور دور تک چلے گئے ہیں اور نہایت وسیع ہیں، نیز اپنی نوعیت میں ایسے واقع ہوئے ہیں کہ دن کی روشنی کسی طرح بھی ان کے اندر نہیں پہنچ سکتی۔

ایک غار ایسا بھی ملا ہے جس کے دہانے کے پاس قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بے شمار ستونوں کی کرسیاں شناخت کی گئی ہیں۔ خیال کیا گیا ہے کہ یہ کوئی معبد ہو گا جو یہاں تعمیر کیا گیا تھا۔

اس انکشاف کے بعد قدرتی طور پر یہ بات سامنے آ جاتی ہے کہ اصحابِ کہف کا واقعہ، اسی شہر میں پیش آیا تھا، اور قرآن نے صاف صاف اس کا نام ''الرقیم'' بتلا دیا ہے اور جب اس نام کا ایک شہر موجود تھا تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ الرقیم کے معنی میں تکلفات کیے جائیں اور بغیر کسی بنیاد کے اسے کتبے پر محمول کیا جائے۔ علاوہ بریں دوسرے قرائن بھی اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

قرآن نے جس طرح اس واقعے کا ذکر کیا ہے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کی عرب میں شہرت تھی، لوگ اس بارے میں بحثیں کیا کرتے تھے اور اسے ایک نہایت ہی عجیب و غریب بات تصور کرتے تھے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ مشرکینِ عرب کے وسائل معلومات معدود تھے، بہت کم امکان ہے کہ دور کی باتیں ان کے علم میں آئی ہوں، پس ضروری ہے کہ یہ قرب و جوار ہی کی کوئی بات ہو اور ان لوگوں کی زبانی سنی جا سکے، جن سے ہمیشہ عربوں کا ملنا جلنا رہتا ہو۔ ایسے لوگ کون ہو سکتے تھے؟ اگر اسے پیٹرا کا واقعہ

قرار دیا جائے تو بات بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اوّل تو خود یہ مقام عرب سے قریب تھا یعنی عرب کی سرحد سے ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر، ثانیاً نبطیوں کی وہاں آبادی تھی اور نبطیوں کے تجارتی قافلے برابر حجاز میں آتے رہتے تھے۔ یقیناً نبطیوں میں اس واقعے کی شہرت ہوگی اور انہی سے عربوں نے سنا ہوگا۔ خود قریشِ مکہ کے تجارتی قافلے بھی ہر سال شام جایا کرتے تھے اور سفر کا ذریعہ وہی شاہراہ تھی جو رومیوں نے ساحلِ خلیج سے لے کر ساحلِ مارمورا (۱) تک تعمیر کردی تھی۔ پیٹرا اسی شاہراہ پر واقع تھا، بلکہ اس نواح کی سب سے پہلی تجارتی منڈی تھی۔ اس لیے اس سے زیادہ قدرتی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ واقعہ ان کے علم میں آگیا ہو۔ (۲) عرب جاہلیہ میں اس واقعے کی صحت ضرور تھی۔ امیہ بن ابی الصلت:

ولیس بها الا الرقیم مجاورا

وصیدهم والقوم فی الکهف همد (۳)

اس سلسلے میں چند باتیں اور تشریح طلب ہیں:

اصل واقعہ

(۱) آیت (۹) ﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيْمِ، كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا﴾ کا اسلوبِ خطاب صاف کہہ رہا ہے کہ کچھ لوگ ''اصحاب الکہف والرقیم'' کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا معاملہ قدرتِ الٰہی کا ایک عجیب و غریب کرشمہ سمجھا جاتا ہے، لوگوں نے پیغمبر اسلام سے ان کا ذکر کیا ہے اور اب وحیِ الٰہی اس معاملے کی حقیقت واضح کر رہی ہے، چنانچہ پہلے مجملاً اس کا خلاصہ اور نتیجہ بتلا دیا کہ جو کچھ پیش آیا تھا، وہ اس سے زیادہ نہیں ہے، اور جو کچھ عبرت و تذکیر کی بات ہے، وہ یہ ہے۔ پھر آیت (۱۳) میں فرمایا ﴿نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ﴾ اب ہم تجھے ان کی سچی خبر سنا دیتے ہیں، یعنی واقعے کی [چند ضروری] تفصیلات بیان کر دیتے ہیں، چنانچہ اس کے بعد تفصیلات بیان کی ہیں۔

یہ مجمل خلاصہ جو آیت (۱۰) سے (۱۲) تک بیان کیا ہے، تمام سرگزشت کا ماحصل ہے۔ اسی کی روشنی میں بقیہ تفصیلات پڑھنی چاہییں۔ فرمایا:

چند نوجوان تھے، جنہوں نے سچائی کی راہ میں دنیا اور دنیا کی راحتوں سے منھ موڑا

اور ایک غار میں پناہ گزیں ہو گئے۔ ان کے پیچھے ظلم و ستم کی قوتیں تھیں۔ سامنے غار کی تاریکی و وحشت، تاہم وہ ذرا بھی ہراساں نہ ہوئے۔ انہوں نے کہا: ''خدایا! تیری ہی رحمت کا آسرا ہے، اور تیری ہی چارہ سازی پر بھروسہ!''

چنانچہ کئی سال تک وہ وہیں رہے اور اس طرح رہے کہ دنیا کی صداؤں کی طرف سے ان کے کان بالکل بند تھے۔ پھر ہم نے انہیں اٹھا کھڑا کیا تاکہ واضح ہو جائے ان دونوں جماعتوں میں سے کون گروہ تھا، جس نے اس عرصے میں نتائجِ عمل کا بہتر اندازہ کیا ہے، یعنی صورتِ حال نے دو جماعتیں پیدا کردی تھیں، ایک اصحابِ کہف تھے، ایک ان کے مخالف۔ ایک نے حق کی پیروی کی، دوسرے نے ظلم و تشدّد پر کمر باندھی۔ یہ چند برسوں کی مدّت، دونوں جماعتوں پر گزری تھی، اس پر بھی جو غار میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی اور اس پر بھی جس نے غار میں پناہ لینے کے لیے انہیں مجبور کیا۔

اب دیکھنا یہ تھا کہ دونوں میں سے کس نے کمایا ہے؟ اور کس نے کھویا [گنوایا] ہے؟ کون ان دونوں میں زمانے کا بہتر اندازہ شناس تھا؟

چنانچہ آگے چل کر جو تفصیلات آتی ہیں، ان سے واضح ہو جاتا ہے کہ ظالم جماعت کے ظلم کی عمر بہت تھوڑی تھی اور بالآخر وہی راہ فتح مند ہونے والی تھی جو اصحابِ کہف نے اختیار کی تھی، کیوں کہ بالآخر مسیحی دعوت، تمام ملک میں پھیل گئی اور جب کچھ عرصے کے بعد وہ غار سے نکلے اور ایک آدمی کو آبادی میں بھیجا، تو [معلوم ہوا کہ] اب مسیحی ہونا کوئی قابلِ جرم نہیں تھا۔ عزت و سربراہی کی سب سے بڑی عظمت تھی!

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان پرستارانِ حق کی استقامت ہی تھی جس نے دعوتِ حق کو فتح مند کیا، اگر وہ مظالم سے تنگ آکر اتباعِ حق سے دست بردار ہو جاتے تو یقیناً یہ انقلاب ظہور میں نہیں آتا۔

(ب) اس کے بعد واقعے کی بعض تفصیلات واضح کردی ہیں، جو لوگ خدا پرستی کی راہ اختیار کرتے تھے، ان کی مخالفت میں تمام باشندے کمربستہ ہو جاتے اور اگر وہ اپنی روش سے باز نہ آتے تو سنگسار کرتے۔ یہ حالت دیکھ کر انہوں نے فیصلہ کیا، آبادی سے منھ موڑیں اور

کسی غار میں معتکف ہو کر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جائیں، چنانچہ ایک غار میں مقیم ہو گئے۔

ان کا ایک وفادار کتا تھا، وہ بھی ان کے ساتھ غار میں چلا گیا۔ جس غار میں انہوں نے پناہ لی/ وہ اس طرح کا واقع ہوا ہے کہ اگرچہ اندر سے کشادہ ہے اور دہانہ کھلا ہوا لیکن سورج کی کرنیں اس میں راہ نہیں پاسکتیں، نہ تو چڑھتے دن میں، نہ ڈھلتے میں، جب سورج نکلتا ہے تو داہنی جانب رہتے ہوئے گزر جاتا ہے، جب ڈھلتا ہے تو بائیں جانب رہتے ہوئے غروب ہو جاتا ہے، یعنی غار اپنی طول میں شمال وجنوب رویہ واقع ہے۔ ایک طرف دہانہ ہے، دوسری طرف منفذ [روشن دان]، روشنی اور ہوا دونوں طرف سے آتی ہے لیکن دھوپ کسی طرف سے بھی راہ نہیں پاسکتی۔

اس صورتِ حال سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ زندہ رہنے کے لیے، وہ نہایت محفوظ اور موزوں مقام ہے، کیوں کہ ہوا اور روشنی کی راہ موجود ہے، مگر دھوپ کی تپش پہنچ نہیں سکتی۔ پھر اندر سے کشادہ ہے، جگہ کی کمی نہیں۔ دوسری یہ کہ باہر سے دیکھنے والوں کے لیے اندر کا منظر بہت ڈراؤنا ہو گیا ہے، کیوں کہ روشنی کے منافذ [روشن دان اور دہانہ] موجود ہیں اس لیے بالکل اندھیرا نہیں رہتا۔ سورج کسی وقت سامنے آتا نہیں، اس لیے بالکل اجالا بھی نہیں ہوتا۔ روشنی اور اندھیری کی ملی جلی حالت رہتی ہے اور جس غار کی اندرونی فضا ایسی ہو، اسے باہر سے جھانک کر دیکھا جائے تو اندر کی ہر چیز، ضرور ایک بھیانک منظر پیش کرے گی۔

انقلابِ حال

یہ لوگ کچھ عرصے تک غار میں رہے اس کے بعد نکلے تو انہیں کچھ اندازہ نہ تھا، کتنے عرصے تک اس میں رہے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے، باشندوں کا وہی حال ہوگا، جس حال میں انہیں چھوڑا تھا۔ لیکن اس عرصے میں یہاں انقلاب ہو چکا تھا۔ اب غلبہ ان لوگوں کا تھا جو اصحابِ کہف ہی کی طرح خدا پرستی کی رہ اختیار کر چکے تھے۔ جب ان کا ایک آدمی شہر میں پہنچا تو اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اب وہی لوگ جنہوں نے انہیں سنگسار کرنا چاہا تھا، اُن کے ایسے معتقد ہو گئے کہ ان کی غار نے زیارت گاہِ عام کی حیثیت اختیار کر لی اور امرائے

شہر نے فیصلہ کیا کہ یہاں ایک ہیکل تعمیر کیا جائے۔

(ج) اصحابِ کہف نے یہ مدت کس حال میں بسر کی تھی؟ اس بارے میں قرآن نے صرف اس قدر اشارہ کیا ہے کہ ﴿فَضَرَبْنَا عَلَى آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا﴾ [آیت] (۱۱): "ضرب علی الآذان" کے صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے، یعنی دنیا کی کوئی صدا ان تک نہیں پہنچتی تھی، لیکن مفسّرین نے اسے نیند پر محمول کیا ہے، یعنی ان پر نیند طاری ہو گئی تھی اور چوں کہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا، اس لیے اس حالت کو "ضرب علی الآذان" سے تعبیر کیا گیا۔(۴)

اصل یہ ہے کہ اصحابِ کہف کا جو قصہ عام طور پر مشہور ہو گیا تھا، وہ یہی تھا کہ غار میں برسوں تک سوتے رہے، اس لیے یہ کوئی عجیب بات نہیں کہ بعد کو بھی اسی طرح کی روایتیں مشہور ہو گئیں۔ عرب میں قصہ کے اصل راوی شام کے نبطی تھے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس قصے کی اکثر تفصیلات، تفسیر کے انہی راویوں پر جا کر منتہی ہوتی ہیں، جو اہلِ کتاب کے قصوں کی روایت میں مشہور ہو چکے ہیں، مثلاً ضحاک اور سدّی۔

بہر حال اگر یہاں ضرب علی الآذان سے مقصود نیند کی حالت ہو تو پھر مطلب یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے اور ﴿ثُمَّ بَعَثْنَاهُمْ﴾ کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے۔ یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے، طبّی تجارب کے مسلّمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربے میں آتی رہتی ہیں۔

پس اگر اصحابِ کہف پر قدرتِ الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو، جس نے غیر معمولی مدت تک انہیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں، البتہ قرآنِ حکیم کی تصریح، اس بارے میں ظاہر اور قطعی نہیں ہے۔

(د) آیت (۱۸) ﴿وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَهُمْ رُقُودٌ﴾ اس کا مطلب کیا ہے؟ اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے، جو نزولِ قرآن کے وقت تھی یا جو حالت اس غار کی ایک مدت تک ابتدا میں رہ چکی تھی۔ دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ انقلابِ حال کے بعد اصحابِ کہف نے غار کی گوشہ نشینی ترک نہیں کی تھی، اسی میں رہے، یہاں تک کہ انتقال کر گئے۔

ان کے انتقال کے بعد غار کی حالت ایسی ہوگئی کہ باہر سے کوئی دیکھے تو معلوم ہو، زندہ آدمی موجود ہیں۔ دہانے کے قریب ایک کتا، دونوں ہاتھ آگے کیے بیٹھا ہے، حالاں کہ نہ تو آدمی زندہ ہیں، نہ کتا ہی زندہ ہے۔

تفسیر ﴿وَ تَحْسَبُهُمْ اَیْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ﴾

لیکن باہر سے دیکھنے والا انہیں زندہ اور جاگتا کیوں سمجھے؟ اگر ان کی نعشیں پڑی ہیں تو نعشوں کو کوئی زندہ تصور نہیں کر سکتا، اگر "رقود" سے مقصود سونے کی حالت ہے اور وہ لیٹے ہوئے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک لیٹا ہوا آدمی دیکھنے والے کو جاگتا دکھائی دے۔

مفسّرین نے یہ اشکال محسوس کیا لیکن اس کا کوئی حل دریافت نہ کر سکے۔ بعضوں نے کہا، وہ اس لیے جاگتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، لیکن اگر ایک بے حس و حرکت نعش پڑی دکھائی دے اور اس کی آنکھیں کھلی ہوں تو دیکھنے والا اسے ہشیار و بیدار کیوں سمجھنے لگا؟ یہی سمجھے گا کہ مر گیا ہے، مگر آنکھیں کھلی رہ گئی ہیں۔ بعضوں نے کہا ﴿نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ کی وجہ سے وہ بیدار دکھائی دیتے ہیں، یعنی چوں کہ دہنے بائیں کروٹ بدلتی رہتی ہے، اس لیے دیکھنے والا خیال کرتا ہے، یہ بیدار ہیں، لیکن یہ توجیہ پہلے سے بھی زیادہ بے معنی ہے۔ اوّل تو کروٹ بدلنا بیداری کی دلیل نہیں، آدمی گہری سے گہری نیند میں ہوتا ہے اور کروٹ بدلتا ہے۔ ثانیاً اگر کروٹ بدلتے ہوں گے تو کچھ وقفے کے بعد بدلتے ہوں گے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ ہر آن کروٹ بدلتے ہی رہتے ہوں اور جب کبھی کوئی جھانک کر دیکھے، انہیں کروٹ بدلتا ہی پائے! لطف یہ ہے کہ ﴿نُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْیَمِیْنِ وَ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ کی تفسیر میں یہی مفسّر، ہمیں بتلاتے ہیں کہ بعضوں کے نزدیک سال میں دو دفعہ کروٹ بدلتی ہے، بعضوں کے نزدیک ایک مرتبہ۔ بعض کہتے ہیں تین سال بعد اور بعض کہتے ہیں نو سال بعد!

علاوہ بریں قرآن نے یہ بات جس اسلوب و شکل میں بیان کی ہے اس پر ان نکتہ

سنجوں نے غور نہیں کیا۔ ﴿لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَیْهِمْ لَوَلَّیْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ یعنی غار کے اندر کا منظر اس درجہ دہشت انگیز ہے کہ اگر تم جھانک کر دیکھو تو خوف کے مارے کانپ اٹھو اور الٹے پاؤں بھاگ کھڑے ہو۔

اس سے معلوم ہوا، غار کے اندر اصحابِ کہف کے اجسام نے ایسا منظر پیدا کر دیا ہے جو بے حد دہشت انگیز ہے۔ اگر کوئی آدمی باہر سے دیکھے تو دیکھنے کے ساتھ ہی اس پر دہشت چھا جائے۔ معاً الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہو۔ اب اگر اندر کا منظر صرف اتنا ہی تھا کہ چند آدمی لیٹے ہوئے ہیں اور آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، تو یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے اس درجہ دہشت انگیزی پیدا ہو سکے۔ علاوہ بریں جو آدمی باہر سے جھانکے گا، وہ اتنا باریک بیں نہیں ہو سکتا کہ غار کی تاریکی میں لیٹے ہوئے آدمیوں کی آنکھیں بھی بہ اوّل نظر دیکھ لے اور وہ بھی اس حالت میں کہ دہنے یا بائیں کروٹ پر لیٹے ہوئے ہوں!

مفسّرین کی حیرانیاں اور انکشاف کی حقیقت

دراصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے اور جب تک مفسّرین کے پیدا کیے ہوئے تخیّل سے بالکل الگ ہو کر، تحقیق نہ کی جائے اصلیت کا سراغ نہیں مل سکتا۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جو حالت اس آیت میں بیان کی گئی ہے، وہ کس وقت کی ہے؟ اس وقت کی ہے جب وہ نئے نئے غار میں جا کر مقیم ہوئے تھے؟ یا اس وقت کی، جب انکشافِ حال کے بعد دوبارہ معتکف ہو گئے؟

مفسّرین نے خیال کیا، اس کا تعلق پہلے وقت سے ہے اور یہی بنیادی غلطی ہے، جس نے سارا الجھاؤ پیدا کر دیا ہے۔ دراصل اس کا تعلق بعد کے حالات سے ہے، یعنی جب وہ ہمیشہ کے لیے غار میں گوشہ نشین ہو گئے اور پھر کچھ عرصے کے بعد وفات پا گئے تو غار کے اندرونی منظر کی یہ نوعیت ہوگئی تھی: ﴿وَ تَحْسَبُهُمْ اَیْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ﴾۔ "ایقاظ" سے مقصود، ان کا زندہ ہونا ہے اور "رقود" سے مردہ ہونا، نہ کہ بیداری اور خواب، چنانچہ عربی میں زندگی و موت کے لیے یہ تعبیر عام و معلوم ہے۔

پھر یہ بات سامنے لانی چاہیے کہ یہ واقعہ مسیحی دعوت کی ابتدائی صدیوں کا ہے اور

جنہیں پیش آیا تھا، وہ عیسائی تھے۔ صرف اتنی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہوجاتا ہے۔

مسیحی دعوت کے ابتدائی قرنوں ہی میں زہد وانزواء کی ایک خاص زندگی شروع ہوئی تھی، جس نے آگے چل کر رہبانیت (موناسٹی سزم Monasticism) کی مختلف شکلیں اختیار کرلیں۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ لوگ ترکِ علائق [یعنی دنیا سے ترکِ تعلق] کے بعد کسی پہاڑ کی غار میں یا کسی غیر آباد گوشے میں معتکف ہوجاتے تھے اور پھر ان پر استغراقِ عبادت کی ایسی حالت طاری ہوجاتی تھی کہ وضع ونشست کی جو حالت اختیار کرلیتے، اسی میں پڑے رہتے، یہاں تک کہ زندگی ختم ہوجاتی، مثلاً اگر قیام کی حالت میں مشغول ہوئے تھے تو برابر کھڑے ہی رہتے اور اسی حالت میں جان دے دیتے، اگر گھٹنے کے بل، رکوع کی حالت اختیار کی تھی تو یہی حالت آخر تک قائم رہتی، اگر سجدے میں سر رکھ دیا تھا تو پھر سجدے ہی میں پڑے رہتے اور مرجانے کے بعد بھی اسی وضع میں نظر آتے۔ زیادہ تر گھٹنے کے بل، رکوع کی وضع اختیار کی جاتی تھی، کیوں کہ عیسائیوں میں تعبد وتضرّع کے لیے یہی وضع رائج ہوگئی تھی۔ (۵)

غذا کی طرف سے یہ لوگ بالکل بے پروا ہوتے تھے، اگر آبادی قریب ہوتی تو لوگ روٹی و پانی پہنچادیا کرتے، نہیں ہوتی، تو یہ اس کی جستجو نہیں کرتے۔ عبادت کا استغراق، جستجو کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ اس اعتبار سے اُن کی حالت ویسی ہی تھی، جیسی ہندوستان کے یوگیوں کی رہ چکی ہے اور اب بھی گاہ گاہ نظر آجاتی ہے۔

جس طرح زندگی میں، انہیں کوئی نہیں چھیڑتا تھا، اسی طرح مرنے کے بعد بھی کوئی اس کی جراٴت نہ کرتا۔ مدّتوں تک ان کی نعشیں اسی حالت میں باقی رہتیں، جس حالت میں انہوں نے زندگی کے آخری لمحے بسر کیے تھے۔ اگر موسم موافق ہوتا اور درندوں سے حفاظت ہوتی تو صدیوں تک ڈھانچے باقی رہتے اور فاصلے سے دیکھنے والے، انہیں زندہ انسان تصور کرتے چنانچہ ویٹیکان (Vatican) کے تہہ خانوں میں بے شمار ڈھانچے آج تک محفوظ ہیں جو اسی طرح کے مقامات سے برآمد ہوئے تھے اور اپنی اصلی وضع وہیئت پر باقی تھے۔

ابتداء میں، اس غرض سے، زیادہ تر پہاڑوں کے غار یا پرانی عمارتوں کے کھنڈر اختیار کیے گئے تھے، لیکن آگے چل کر یہ طریقہ، اس درجہ عام ہوگیا کہ خاص خاص عمارتیں اس غرض سے تعمیر کی جانے لگیں۔ یہ عمارتیں اس طرح بنائی جاتی تھیں کہ ان میں آمد و رفت کے لیے کوئی دروازہ نہیں ہوتا تھا کیوں کہ جو جاتا تھا، وہ پھر باہر نہیں نکلتا تھا۔ صرف ایک چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی رکھی جاتی تھی جو ہوا اور روشنی کا ذریعہ ہوتی اور اسی کے ذریعے لوگ غذا بھی پہنچادیتے۔

بعد کو جب رہبانیت (موناسٹی سزم) کے باقاعدہ ادارے قائم ہوگئے تو اس طرح کے انفرادی انزوا کی مثالیں کم ہوتی گئیں، تاہم تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ تیرہویں صدی تک، یہ طریقہ عام طور پر جاری تھا اور یورپ کی کوئی آبادی ایسی نہ تھی جو اس طرح کی عمارتوں سے خالی ہو۔ ان مقامات کو عام طور پر Lagette کہتے تھے اور جب ایک راہب یا راہبہ کا ان میں انتقال ہوجاتا تو ان پر یہ لاطینی لفظ کندہ کردیا جاتا کہ (TU-ORA) یعنی اس کے لیے دعا کرو۔

(۶) تیرہویں صدی میں پیڑ دامروں (Pietro di Murrone) نے جو آگے چل کر پوپ سلسطائن پنجم (Celestine V) ہوا، راہبوں کا ایک خاص نظام قائم کیا تھا جس کے لیے ضروری تھا کہ سینٹ بنی ڈکٹ (St. Benedict) کے مقررہ قواعد و اصول پر پورے طور پر عمل کرے، اس نظام کی شہرت عام طور پر سلسطائن ہی کے نام سے ہوئی تھی۔ اس نظام کے پیروؤں میں بڑی تعداد ایسے راہبوں کی ملتی ہے جو اپنی راہبانہ زندگی کے آخری دور میں اس طرح کی دائمی گوشہ گیری اختیار کرلیتے تھے۔ مرنے کے بعد ان کی نعشیں انہیں گوشوں میں محفوظ رہتی تھیں۔

سینٹ بنی ڈکٹ آف نرسیا (St. Benedict of Nursia) کے حالات ازمنۂ وسطیٰ کی تاریکی میں گم ہیں، جو کچھ بھی تاریخ کے حصے میں آیا ہے وہ سینٹ گری گوری (Gregory) کے مکالموں (Dialogues) کی تصریحات ہیں۔

گری گوری کے بیان کے مطابق بنی ڈکٹ سنہ ۴۸۰ء میں پیدا ہوا۔ اس وقت روم

کے شہروں میں مسیحیت پھیل چکی تھی، لیکن دیہاتی آبادی میں قدیم رومن عقیدہ باقی تھا، چنانچہ اسی لیے بت پرستوں کے لیے پیگان (Pagan) کا لفظ عیسائی بولنے لگے، کیونکہ لاطینی میں دیہاتی باشندوں کو پیگانی (Pagani) کہتے ہیں۔ بنی ڈکٹ پہلے تعلیم کے لیے روم آیا تھا، لیکن وہاں کی عیش پرستانہ زندگی کا اس پر وہی اثر پڑا جو ایک ہزار برس بعد مارٹن لوتھر (Martin Luther) پر پڑنے والا تھا۔ وہ روم سے نکل کر انزیو (Anzio) کے ان غیر آباد کھنڈروں میں چلا گیا جو نیرو (Nero) کے محل کے وہاں واقع تھے۔ محل کی پہاڑیوں میں ایک غار تھا، یہ اس غار میں تین سال تک خلوت گزیں رہا، اس کے بعد نکلا تو دیہاتیوں کو مسیحی مذہب کی دعوت دینے لگا اور اسی زمانے میں اس کی کرامتوں کی شہرت ہوئی۔

اس نے پہلے راہبوں کے لیے بارہ خانقاہیں بارہ حواریوں کے نام سے بنائی تھیں، پھر یہ اپنے خاص شاگرد کو ساتھ لے کر کوہ کاسینو (Cassino) میں چلا آیا اور تقریباً سنہ ۵۲۹ء میں یہاں خانقاہ تعمیر کی، جو آج تک کیتھولک (Catholic) عیسائیوں کی ایک متبرک زیارت گاہ ہے۔

بنی ڈکٹ نے راہبوں کے ڈسپلن کے قواعد وضع کیے جو آگے چل کر موناسٹی سزم (Monasticism) کے اساسات قرار پائے، ان قواعد کی بنا تین اصولوں پر رکھی تھی۔

تمام تاریخیں متفق ہیں کہ مسیحی رہبانیت، سب سے پہلے مشرق میں شروع ہوئی، اور اس کا بڑا مرکز فلسطین اور مصر تھا۔ پھر چوتھی صدی مسیحی میں یہ یورپ پہنچی اور سینٹ بنی ڈکٹ (Benedict) نے سب سے پہلے اس کے قواعد وضوابط منضبط کیے، سینٹ بنی ڈکٹ نے بھی ایک پہاڑ کی غار ہی میں گوشہ نشینی اختیار کی تھی۔

مسیحی رہبانیت کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اس کی ابتداء اضطراری حالت سے ہوئی تھی، آگے چل کر اس نے ایک اختیاری عمل کی نوعیت پیدا کرلی، یعنی ابتداء میں لوگوں نے مخالفوں کے ظلم وتشدد سے مجبور ہوکر غاروں اور جنگلوں میں گوشہ نشینی اختیار کی۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ یہ اضطراری طریقہ زہد و تعبد کا ایک اختیاری اور مقبول طریقہ بن گیا۔ مزید تشریح اس مقام کی سورہ حدید کی

تشریحات میں ملے گی۔

(و) بہر حال معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب کہف کا معاملہ بھی، تمام تر اسی نوعیت کا تھا۔ ابتداء میں قوم کے ظلم نے انہیں مجبور کیا تھا کہ غار میں پناہ لیں، لیکن جب کچھ عرصے تک وہاں مقیم رہے تو زہد وعبادت کا استغراق کچھ اس طرح ان پر چھا گیا کہ پھر دنیا کی طرف لوٹنے پر آمادہ نہ ہوسکے۔ اور گو ملک کی حالت بدل گئی تھی، لیکن وہ بدستور غار ہی میں معتکف رہے، یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ انتقال اس حال میں ہوا کہ جس شخص نے ذکر وعبادت کی جو وضع اختیار کرلی تھی، وہی وضع آخری لمحوں تک باقی رہی۔ ان کے وفادار کتے نے بھی آخر تک ان کا ساتھ دیا۔ وہ، پاسبانی کے لیے دہانے کے قریب بیٹھا رہتا تھا، جب اس کے مالک مرگئے تو اس نے بھی وہیں بیٹھے بیٹھے دم توڑ دیا۔

اب اس واقعے کے بعد، غار کے اندرونی منظر نے ایک عجیب دہشت انگیز نوعیت پیدا کرلی۔ اگر کوئی باہر سے جھانک کر دیکھے تو اسے راہبوں کا ایک پورا مجمع ذکر وتعبد میں مشغول دکھائی دے گا، کوئی گھٹنے کے بل رکوع کی حالت میں ہے، کوئی سجدے میں پڑا ہے، کوئی ہاتھ جوڑے اوپر کی طرف دیکھ رہا ہے۔ دہانے کے قریب ایک کتا ہے، وہ بھی بازو پھیلائے باہر کی طرف منہ کیے ہوئے ہے۔ یہ منظر دیکھ کر، ممکن نہیں کہ آدمی دہشت سے کانپ نہ اُٹھے، کیوں کہ اس نے یہ سمجھ کر جھانکا تھا کہ مردوں کی قبر ہے، مگر منظر جو دکھائی دیا، وہ زندہ انسانوں کا ہے۔

(ز) یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالو، ہر بات اس طرح واضح ہوجاتی ہے، گویا تمام قفلوں کو کھلنے کے لیے صرف اسی ایک کنجی کا انتظار تھا: ﴿وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ﴾ کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ پر بیٹھ گیا، کسی دور از کار توجیہ کی ضرورت باقی نہیں رہی کیوں کہ اس طرح کا منظر، یہی خیال پیدا کرے گا کہ لوگ زندہ ہیں حالانکہ زندہ نہیں: ﴿لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾ کی علت بھی سامنے آگئی، اور وہ تمام بے معنی توجیہیں، غیر ضروری ہوگئیں جن پر امامِ رازی مجبور ہوئے ہیں۔ اگر تم کسی قبر کے اندر جھانک کر دیکھو اور تمہیں مردہ

نعش کی جگہ، ایک آدمی نماز پڑھتا دکھائی دے، تو تمہارا کیا حال ہوگا؟ یقیناً مارے دہشت کے چیخ اٹھو گے۔ اسی طرح ﴿وَنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ﴾ کی تفسیر میں بھی، کسی تکلف کی احتیاج باقی نہ رہی۔ [یہ] غار شمال و جنوب رویہ واقع تھا اور ان دونوں جہتوں میں ہوا اور روشنی کے منافذ تھے جیسا کہ آیت ﴿وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ﴾ سے متبادر ہوتا ہے۔ پس بالمقابل منافذ ہونے کی وجہ سے، ہوا برابر اندر چلتی رہتی تھی اور ان کے ڈھانچے دہنے سے بائیں اور بائیں سے داہنی جانب اس طرح متحرک رہتے تھے، جیسے ایک زندہ آدمی ایک طرف سے پلٹ کر دوسری طرف دیکھے۔

اس تفسیر کے بعد اس سوال کا جواب بھی خود بخود مل گیا کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ، یہ بات کیوں بیان کی کہ سورج کی کرنیں غار کے اندر نہیں پہنچتیں، جیسا کہ آیت (۱۷) میں ہے اور کیوں اسے قدرتِ الٰہی کی ایک نشانی فرمایا کہ ﴿ذٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ﴾ معلوم ہو گیا کہ یہ، دراصل اس بات کی تمہید تھی جو بعد کو آیت [۱۸] میں بیان کی گئی ہے کہ ﴿وَ تَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّ هُمْ رُقُوْدٌ﴾ یعنی چوں کہ یہ بات بیان کرنی تھی کہ مرنے کے بعد، ان کی نعشیں عرصے تک باقی رہیں حتیٰ کہ دیکھنے والوں کو زندہ انسانوں کا گمان ہوتا تھا، اس لیے پہلے، اس کی علت واضح کر دی کہ جس غار میں معتکف ہوئے تھے، وہ اس طرح کا غار تھا کہ انسانی جسم زیادہ سے زیادہ عرصے تک اس میں قائم رہ سکتا تھا کیوں کہ سورج کی روشنی اس میں پہنچتی رہتی لیکن سورج کی تپش کا اس میں گزر نہ تھا۔ جو چیز، نعش کو جلد گلا سڑا دیتی ہے، وہ، سورج کی تپش ہے اور جو چیز تازگی پیدا کرتی ہے، وہ، ہوا اور روشنی ہے، ہوا چلتی رہتی تھی، روشنی پہنچتی رہتی ہے مگر تپش سے پوری حفاظت تھی: ﴿ذٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ﴾۔

(ح) ﴿وَ لَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِئَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا﴾ (۲۵) کا کیا مطلب ہے؟ کیا یہ خود قرآن کی تصریح ہے کہ وہ لوگ اتنی مدت تک غار میں پڑے رہے؟ لیکن اگر ایسا ہے تو پھر اس کے بعد کیوں فرمایا کہ ﴿قُلِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾۔

مفسرین کو اس اشکال کے دور کرنے میں طرح طرح کے تکلفات کرنے پڑے، حالاں کہ صاف مطلب وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے یعنی جس

طرح پہلے، ان کی تعداد کے بارے میں لوگوں کے مختلف اقوال نقل کیے تھے، اسی طرح یہاں مدتِ بقاء کے بارے میں لوگوں کا قول نقل کیا ہے، یعنی لوگ کہتے ہیں غار میں تین سو برس تک رہے، بعضوں نے اس پر نو برس اور بڑھا دیے۔ تم کہہ دو، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ فی الحقیقت کتنی مدت گزر چکی ہے۔ پس یہ، قرآن کی تصریح نہیں ہے، لوگوں کا قول ہے اور ''سیقولون'' سے نقلِ اقوال کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے، اسی سلسلے کی یہ آخری کڑی ہے۔ (۷) حضرت عبداللہ، ابنِ مسعود سے بھی ایسی ہی تفسیر مروی ہے۔ (۸)

(ط) امام قرطبی نے حضرت ابنِ عباس کا قول نقل کیا ہے کہ ''أولئك قوم فنوا وعدموا منذ مدة طويلة'' یعنی اصحابِ کہف کی موت پر ایک مدت گزر چکی ہے۔ ان کے اجسام فناء ہو گئے، جس طرح ہر جسم فنا ہو جاتا ہے۔

ایک روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شام کی غزوات میں، بعض صحابہ کا گزر، اصحابِ کہف کی غار پر ہوا تھا اور انہیں ان کی ہڈیاں ملی تھیں۔ اگر یہ روایت، صحیح ہو تو اس سے، اس کی بھی مزید تصدیق ہو گئی کہ یہ واقعہ پیٹرا میں پیش آیا تھا۔

مسیحی رہبانیت کے طریقے کی نسبت مندرجہ صدر بیان میں جو اشارات کیے گئے ہیں، ان کی تفصیلات کے لیے حسب ذیل کتابیں دیکھنی چاہییں: (۹)

حواشی

(۱) جنگ کے بعد اس شاہراہ کا سراغ لگایا گیا تو پوری طرح نمایاں ہو گئی۔ اب یہ اپنے اصلی خط پر دوبارہ تعمیر کی جارہی ہے اور عقبہ سے عمان تک تعمیر ہو چکی ہے۔ آج کل جہاں عقبہ ہے وہاں حضرت سلیمان نے ایک ساحلی شہر ایزین جبر (Ezion-geber) تعمیر کیا تھا، اسی بندرگاہ سے ان کے جہاز ہندوستان جایا کرتے تھے اور بحر احمر کے تجارتی بیڑے کا مرکز تھا۔ (سلاطین اول، ۹:۲۶)

(۲) مندرجہ ذیل عبارت پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں نہیں ہے:

''عرب جاہلیہ میں... في الكهف همدٌ''۔

(۳) انظر ''فحول الشعراء'' دیوان امیة بن ابی الصلت، ص ۲۹۔ (م)۔

(۴) پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں مندرجہ ذیل عبارت بھی ہے:

اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کے لیے "ضرب علی الآذان" کی تعبیر ملتی نہیں، لیکن وہ کہتے ہیں: یہ ایک طرح کا استعارہ ہے۔ گہری نیند کی حالت کو ضرب علی الآذان کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ ففي الكلام تجوّز بطريق الاستعارة التبعية۔

(۵) عیسائیوں نے عبادت کی یہ وضع غالباً رومیوں سے لی، کیوں کہ یہودیوں کے اوضاعِ نماز میں اس وضع کا پتا نہیں چلتا۔ ان کا رکوع تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے جیسا ہم نماز میں کیا کرتے ہیں۔ دنیا کی مختلف قوموں نے بندگی و نیاز مندی کے اظہار کے لیے مختلف وضعیں اختیار کر لی تھیں۔ رومی گھٹنا ٹیک کر جھک جاتے اور بادشاہ کے قدموں کو یا دامن کو بوسہ دیتے۔ مجرموں کے لیے بھی ضروری تھا کہ مجسٹریٹ کا فیصلہ گھٹنے ٹیک کر سنیں۔ مصر، بابل اور ایران میں سجدے کی رسم پیدا ہوئی اور ہندوستان میں اوندھے منھ ہو کر بالکل لیٹ جانے کی۔ ﴿وَ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴾ [سورۃ الروم:۳۲ ہر گروہ [کے لوگ] جو ان کے پاس ہے اس پر مگن ہیں]۔

(۶) مندرجہ ذیل عبارت پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں نہیں ہے:
"تیرھویں صدی میں... تین اصول پر رکھی گئی تھی۔"

(۷) أخرج ابن أبي حاتم وابن مردويه عن ابن عباس قال: إنّ الرجل ليفسر الآية يرى أنها كذلك فيهوي أبعد ما بين السماء والأرض، ثم تلا ﴿ولبثوا في كهفهم﴾، ثم قال: كم لبث القوم؟ قالوا: ثلاث مئة وتسع سنين. قال: لو كانوا لبثوا كذلك لم يقل الله ﴿قل الله أعلم بما لبثوا﴾ ولكنه حكى مقالة القوم فقال ﴿سيقولون ثلاثة﴾ إلى قوله ﴿رجما بالغيب﴾ فأخبر انهم لايعلمون. ثم قال: سيقولون ﴿ولبثوا في كهفهم ثلاث مائة سنين وازدادوا تسعا﴾ (فتح القدير - للشوكاني، ص ۲۷۰ ج۳، مصر سنه ۱۳۵۰ھ)

اس سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ جو لوگ اس آیت کو قرآن کی تصریح قرار دیتے تھے حضرت ابن عباس کے نزدیک وہ سخت غلطی میں تھے اور حقیقت سے بالکل دور ہو گئے تھے۔

(۸) أخرجه ابن جرير عن قتادة في حرف ابن مسعود وقالوا ﴿ولبثوا في كهفهم﴾ يعني إنما قاله الناس، ألا ترى أنه قال ﴿قل الله أعلم بما لبثوا﴾ (فتح القدير).

(۹)
- The Paradise or Garden of the Holy Fathers, By E.A.W.Budge.
- The Evolultion of the Monastic Ideal By H. Workman.
- Five Centuries of Religion, By G. G. Coulton.
- The Medieval Mind, By H.Q. Taylor

لغات القرآن، مولانا عبدالرشید نعمانی، جلد اوّل، ص ۱۴۰۔۱۴۸

اصحاب الکہف والرقیم

غار و رقیم والے: ان لوگوں کا قصہ قرآن مجید۔ سورہ کہف... میں تفصیل سے مذکور ہے۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ اصحاب اصحابِ الکہف اور لوگ ہیں اور اصحابِ الرقیم اور لوگ۔ ان علماء کے خیال میں اصحابِ الرقیم کا قصہ قرآن مجید میں مذکور نہیں، بلکہ محض عجیب ہونے کے لحاظ سے اصحاب الکہف کے تذکرے میں ان کا حوالہ دے دیا گیا۔ پھر اس خیال کے قائلین کے بھی دو فریق ہیں۔ ایک جماعت کا خیال ہے کہ چوں کہ ان کا قصہ بھی اصحاب الکہف سے ملتا جلتا تھا، اس لیے صرف اصحاب الکہف کے ذکر پر ہی اکتفاء کیا گیا، چنانچہ سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ اس جماعت کا حال بھی اصحاب الکہف کا سا ہوا۔ ضحاک کہتے ہیں کہ رقیم، روم کا ایک شہر ہے، جہاں اصحاب الکہف کی طرح ایک غار کے اندر اکیس انسان مردہ پڑے ہوئے سو رہے ہیں[۱]۔ دوسرے فریق کی رائے میں، اصحاب الرقیم وہی اصحاب الغار ہیں جن کا قصہ صحیحین میں مذکور ہے کہ اگلے زمانے میں تین شخص چلے جا رہے تھے کہ بارش نے ان کو آلیا اور یہ بھاگ کر ایک غار میں پناہ گزیں ہوئے، اوپر سے ایک بڑا پتھر آپڑا، جس سے غار کا منھ بند ہو گیا، اس وقت ان میں سے ایک شخص نے اپنی عمر بھر کے بہترین عمل کا حوالہ دے کر، اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور ہر ایک کی دعا سے پتھر کا ایک تہائی حصہ غار کے منھ سے ہٹتا گیا، یہاں تک کہ ادھر تیسرے کی دعا ختم ہوئی اور ادھر غار کا دہانہ بالکل وا ہو چکا تھا۔

بزّار اور طبرانی نے باسنادِ حسن، نعمان بن بشیر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے رقیم کا ذکر فرماتے ہوئے اس قصہ کو سنا تھا[۲] لیکن اس سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے رقیم کا ذکر کرتے ہوئے اصحاب الغار کے قصے کو بیان فرمایا۔ اس میں یہ تصریح نہیں ہے کہ رقیم سے مراد، غار ہی ہے۔ قرآن

مجید سے جو ظاہر معلوم ہوتا ہے، وہ یہی ہے کہ اصحاب الکہف والرقیم سے ایک ہی جماعت مراد ہے اور یہی جمہور علماء کی رائے ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ "الرقیم" فی الحقیقت ایک شہر کا نام تھا، جہاں یہ واقعہ پیش آیا۔ یاقوت حموی، معجم البلدان میں رقمطراز ہیں:۔ و بقرب البلقاء من أطراف الشام موضع، يقال له الرقيم، يزعم بعضهم أن به أهل الكهف [3] اطراف شام میں بلقاء کے قریب ایک مقام ہے جس کو رقیم کہا جاتا ہے۔ بعض علماء [؟] کا خیال ہے کہ وہیں اصحابِ کہف ہیں۔

چوں کہ کہف یعنی غار، اسی رقیم میں واقع تھا، اس لیے قرآن مجید نے ان کو اصحاب الکہف والرقیم کے نام سے ذکر کیا۔ مصنّف عبدالرزاق میں بسندِ صحیح، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت، کعب سے موجود ہے کہ وہ اس کو ایک شہر کا نام بتاتے تھے[4]۔ خود حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بھی، ایک روایت میں یہی مروی ہے، وہب[5] اور سدّی[6] کی بھی یہی تصریح ہے۔ عیسائیت کی ابتدائی چند صدیوں میں، بارہا ایسا ہوا ہے کہ بہت سے راسخ الاعتقاد عیسائی، مخالفوں کے ظلم وستم سے تنگ آکر پہاڑوں کے غاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے اور آبادیوں سے روپوش ہوکر، انہوں نے اپنی زندگی کے بقیہ دن وہیں گزار دیے اور پھر ایک عرصے کے بعد ان کی نعشیں برآمد ہوئیں، چنانچہ ایک واقعہ اطرافِ اندلس میں گزرا ہے، ایک روم کی طرف منسوب ہے اور ایک افسوس یا طرسوس کا بیان کیا جاتا ہے۔ اصحاب الکہف کے شہر کے تعیّن میں بھی، مفسّرین نے متعدد نام لیے ہیں۔ یاقوت رومی نے معجم البلدان میں تصریح کی ہے کہ صحیح یہی ہے کہ یہ بلادِ روم کا واقعہ ہے[7]۔ ابنِ کثیر نے بھی البداية والنهاية میں اسی طرف، رجحان ظاہر کیا ہے[8]۔ ابوحیان اندلسی کے نزدیک اصحاب الکہف کا اندلس میں ہونا زیادہ راجح ہے[9]۔ لیکن قرآن مجید نے "الکہف" کے ساتھ الرقیم کا بھی اضافہ فرمایا ہے جو اس امر کی صاف تصریح ہے کہ یہ واقعہ نہ روم کا ہے، نہ اندلس کا، نہ افسوس کا، نہ طرسوس کا، بلکہ الرقیم کا ہے، چنانچہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما، کعبِ احبار، وہب بن منبّہ اور سدّی کی تصریح، آپ کی نظر سے گزری کہ وہ اس کو ایک شہر کا ہی نام بتاتے ہیں۔ عطیہ، عوفی، قتادۃ [اور] ضحّاک، اس کو اس

وادی کا نام بتاتے ہیں، جس میں یہ کہف (غار) تھا۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے بھی ایک روایت میں یہی تصریح منقول ہے[10]۔ ظاہر ہے کہ شہر اور اس کے اطراف واکناف کی وادی ایک ہی نام سے موسوم ہوں گے، اس لیے ان دونوں بیانات میں کوئی تعارض نہیں، شہر اور اس شہر کی مناسبت سے، اس کی وادی کو بھی الرقیم ہی کہا گیا، چوں کہ اس نام کا کوئی شہر، عام طور پر مشہور نہ تھا اور جیسا کہ ہم نے سابق میں تصریح کی، نصرانیت نے اپنے ابتدائی قرنوں ہی میں ریاضت اور گوشہ نشینی کی ایک خاص زندگی پیدا کردی تھی، جس نے آگے چل کر رہبانیت کی شکل اختیار کی۔ اس زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ لوگ دنیا کے تمام تعلقات سے منہ موڑ کر کسی پہاڑ کے غار میں یا کسی غیر آباد مقام پر گوشہ گیر ہوجاتے اور پھر ان پر استغراقِ عبادت کی ایسی کیفیت طاری ہوجاتی کہ وضع و نشست کی جو ہیئت اختیار کرلیتے، زندگی کے آخری سانس تک اسی ہیئت پر قائم رہتے اور مرنے کے بعد بھی، اسی حالت پر نظر آتے، نہ زندگی میں کوئی ان کو چھیڑتا اور نہ مرنے کے بعد کوئی اس کی جرأت کرتا، اس لیے اگر موسم موافق ہوتا اور درندوں سے حفاظت حاصل ہوتی، تو مدت تک ان کی نعشیں اسی حالت پر باقی رہتی تھیں، جس حالت میں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری سانس لیے تھے اور صدیوں تک ان کے ڈھانچے اسی وضع و ہیئت پر محفوظ رہتے کہ دور سے دیکھنے والا، ان کو زندہ انسان ہی تصور کرتا، چوں کہ اس قسم کی نعشیں متعدد جگہ برآمد ہوئیں، اس لیے ان علماء کو اصحاب الکہف کے شہر اور مقام کے تعیّن میں سخت دھوکہ ہوا۔

اصحاب الکہف کا زمانہ قبلِ مسیح تھا یا بعدِ مسیح، اس کے متعلق حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں:۔

بیان کیا گیا ہے کہ اصحاب الکہف، حضرت مسیح عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کے مذہب پر تھے، یوں تو خدا ہی بہتر جانتا ہے، مگر ظاہر یہ ہے کہ وہ بالکلیہ ملّتِ نصرانیّت سے پہلے ہوئے ہیں، کیوں کہ اگر وہ دینِ نصرانیت پر ہوتے تو احبارِ یہود اپنی اس مخالفت کی بنا پر، جو ان کو عیسائیوں سے تھی، اصحاب الکہف کی خبر اور ان کے حالات کو محفوظ رکھنے کی طرف

اعتناء نہ کرتے، حالاں کہ سابق میں حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کی روایت گزر چکی کہ قریش نے مدینہ میں احبارِ یہود کے پاس، اپنے کچھ لوگ، اس غرض سے بھیجے تھے کہ وہ ان سے چند ایسی باتیں معلوم کرلیں، جن سے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا، وہ امتحان لے سکیں۔ احبار نے یہ کہلا بھیجا کہ وہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے اصحاب الکہف کے حالات، ذوالقرنین کی خبر اور روح کے متعلق سوال کریں۔ اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ اصحاب الکہف کا حال، کتبِ اہلِ کتاب میں محفوظ تھا اور نیز یہ کہ ان کا واقعہ، مذہب نصرانیت سے پہلے ہوا ہے۔ واللہ أعلم۔[11]

اصحاب الکہف کی تعداد کیا تھی اور وہ کتنے تھے؟

اس کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے: ﴿سَيَقُولُونَ ثَلَاثَةٌ، رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ، وَ يَقُولُونَ خَمْسَةٌ، سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ، رَجْماً بِالْغَيْبِ، وَ يَقُولُونَ سَبْعَةٌ، وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ، قُل رَّبِّيْ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم، مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيلٌ، فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ اِلَّا مِرَاءً ظَاهِراً، وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيهِم مِّنْهُمْ اَحَداً﴾: کچھ لوگ کہیں گے، وہ تین ہیں، چوتھا ان کا کتا اور کچھ کہیں گے، وہ پانچ ہیں، چھٹا ان کا کتا، یہ سب اندھیرے میں تیر چلاتے ہیں، بعض کہتے ہیں، وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا، (اے پیغمبر) کہہ دے، ان کی گنتی میرا پروردگار ہی خوب جانتا ہے، ان کا حال، بہت کم لوگوں کو معلوم ہے، تو اس بارے میں بحث و نزاع نہ کر، مگر اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے، اس بارے میں کچھ دریافت کر۔

اصحاب الکہف کی تعداد کے سلسلے میں لوگوں کے اختلاف کو بیان کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ نے تین اقوال نقل فرمائے ہیں، اس سے پتا چلا کہ ان تین اقوال کے علاوہ اور کوئی چوتھا قول نہیں۔ پہلے دو اقوال کو رجماً بالغیب (انکل پچو) فرمایا، تیسرے کے متعلق سکوت اختیار کیا۔ پہلے دونوں جملوں میں واوِ عطف نہ تھا تیسرے جملے میں ﴿وَ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ عطف کے ساتھ کہنا، اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہی تعداد حقیقت میں صحیح

ہے۔ اور یہ جو فرمایا کہ ﴿قُلْ رَّبِّيْ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِم﴾ (کہہ دے، ان کی گنتی میرا پروردگار ہی خوب جانتا ہے) سو یہ، اس طرف اشارہ ہے کہ ایسے مقامات پر، علم کو اللہ ہی کے حوالے کرنا، زیادہ مناسب ہے کیوں کہ بغیر علم، اس قسم کی باتوں میں غور خوض کرنا، فضول ہے۔ ہاں، جب کسی چیز کے متعلق پوری اطلاع ہو تو اس کو زبان سے نکالنا چاہیے، ورنہ توقف کرنا، بہتر ہے، خود قرآن مجید کی تصریح ہے ﴿مَا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيلٌ﴾ (ان کی خبر نہیں رکھتے، مگر تھوڑے لوگ)۔

طبرانی نے معجم اوسط[12] میں اور ابنِ جریر طبری نے اپنی تفسیر میں باسانید صحیحہ[13]، حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ میں بھی ان ہی تھوڑے لوگوں میں سے ہوں، جن کو اللہ تعالیٰ نے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ اصحاب الکہف کی تعداد سات تھی، ابنِ ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا بعینہٖ یہی بیان نقل کیا ہے[14]۔

اصحابِ الکہف کے نام کیا تھے؟

اس کے متعلق حافظ ابوحیّان اندلسی رقمطراز ہیں:

و أمّا أسماء فتية أهل الكهف فأعجمية، لا تنضبط بشكل و لا نقط و السند في معرفتها ضعيف[15] نوجوانانِ اصحاب الکہف کے نام عجمی [أعجمي کا ترجمہ عجمی مناسب نہیں، اعجمی کا مطلب غیر واضح ہوتا ہے اور عجمی غیر عرب یا غیر عربی کو کہتے ہیں] ہیں نہ وہ اعراب کے ذریعہ منضبط ہوتے ہیں، نہ نقطوں کے ذریعے، نیز ان کی معرفت کی سند بھی ضعیف ہے۔ حافظ ابنِ کثیر کا بھی یہی فیصلہ ہے: و في تسميتهم بهذه الأسماء واسم كلبهم نظر في صحته.[16] اصحاب الکہف کے جو نام بتائے جاتے ہیں، ان سے، ان کے موسوم ہونے میں اور نیز ان کے کتے کے نام کی صحت میں بحث ہے۔

اصحاب الکہف غار میں کتنی مدّت تک رہے؟

اس کے متعلق قرآن مجید میں مرقوم ہے: ﴿وَ لَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ

سِنِیْنَ، وَ ازْدَادُوْا تِسْعاً، قُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا، لَہٗ غَیْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾:
اور مدّت گزری ان پر اپنی کھوہ میں، تین سو برس اور ان کے اوپر نو۔ تو کہہ دے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت تک رہے، وہ آسمان و زمین کی ساری پوشیدہ باتیں جانتا ہے۔ لیکن اس کے متعلق بعض علماء کی رائے ہے کہ جس طرح قرآن مجید نے پہلے اصحاب الکہف کی تعداد کے بارے میں، لوگوں کے متعدد اقوال نقل کیے تھے۔ اسی طرح یہاں بھی، مدتِ بقاء کے بارے میں لوگوں کا قول نقل کیا ہے، یعنی لوگ کہتے ہیں: غار میں تین سو برس تک رہے اور بعضوں نے اس پر نو برس اور بڑھا دیے، تم کہہ دو، اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ فی الحقیقت کتنی مدت گزر چکی ہے۔ پس ان علماء کے خیال میں یہ، قرآن کی تصریح نہیں بلکہ دگوں کا قول ہے اور ''سیقولون'' سے نقلِ اقوال کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا، اسی سلسلے کی، یہ آخری کڑی ہے۔ سلف میں قتادہ اور مطرّف بن عبداللہ کی یہی رائے ہے[۱۷]۔

ابنِ ابی حاتم اور ابنِ مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ انسان کسی آیت کی تفسیر یہ سمجھ کر، کرنے لگتا ہے کہ وہ ٹھیک ہوگی، حالاں کہ وہ زمین و آسمان کے درمیان نہایت دور جا کے گرتا ہے، اس کے بعد یہ آیت تلاوت کی: ﴿وَ لَبِثُوْا فِیْ کَھْفِھِمْ﴾ الآیہ، پھر دریافت کرنے لگے کہ یہ لوگ کتنے عرصے رہے؟، لوگوں نے جواب دیا: تین سو نو برس۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اتنی مدت تک رہے ہوتے تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا: ﴿قُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا مقولہ نقل کیا ہے، چنانچہ ﴿سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَۃٌ رَّابِعُھُمْ کَلْبُھُمْ، وَ یَقُوْلُوْنَ خَمْسَۃٌ سَادِسُھُمْ کَلْبُھُمْ، رَجْماً بِالْغَیْبِ﴾ فرما کر، ان کی لاعلمی کی خبر دی اور پھر فرمایا کہ وہ یہ بھی کہیں گے: ﴿وَلَبِثُوْا فِیْ کَھْفِھِمْ ثَلٰثَ مِائَۃٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعاً﴾۔

علامہ محمود آلوسی، اپنی مشہور تفسیر روح المعانی میں اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

و لعل هذا لا يصحّ عن الحبر رضي الله تعالىٰ عنه، فقد صحّ عنه القول بأنّ عدّة أصحاب الكهف سبعة و ثامنهم كلبهم، مع أنّه تعالىٰ عقّب القول بذلك بقوله سبحانه: ﴿ قل ربي أعلم بعدّتهم﴾ و لا فرق بينه و بين قوله تعالىٰ:

﴿قُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ فلم دلّ هذا على الردّ و لم يدلّ ذلك[۱۸]۔ غالباً حبرِ امت عبداللہ بن عبّاس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے یہ روایت صحیح نہیں، کیوں کہ ان سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اصحاب الکہف کی تعداد سات ہے اور آٹھواں ان کا کتا تھا، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے اس قول کو بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا: ﴿قل ربي اعلم بعدتهم﴾ اور اس میں اور ﴿قل الله أعلم بما لبثوا﴾ کے فرمانے میں کوئی فرق نہیں، پس ﴿قل الله أعلم بما لبثوا﴾ سے تردید کیوں کر ثابت ہوئی اور اس سے کیوں ثابت نہیں ہوئی۔

عبدالرزاق، ابنِ جریر، ابن المنذر [اور] ابنِ ابی حاتم نے قتادہ کا بیان نقل کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت میں ''قالوا'' کا لفظ آیا ہے، یعنی انہوں نے اس آیت کی قراءت اس طرح کی ہے: وَ قَالُوْا ﴿وَ لَبِثُوْا فِیْ کَھْفِھِمْ﴾ اس کے صاف یہ معنی ہیں کہ یہ لوگوں کا مقولہ ہے۔ قتادہؒ کہتے ہیں تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ہی فرمایا: ﴿قُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾[۱۹]۔ حافظ ابنِ کثیر اس روایت کے بارے میں فرماتے ہیں: و رواية قتادة قرائة ابن مسعود منقطعة، ثم هي شاذّة بالنسبة إلى قراء ة الجمهور، فلاّ يحتجّ بها[۲۰] ابنِ مسعود کی قراءت کے متعلق قتادہ کی روایت منقطع ہے، نیز یہ قراءت، جمہور کے لحاظ سے شاذ بھی ہے، لہٰذا اس سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں کہ ابنِ مسعود کی قراءت سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں کا قول ہے جو اصحاب الکہف کے معاملے میں بحث کر رہے تھے، رہا اس کے بعد، اللہ تعالیٰ کا فرمانا: ﴿قُلِ اللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ اصحاب الکہف کی تعداد کے بارے میں تیسرے قول کو بیان کر کے فرمایا، اس سے اس قول کی تردید کا پتا نہیں چلتا ہے[۲۱]۔

غرض اکثر مفسّرین اسی کے قائل ہیں کہ اصحاب الکہف کے غار میں رہنے کی یہ تین سو نو برس کی مدت، خود اللہ تعالیٰ کی بیان کی ہوئی ہے۔ امامِ بغوی لکھتے ہیں: ۔هذا إخبار من الله تعالىٰ عن قدر لبثهم في الكهف هو الأصح[۲۲] کہف میں ان لوگوں کے ٹھہرے رہنے کے متعلق، یہ اللہ تعالیٰ نے خبر دی ہے اور یہی اصح ہے۔ امام ابنِ جریر طبری

اور حافظ ابنِ کثیر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ ابنِ کثیر رقمطراز ہیں: و هذا الذي قلناه، عليه غير واحد من علماء التفسير كمجاهد و غير واحد من علماء السلف و الخلف ۲۳ ہم جس بات کے قائل ہیں، اسی پر اکثر علمائے تفسیر جیسے مجاہد اور اکثر علمائے سلف وخلف ہیں۔ خود حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے شانِ نزول میں جو روایت مروی ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے، چنانچہ ابنِ مردویہ نے بروایت ضحاک، حضرت ابنِ عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ جب یہ آیت اتری: ﴿وَ لَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ﴾ تو کہا گیا یارسول اللہ، یہ تین سو دن ہیں یا مہینے یا برس، اس پر اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ﴿سِنِينَ وَ ازْدَادُوا تِسْعًا﴾، ابنِ ابی شیبہ، ابنِ جریر، ابنِ منذر [اور] ابنِ ابی حاتم نے خود ضحاک سے بھی یہی نقل کیا ہے ۲۴۔

اصحاب الکہف کس طرح ایک دوسرے سے آکر ملے اور اکٹھے ہوئے اور پھر کس طرح وہ شہر سے باہر نکلے

اس کے بارے میں مختلف باتیں بیان کی جاتی ہیں، حافظ ابو حیان اندلسی فرماتے ہیں: و الرواة مختلفون في قصصهم، و كيف كان اجتماعهم و خروجهم و لم يأت في الحديث الصحيح كيفية ذلك و لا في القرآن إلّا ما قصّ تعالىٰ علينا من قصصهم ۲۵ ان کے قصوں کے بیان کرنے میں راوی مختلف ہیں کہ ان کا اجتماع کیوں کر ہوا، وہ کس طرح شہر سے باہر نکلے، اس کی کیفیت نہ تو کسی صحیح حدیث میں آئی ہے اور نہ قرآن میں بجز ان واقعات کے، جن کو اللہ تعالیٰ نے بیان کیا ہے، اور کچھ مذکور ہے۔

اسی طرح اصحاب الکہف کے دائیں بائیں کروٹ بدلوانے کی مدت میں بھی مختلف اقوال مذکور ہیں، بعض چھ ماہ، بعض ایک سال، بعض نو برس بتاتے ہیں، مگر امام رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں: هذه التقديرات لاسبيل للعقل إليها و لفظ القرآن لا يدلّ عليه، و ما جاء به خبر صحيح فكيف يعرف ۲۶ یہ مقداریں عقل سے نہیں معلوم کی

جاسکتیں، نہ قرآن کے الفاظ ان پر دلالت کرتے ہیں اور نہ کوئی صحیح حدیث اس کے متعلق موجود ہے، پس اس کا کیوں کر پتا چل سکتا ہے۔

اصحاب الکہف کے، اس مرتبہ جاگنے کے بعد، یہ پتا نہیں کہ اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی یا یہ زندہ رہے؟۔ وفات ہوئی تو کب ہوئی؟۔ زندہ رہے تو کب تک رہے یا کب تک رہیں گے؟۔ حافظ ابنِ کثیر، علامہ محمود آلوسی اور دیگر علماء کی بڑی جماعت کا رجحان اسی طرف ہے کہ اس واقعے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو وفات دے دی۔ واللہ اعلم۔

لغات القرآن کے مضمون میں مذکور حوالے

۱۔ البحر المحیط جلد ۶، صفحہ ۱۰۱، طبع مصر، ۱۳۲۸ھ
۲۔ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد ۷، صفحہ ۴۶۴
۳۔ معجم البلدان لیاقوت، جلد ۴، صفحہ ۲۷۴، طبع مصر ۱۳۲۴ھ
۴۔ تفسیر ابنِ کثیر جلد ۳ صفحہ ۷۴ طبع مصر ۱۳۵۶ھ
۵۔ حضرت ابنِ عباسؓ اور وہب کی تصریح حافظ ابو حیان اندلسی نے البحر المحیط جلد ۶ صفحہ ۱۰۱ میں ذکر کی ہے۔
۶۔ سدی کا قول تفسیر کبیر امامِ رازی جلد ۵ صفحہ ۴۶۳ اور تفسیر فتح القدیر شوکانی جلد ۳ صفحہ ۲۶۳ میں مذکور ہے۔
۷۔ معجم البلدان جلد ۴ صفحہ ۲۷۴۔
۸۔ البدایہ والنہایہ جلد ۲ صفحہ ۱۱۵ طبع مصر ۱۳۵۱ھ
۹۔ البحر المحیط جلد ۶، صفحہ ۱۰۲
۱۰۔ تفسیر ابنِ کثیر جلد ۳ صفحہ ۷۳
۱۱۔ تفسیر ابنِ کثیر جلد ۳ صفحہ ۷۴ طبع مصر ۱۳۵۶ھ
۱۲۔ تفسیر فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۲۷۰
۱۳۔ تفسیر ابن کثیر بر حاشیہ فتح البیان جلد ۶ ص ۱۳۱ طبع مصر ۱۳۰۱ھ
۱۴۔ تفسیر فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۲۷۰

۱۵۔ البحر المحیط جلد ۶، صفحہ ۱۰۱

۱۶۔ تفسیر ابن کثیر بر حاشیہ فتح البیان جلد ۶ ص ۱۳۱

۱۷۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۶ صفحہ ۱۳۳

۱۸۔ روح المعانی جلد ۱۵ ص ۲۳۳ طبع مصر

۱۹۔ تفسیر فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۲۷۰

۲۰۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۶ صفحہ ۱۳۳

۲۱۔ روح المعانی جلد ۱۵ ص ۲۳۳ طبع مصر

۲۲۔ معالم التنزیل جلد ۴ صفحہ ۱۶۹ طبع مصر

۲۳۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۶ صفحہ ۱۳۳

۲۴۔ تفسیر فتح القدیر جلد ۳ صفحہ ۲۷۱

۲۵۔ البحر المحیط جلد ۶، صفحہ ۱۰۱

۲۶۔ تفسیر کبیر جلد ۵ صفحہ ۴۷۳ طبع مصر ۱۳۲۴ھ

قصص القرآن، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، جلد سوم، ص ۲۴۲ تا ۲۶۹

کہف و رقیم:

لغت میں کہف پہاڑ کے اندر، وسیع غار کو کہتے ہیں، مگر رقیم کے معنی میں مفسّرین کو سخت تردّد ہے اور ضحّاک اور سُدّی جو، ہر ایک تفسیری روایت کو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب ضرور منسوب کر دیا کرتے ہیں، اِس مقام پر بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے متعدد اقوال نقل کرتے ہیں:

(۱) یہ رقم سے مشتق ہے اور رقیم بمعنی مرقوم (مکتوب) ہے، چوں کہ بادشاہ وقت نے ان کی تلاش کے بعد، اُن کے نام پتھر کی ایک تختی پر کندہ کر دیے تھے، اس لیے اُن کو اصحابِ رقیم بھی کہا جاتا ہے۔ سعید بن جبیر، اسی کی تائید میں ہیں اور مفسّرین کے یہاں یہی قول مشہور ہے۔

(۲) یہ وادی کا نام ہے، جہاں پہاڑ میں وہ غار تھا، جس میں اصحابِ کہف، روپوش ہوئے تھے۔ قتادہ، عطیّہ، عوفی اور مجاہد بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

(۳) یہ اُس پہاڑ کا نام ہے، جس میں غار تھا۔

(۴) عکرمہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو یہ کہتے سنا ''ما أدري، ما الرقیم؟، کتاب أم بنیان؟'' میں نہیں کہہ سکتا کہ رقیم سے کندہ تختی مراد ہے یا شہر [عمارت] مراد ہے۔

(۵) بروایت کعب احبار، وہب بن منبّہ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ یہ ایلہ (عقبہ) کے قریب ایک شہر کا نام ہے، یہ بلادِ روم میں واقع ہے۔

تاریخ اور اثری تحقیقات کے پیشِ نظر، یہ آخری قول ہی صحیح اور قرآنِ عزیز کے بیان کے مطابق ہے اور باقی اقوال محض قیاس وتخمین پر مبنی ہیں۔

اس اجمال کی تفصیل کے لیے تاریخ اور علم الآثار کے چند اوراق کا مطالعہ ضروری

ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ واقعہ، بعثتِ مسیح (علیہ السلام) سے کچھ زمانے بعد کا ہے اور انباط کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ انباط کون ہیں؟ اور اُن کا مسکن وموطن کہاں ہے؟ یہی وہ گتھی ہے جس کے سلجھ جانے پر حقیقت روشن ہو سکتی ہے۔

مؤرخینِ عرب، انباط کے متعلق عموماً، یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ عجمی النسل ہیں اور اسی لیے، وہ نبطی کو عربی کا مقابل قرار دیتے ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے اور عرب مؤرخین کے مختلف تاریخی مقولے اور توراۃ اور رومی و یونانی تاریخیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ نبطی خالص عربی اور اسماعیلی النسل ہیں، مگر بدویانہ زندگی ترک کر دینے اور حجاز سے نکل کر دوسرے علاقوں میں بس جانے کی وجہ سے، یہ عربوں کے لیے اجنبی ہوگئے حتیٰ کہ خود بھی یہ بھول گئے کہ عرب سے ان کو کیا نسبت ہے؟ اسی بنا پر حضرتِ فاروق اعظمؓ کا مشہور مقولہ ہے:

''تعلّموا النسب، و لا تكونوا كنبط السواد، إذا سئل عن أصله، قال من قرية كذا''۔

اپنے نسب کو سیکھو، عراق کے نبط کی طرح نہ بن جاؤ کہ جب ان میں سے کسی سے دریافت کیا جائے کہ تم کس خاندان سے ہو؟ تو جواب دیتے ہیں کہ ہم فلاں شہر کے ہیں۔

لیکن ''انباط'' کی بحث کو چھوڑ کر جب مؤرخینِ عرب سے دریافت کیا جائے کہ نبط یا نابت کون ہے؟ تو وہ بغیر کسی اختلاف کے فوراً یہ جواب دیں گے ''ابنِ اسماعیل علیہ السلام'' کیوں کہ حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے بارہ لڑکوں میں سے بڑے کا نام نابت یا نبط ہے، چنانچہ ابنِ کثیر اپنی تاریخ میں نابت کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''ثمّ جميع عرب الحجاز على اختلاف قبائلهم، يرجعون في أنسابهم إلى ولديه نابت وقيدار. و كان الرئيس بعده و القائم بالأمور، الحاكم في مكّة، و الناظر في أمر البيت و زمزم: نابت بن إسماعيل، و هو ابن أخت الجرهميّين، ثمّ تغلّب جرهم على البيت، طمعا في بني أختهم، فحكموا بمكّة و ما والاها، عوضا عن بني إسماعيل مدّة طويلة، فكان أوّل من صار إليه أمر البيت بعد نابت مضاض بن عمرو بن سعد بن الرقيب بن عبير بن نابت''۔

تمام حجازی عرب کے مختلف قبائل کا نسب حضرت اسماعیلؑ کے دو صاحب زادوں نابت اور قیدار پر ختم ہوتا ہے اور اسماعیل علیہ السلام کے بعد اُن کا جانشین نابت ہوا، وہی تمام امور کا والی، مکّہ کا حاکم، زمزم اور کعبے کا متولی قرار پایا اور یہ بنی جرہم کا بھانجا تھا، پس بنی جرہم اس تعلق کی وجہ سے اس کے بعد عرصے تک مکّہ پر حاکم و قابض رہے اور اطرافِ مکّہ پر بھی ان ہی کی حکومت رہی، مدّتِ دراز کے بعد نابت کی پانچویں پشت میں سے ایک شخص مضاض نے دوبارہ مکّہ کی حکومت اور بیت اللہ کی تولیت کو بنی جرہم کے قبضہ سے نکال کر اپنے ہاتھ میں لیا۔ (البدایہ والنہایہ، جلد۲)۔

مگر اس کے آگے عرب مؤرخین، عام طور پر اس بارے میں خاموش ہیں کہ جب نابت بن اسماعیل علیہ السلام کی نسل کثرت سے بڑھی تو کیا وہ صرف حجاز ہی کے اندر محدود رہی یا اطراف وجوانب میں پھیلی اور اگر اِدھر اُدھر گئی تو اس کا سلسلہ کہاں تک پھیلا، البتہ ابنِ خلدون نے اس سے متعلق معلومات میں کچھ اضافہ کیا ہے، وہ کہتا ہے:

''نابت بن اسماعیلؑ بیت اللہ کا متولی ہوا اور مکّہ میں اپنے بھائیوں کے ساتھ مقیم رہا تا آنکہ اس کی نسل نے اس درجہ ترقی کی کہ وہ مکّہ میں نہ سما سکے اور حجاز کے اطراف وجوانب تک میں پھیل گئے'' (البدایہ والنہایہ، جلد۲)۔

لیکن توراۃ نے اس سلسلے میں مختلف مقامات پر جو کچھ کہا ہے وہ اصل گتھی کو سلجھانے میں بہت زیادہ ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے۔ اس نے شروع میں تو حضرت اسماعیل (علیہ السلام) کے بارہ بیٹوں کی فہرست دی ہے اور اُس کے بعد اُس نے یہ بتایا کہ خاندانِ نابت ساعیر (کوہ سراط [اب الشراۃ لکھتے ہیں، سیّد سلیمان ندوی کے یہاں بھی الشراۃ ہی ہے]) یعنی حجاز سے شام کے علاقوں تک پھیلا ہوا ہے اور ایلہ (عقبہ) تک ان کا قبضہ ہے۔ توراۃ میں نابت کا تلفظ بھی مختلف طریقوں سے مذکور ہے کہیں نبیت ہے تو کہیں نبط اور کہیں نبایوط۔ توراۃ کے حوالہ جات یہ ہیں:

''یہ اسماعیلؑ کے بیٹوں کے نام ہیں، مطابق ان کے ناموں اور نسبتوں کی فہرست کے اسماعیل کا پہلوٹھا نبیت اور قیدار اور ادبئیل اور مبسام اور مسماع اور دومہ اور مسّا اور حدر

اور تیمہ اور اطور اور نفیس اور قدماہ"۔ (تکوین باب ۲۵ آیات ۱۳-۱۴)۔

یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی میں یروشلم کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

"اور قوموں کی دولت تیرے (یروشلم کے) پاس فراہم ہوگی، اونٹوں کی قطاریں اور مدیان اور عیفہ کی سانڈنیاں تیرے گرد آ کے جمع ہوں گی۔ وہ سب جو سبا کے ہیں، آئیں گے۔ قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی۔ نبیت کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے"۔ (باب ۲۱، [آیت] ۱۴) اور حزقیل نبی کے صحیفہ میں ہے:

"نبایوط (نابت) کی بھیڑیں نذر لی جائیں گی"۔ (باب ۲۵، [آیت] ۱۸)۔ اور سفرِ تکوین میں خاندانِ نابت کا علاقۂ سکونت یہ بتاتے ہیں:

"اور وہ حویلہ سے شور تک، جو مصر کے سامنے اس راہ میں ہے، جس سے آشور کو جاتے ہیں، بستے تھے، اُن کا قطعۂ زمین، ان کے سب بھائیوں کے سامنے پڑا تھا۔" (باب ۲۵، [آیت] ۱۸)۔

ان حوالہ جات کی تفصیل وتشریح کے لیے، اب اگر ان رومی مؤرخین کی شہادات بھی شامل کر لی جائیں، جو نبطیوں (انباط) کے معاصر ہیں تو یہ بات، بالکل ہی صاف ہو جاتی ہے کہ انباط اور بنو نابت بن اسماعیلؑ ایک ہی ہیں اور یہ کہ انہوں نے غیر متمدن زندگی کو چھوڑ کر متمدن زندگی اختیار کر لی تھی۔

یوسیفوس جو پہلی صدی عیسوی میں ہو گزرا ہے اور انباط کا معاصر بھی ہے لکھتا ہے:

"ملک، بحرِ احمر سے نہر فرات تک اسماعیلؑ کے بارہ بیٹوں کے قبضے میں ہے، جن کے سبب سے اُن کا نام نبوطینہ (Nabotena) پڑ گیا ہے۔ اس کی سرحد (مغرب میں) مصر اور عرب سنگستان (Petraea) [سے] مل گئی ہے اور بہت سے بیابانوں اور بلند و فراز زمینوں کو شامل ہے، جو مشرق کی طرف خلیجِ فارس تک منتہی ہوتی ہے، عموماً اس ملک کے باشندوں کا نام نبایوطِ عرب (Nabayot) ہے"۔ (ماخوذ از گولڈ کائس آف رین، ص ۲۲۵، انٹی ۱۲ (ارض القرآن، ج ۲)۔

اور ڈائڈروس ۸۰ ق م بیان کرتا ہے:

"انباط خلیجِ ایلہ (عقبہ) پر رہتے ہیں۔" (ارض القرآن، ج ۲، ص: ۶۱، ماخوذ از گولڈ کائس آف رین، ص: ۲۲۵، انٹی ۱۲)۔ اور دوسری جگہ لکھتا ہے:

"اوپر گزرتے ہوئے تم خلیج عقبہ (ایلہ) میں داخل ہوگے جس کے حدود پر ان عربوں کی بہت سی آبادیاں ہیں، جن کو لوگ نبط کہتے ہیں" (ایضاً، ج ۲، ص: ۶۰)۔

اور آثار اور کتبات میں نبط کا نام، سب سے پہلے ۷۰۰ ق م میں نظر آتا ہے، جب کہ آشور بنی پال شاہ اسیریا کے کتبے میں وہ اپنے مفتوحین کی فہرست میں ناتان شاہ نبط کا تذکرہ کرتا ہے۔ (ایضا، جلد ۲، ص: ۶۰)

اِن تمام تفاصیل کے مطالعے کے بعد، یہ حقیقت بالکل آشکارا ہو جاتی ہے کہ ایلہ (عقبہ) کی خلیج سے شام تک اور سواحلِ مصر سے خلیج فارس تک، جو قوم مسطورۂ بالا حوالہ جات میں برسرِ اقتدار نظر آتی ہے، وہ نابت بن اسماعیل ہی کی نسل ہے جو نبط، انباط، نبایوط اور نبیت کے ناموں سے پکاری جاتی رہی ہے۔

البتہ ایک بات طبیعت میں ضرور کھٹکتی ہے اور وہ، یہ کہ نابت بن اسماعیل (علیہ السلام) کی جس نسل سے توراۃ اور رومی مؤرخین اس تفصیل کے ساتھ واقف ہوں، وہ عرصۂ دراز کے بعد اپنے بھائیوں (اہلِ عرب) کی نگاہ میں کیوں اجنبی ہوگئی بلکہ خود نبطی، یہ کیوں بھول گئے کہ وہ خالص عربی النسل اور اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں، سو اس کے متعلق یاقوت حموی کے ایک جملے سے بآسانی جواب دیا جا سکتا ہے، یاقوت (عربہ) کے عنوان میں بحث کرتے ہوئے یہ بیان کرتا ہے:

أما النبط: فكل من لم يكن راعيا أو جنديًا، عند العرب من ساكن الأرضين "اہلِ عرب دنیا کے ہر اُس انسان کو نبطی کہہ دیتے ہیں جو چرواہا یا سپاہی نہ ہو"۔

اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ حجاز سے نکل کر مدّت مدید کے بعد چوں کہ نبطیوں نے بدویانہ، سپاہیانہ زندگی کو چھوڑ کر متمدن شہریوں کی زندگی اختیار کر لی تھی، اس لیے آہستہ آہستہ اہلِ عرب کی نگاہ میں بنی نابت اجنبی ہو گئے اور وہ ان کو بھی عجمی حکمرانوں کی طرح سمجھنے لگے، لہٰذا ان کے طریقِ بود و ماند، معاشرتی تمدن اور اختلافِ احوال نے [انہیں]

حجازیوں سے الگ کر کے ان ہی کے بھائیوں کی نگاہ پر، ان کے حجابی پردے ڈال دیے۔

مؤرخین کے نزدیک انباط کا رقبۂ حکومت تین مختلف العہد قوموں کے دائرۂ حکومت پر حاوی تھا یعنی:

(۱) ثمود کا ملک ''وادیٔ قریٰ''، اس کا دارالحکومت مشہور شہر حجر تھا

(۲) ملکِ مدین، اس کا دارالحکومت خود شہرِ مدین ہی تھا

(۳) ملکِ ادوم، اس کا دارالحکومت رقیم تھا۔

انباط کا زمانہ حکومت ۷۰۰ ق م سے شروع ہو کر ۱۰۶ء تک ختم ہو جاتا ہے۔ اوائلِ [پہلی] صدی عیسوی میں رومیوں نے ان پر لشکر کشی کر کے اور شکست دے کر رقیم اور اس کے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا اور انباط کے پاس صرف حجر کا علاقہ باقی رہ گیا تھا، جو ۱۰۶ء میں جب ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تو انباط کی حکومت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔ رومیوں نے رقیم پر قبضہ کرنے کے بعد جب اس کو اپنی تمدنی، سیاسی اور معاشرتی ترقیوں کا مرکز بنایا تو اس کا پرانا نام بدل کر پیٹرا رکھا۔

یہی وہ رقیم ہے جس کا ذکر اصحاب کہف کے واقعے میں قرآنِ عزیز نے کیا ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْکَهْفِ وَ الرَّقِیْمِ، کَانُوْا مِنْ اٰیٰتِنَا عَجَبًا﴾ اور یہی وہ شہر ہے، جس کے کچھ سعادت مند انسان، بت پرستی سے نفور [یعنی متنفر] ہو کر اور بت پرست حکمرانوں کے ظلم وجور سے محفوظ رہنے کی خاطر، اس شہر کے پہاڑوں کے ایک غار میں چھپ رہے تھے۔ پس حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کا یہ ارشاد کہ رقیم ''ایلہ'' کے قریب شہر تھا اور یہ کہ وہ روم کے علاقہ میں تھا، بالکل صحیح اور قرآن اور تاریخ دونوں کے عین مطابق ہے۔ بلاشبہ وہ، ایلہ (خلیج عقبہ) کے قریب واقع تھا اور چوں کہ رومیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا، اس لیے اُس کو روم کے علاقے میں شمار کرنا قطعاً درست ہے۔

مگر حیرت ہے اس تاریخی انقلاب پر کہ جب رومیوں نے انباط کے اس مرکزی شہر کا نام، پیٹرا رکھ دیا تو اس نام نے تھوڑے ہی دنوں میں، اس درجے شہرت حاصل کر لی کہ عرب اور عجم نے اس کے سینماؤں اور فنونِ لطیفہ کی نیرنگیوں سے متاثر ہو کر اس کا اصل نام

بالکل فراموش کر دیا اور ان کے لیے چند صدیوں ہی میں رقیم، ایک اجنبی اور غیر معلوم نام ہو گیا، حتیٰ کہ اہلِ عرب نے بھی اس کو بطرا ہی کے نام سے یاد رکھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ جب قرآن نے اس کا اصل نام، بیان کیا تو دوسروں کی طرح اہلِ عرب بھی حیران تھے کہ رقیم، غار کا نام ہے یا لوہے کی تختی کا، یا پہاڑ کا یا شہر کا، لیکن جس نام کو انباط کے بھائیوں (حجازیوں) نے بھلا دیا تھا، اس کو توراۃ نے اپنی سند میں محفوظ رکھا، تا کہ جب نبی امّی، وحی کے ذریعے اصل حقیقت کا اعلان کرے تو وہ اس کی تائید کے لیے خود کو پیش کر سکے۔

(توراۃ، سفرعدد اور صحیفۂ یسعیاہ میں، اس شہر کا نام ''راقیم'' بیان کیا گیا ہے، دائرۃ المعارف (عرب)۔

گزشتہ جنگِ عظیم کے بعد آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے جہاں اور بعض جدید انکشافات کیے ہیں، ان میں سب سے نمایاں، اسی شہر، رقیم (پیٹرا یا بطرا) کی دریافت ہے اور اس کے متعلق جس قدر اثری تحقیق کی جا رہی ہے، اس سے قرآنِ عزیز کی حرف بحرف تصدیق ہوتی جاتی ہے۔

خلیج عقبہ (ایلہ) سے شمال کی جانب بڑھتے ہوئے پہاڑوں کے دو متوازی سلسلے ملتے ہیں، ان ہی میں سے ایک پہاڑ کی بلندی پر انباط کا دارالحکومت رقیم آباد تھا۔

اِس شہر کی موجودہ زمانہ میں جو اثری پیمائش کی جا رہی ہے، اس میں نئے نئے انکشافات کے ساتھ، اس کے پہاڑوں کے عجیب وغریب ''غار'' بھی قابل ذکر ہیں۔ یہ غار بہت وسیع اور دور دور تک چلے گئے ہیں اور اس طرح واقع ہیں کہ دن کی دھوپ اور تپش، اُن تک نہیں پہنچتی، ایک غار ایسا بھی دریافت ہوا ہے کہ جس کے دہانے پر قدیم عمارتوں کے آثار پائے جاتے ہیں اور بہت سے ستونوں کے کھنڈر باقی رہ گئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کسی ہیکل کی عمارت ہے۔

اِس صاف اور بے لاگ اثری اور تاریخی شہادتوں کے بعد، یہ کہنا بہت آسان ہو جاتا ہے کہ قرآنِ عزیز نے جن اصحابِ کہف کا واقعہ بیان کیا ہے، وہ اسی شہر رقیم سے تعلق رکھتا ہے۔

واقعہ:

اسماعیلی عربوں کے مذہب سے متعلق تاریخ کے صفحات، یہ شہادت دیتے ہیں کہ ان میں گو کچھ عرصے، باپ دادا کا دینِ حق "ملتِ ابراہیم" باقی رہا، مگر آہستہ آہستہ مصر، شام اور عراق کے صنم پرستوں کے تعلقات نے عمرو بن لحی کے ذریعے، ان میں بت پرستی اور ستارہ پرستی کی داغ بیل ڈال دی اور کچھ عرصے بعد ان عربوں کو شرک پرستی میں، ایسا ید طولیٰ حاصل ہوگیا کہ وہ دوسروں کے لیے پیش رو بن گئے، چنانچہ نابت کی اولاد بھی شرک کی گمراہی میں مبتلا تھی اور ان کے مشہور بت ذوالشریٰ لات، منات، ہبل، کسعہ، عمیانس اور حریش تھے۔ (كتاب الأصنام [لابن الكلبي])۔

صدیوں تک نبطی، بت پرستی کی اسی گمراہی میں مبتلا رہے کہ مسیحی دور کے اوائل میں دارالحکومت رقیم کے اندر ایک عجیب معاملہ پیش آیا جس کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

مسیحی مذہب کا ابتدائی دور ہے، نبطی حکومت کے اطراف یعنی شام وغیرہ میں عیسائیت کا زور ہے کہ رقیم کی چند نوجوان سعید روحیں، شرک سے بیزار اور نفور [متنفر] ہوکر توحید کی جانب مائل ہوجاتی اور دینِ عیسوی کو قبول کرلیتی ہیں۔ شدہ شدہ یہ بات بادشاہِ وقت تک بھی پہنچ جاتی ہے۔ بادشاہ، نوجوانوں کو دربار میں بلانا اور انکشافِ حال چاہتا ہے، نوجوان کلمہ حق بلند کرنے میں بے باک اور جری ثابت ہوتے ہیں۔ یہ بات بادشاہ کو ناگوار گزرتی ہے مگر وہ، دوبارہ معاملے پر غور کرنے کے لیے، ان کو چند روز کی مہلت دیتا ہے۔ یہ دربار سے واپس آکر، آپس میں مشورہ کرتے ہیں اور طے پاتا ہے کہ خاموشی کے ساتھ کسی پہاڑ کے غار میں پوشیدہ ہوجانا چاہیے تاکہ مشرکوں کے شر سے محفوظ رہ کر، عبادتِ الٰہی میں مشغول رہ سکیں۔ یہ سوچ کر وہ، ایک غار میں پوشیدہ ہوجاتے ہیں، جب وہ غار میں داخل ہوجاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر نیند طاری کردیتا ہے اور وہ خواب ہی کی حالت میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔ غار کی عجیب کیفیت ہے، اندر سے بہت وسیع ہے مگر قدرت نے اس کو ایسا موقع [محلِ وقوع] نصیب کیا ہے کہ زندگی کے بقاء کے قدرتی

سامان وہاں سب موجود ہیں، ایک طرف دہانہ ہے تو دوسری جانب ہوا گزرنے کے منفذ اور سوراخ ہیں، جن کی وجہ سے ہر وقت تازہ ہوا اندر آتی جاتی رہتی ہے، غار شمال و جنوب رو یہ ہے، اس لیے طلوع وغروب کے وقت آفتاب کی تپش اندر نہیں پہنچ پاتی، مگر ہلکی ہلکی روشنی برابر پہنچتی رہتی ہے اور ایسی کیفیت پیدا ہوگئی ہے کہ نہ تاریکی ہی ہے کہ کچھ نظر نہ آئے اور نہ اتنی روشنی ہے کہ کھلے میدان کی طرح جگہ، روشن ہوجائے۔ اس حالت میں چند انسان اس غار میں خواب آلود ہیں اور ان کا رفیق کتا، اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار کے دہانے پر باہر کی جانب منھ کیے بیٹھا ہے۔

اس مجموعی صورتِ حال نے ایسی کیفیت پیدا کردی ہے کہ پہاڑوں کے درمیان غار کے اندر جھانکنے والے انسان پر خوف وہراس کی حالت طاری ہوجاتی ہے اور وہ بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور ہوجاتا ہے۔

برسوں تک، یہ نوجوان اسی حالت میں آرام کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں کہ شہر میں انقلاب ہوجاتا ہے، رومی عیسائی، نبطی حکومت پر حملہ آور ہوتے ہیں اور دشمن کو شکست دے کر، اس پر قابض ہوجاتے ہیں اور اس طرح رقیم (پیٹرا)، عیسائیت کے آغوش میں آجاتا ہے۔

اب خدا کی مشیّت فیصلہ کرتی ہے کہ یہ نوجوان بیدار ہوں، وہ بیدار ہوجاتے ہیں اور آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم کتنی مدّت سوتے رہے؟ ایک نے جواب دیا کہ ایک دن۔ اور دوسرے نے کہا یا دن کا بھی کچھ حصّہ، پھر کہنے لگے کہ ہم میں سے کوئی شہر جاکر کھانا لے آئے اور یہ سکّہ لے جائے، مگر جو بھی جائے، اِس طرح لین دین کرے کہ شہر والوں کو پتا نہ لگ سکے کہ ہم کون ہیں اور کہاں ہیں؟ ورنہ مصیبت آجائے گی۔ بادشاہ ظالم بھی ہے اور مشرک بھی، وہ یا تو شرک پر آمادہ اور بے دینی پر مجبور کرے گا اور یا ہم سب کو قتل کرڈالے گا اور یہ باتیں ہماری دین و دنیا کو برباد کردینے والی ثابت ہوں گی۔

اب نوجوانوں میں سے ایک شخص سکّہ لے کر شہر گیا، وہاں دیکھا تو حالات بالکل

بدل چکے ہیں، اور نئے آدمی اور نیا طور وطریقہ نظر آرہا ہے، مگر پھر بھی وہ ڈرتے ڈرتے، ایک باورچی کی دوکان پر پہنچا اور کھانے پینے کی چیزیں خریدیں، جب قیمت ادا کرنے لگا تو باورچی نے دیکھا کہ سکّہ قدیم ہے۔ اس طرح آخر بات کھل گئی، لوگوں کو جب اصل حقیقت معلوم ہوئی تو انہوں نے اس شخص کا خیر مقدم کیا اور اس عجیب وغریب معاملے سے بہت زیادہ دلچسپی لی، کیوں کہ عرصہ ہوا کہ یہاں مشرک بادشاہوں کا دور ختم ہو چکا تھا اور یہاں کے باشندوں نے عیسائیت قبول کرلی تھی۔

اس شخص نے جب یہ حال دیکھا تو اگرچہ عیسائیت پھیل جانے سے، اس کو بے حد خوشی ہوئی مگر اپنے اور اپنے رفیقوں کے لیے، یہی پسند کیا کہ [باقی زندگی] دنیا کے ہنگاموں سے علاحدہ رہ کر، یادِ خدا میں گزاردیں، اس لیے کسی طرح مجمع سے جان بچاکر، پہاڑ کی راہ لی اور اپنے رفقاء میں پہنچ کر سب حال کہہ سنایا۔

اُدھر شہریوں میں، ان کی جستجو کا شوق پیدا ہوا اور انہوں نے آخر، ان کو ایک غار میں پالیا، لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ شہر چلیں اور اپنی پاک زندگی سے اہلِ شہر کو فائدہ پہنچائیں مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے اور انہوں نے اپنی عمر کا باقی حصّہ راہبانہ زندگی کے ساتھ اسی غار میں گزاردیا۔

جب ان مردانِ خدا راہبوں کا انتقال ہوگیا تو اب لوگوں میں چرچا ہوا کہ ان کی یادگار قائم ہونی چاہیے، چنانچہ ان میں جو حضرات ذی اثر اور با اقتدار تھے، انہوں نے کہا کہ ہم تو ان کے غار پر ہیکل (مسجد) تعمیر کریں گے اور غار کے دہانے پر ایک عظیم الشان ہیکل تعمیر کرادیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی روایت میں ہے کہ جب اس جوان کے پیچھے بادشاہِ وقت اور پبلک دونوں آئے تو غار کے قریب پہنچ کر، وہ یہ نہ معلوم کر سکے کہ جوان کس جانب چلا گیا اور جب بہت جستجو کے بعد بھی اصحابِ کہف کا پتا نہ پاسکے، تب مجبور ہوکر واپس ہوگئے، اوران کی یادگار میں پہاڑ پر ایک ہیکل (مسجد) تعمیر کردیا۔
(فتح الباری، حدیثِ غار وتفسیر ابنِ کثیر ج ۲، سورۂ کہف، البدایہ والنہایہ، ج ۲)۔

واقعے کی تاریخی حیثیت

ابنِ کثیر کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عبّاس (رضی اللہ عنہما) اور دیگر بزرگوں کی نقول سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی بعثت سے کچھ زمانے بعد کا ہے، یعنی ابتدائے دورِ مسیحی کا واقعہ ہے مگر مجھ کو اِس قول میں یہ تردّد ہے کہ محمد بن اسحاق کی اس روایت سے، جو اس واقعے کے شانِ نزول سے متعلق ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ کہف کے بارے میں قریشِ مکّہ کو یہود نے تعلیم کیا تھا کہ وہ دوسرے سوالوں کے ساتھ ایک سوال یہ بھی کریں۔ یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ اس واقعے کے ساتھ یہود کو خاص دلچسپی تھی، پس اگر یہ واقعہ، عیسائیت کی ترقی سے متعلق تھا تو یہود کو اس کے ساتھ دلچسپی کے کیا معنی؟ کیوں کہ یہودیّت اور عیسائیت تو نبرد آزما اور حریف جماعتیں ہیں، اس سے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ، حضرتِ مسیح (علیہ السلام) سے بہت پہلے یہودی دور سے متعلق ہے۔ (تفسیرِ ابنِ کثیر ج ۳، سورۂ کہف، البدایہ والنہایہ، ج ۲)۔

ابنِ کثیر (رحمہ اللہ) کا یہ سوال اگرچہ اہمیت رکھتا ہے لیکن تاریخی سندات، اس کی تائید نہیں کرتیں بلکہ خلاف فیصلہ کرتی ہیں، اس لیے کہ یہ مسلّم ہے کہ واقعہ زیرِ بحث شہرِ رقیم میں پیش آیا ہے اور یہ بھی طے شدہ حقیقت ہے کہ "رقیم" اپنی آبادی کے وقت سے کبھی یہودیّت سے متاثر نہیں ہوا، بلکہ نبطی دور میں بت پرستی کا گہوارہ رہا اور اس کے بعد رومیوں نے جب اس پر قبضہ کرلیا تو وہ عیسائیت کی آغوش میں آگیا، چنانچہ رقیم کی تاریخ ان ہی دو عہدوں سے بنتی ہے تو پھر ایک خاص نکتے کے پیشِ نظر محض ظن وتخمین سے کس طرح اس واقعے کو یہودیّت سے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ اس بات کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مسیحی مذہب کے ابتدائی دور میں، اس قسم کے چند واقعات اور بھی پیش آئے ہیں جن میں مشرک اور بت پرست بادشاہوں کے خوف سے عیسائیوں نے غاروں اور پہاڑوں میں جاکر راہبانہ زندگی اختیار کی ہے، چنانچہ ایک واقعہ شہر اُفسُس میں پیش آیا، ایک اناطولیہ میں اور ایک خود روم میں پیش آچکا ہے، لہٰذا قرآنِ عزیز نے ایک ایسے ہی

واقعے کی خبر دی ہے جو شہرِ رقیم یا راقیم میں پیش آیا تھا۔

اِس بنا پر ابنِ اسحاق کی روایت کے متعلق دو باتوں میں سے ایک بات تسلیم کرنی چاہیے، اوّل یہ کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس روایت میں تین سوالات کا جوڑ کر دیا ہے، بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو سوالات تو صرف یہودی علما کے بنائے ہوئے تھے اور ان سے مشرکینِ مکّہ قطعاً نا آشنا تھے، مگر تیسرے سوال ''اصحاب کہف کا سوال''، سے متعلق خود قریشِ مکّہ کو بھی ایک حد تک علم تھا، اس لیے کہ یہ واقعہ، ان کے بہت قریب ہی پیش آیا تھا اور اگرچہ وہ، رقیم کو بھول گئے تھے لیکن پیٹرا (بطرا) سے وہ بخوبی واقف تھے اور شام کی تجارت کی وجہ سے نبطیوں کے ساتھ، اُن کا ہر وقت کا واسطہ تھا اور واقعہ بھی کچھ زیادہ طویل عرصے کا نہ تھا، پس ہوسکتا ہے کہ وہ اس واقعے کی کچھ معمولی باتیں جانتے ہوں اور چوں کہ اس کا تعلق اہلِ کتاب سے تھا، اس لیے قریشیوں نے آپ ﷺ کی صداقت کے امتحان کے لیے بہ مشورۂ یہود، اس کو بھی شامل کرلیا ہو اور چوں کہ سوالات بہر حال مشرکین ہی کی جانب سے کیے گئے، اس لیے حضرتِ ابنِ عباسؓ نے اختصار کے طور پر ان تینوں کو ایک ہی اسلوب سے نقل فرمادیا۔

یہ احتمال محض اندھیرے کا تیر نہیں ہے، بلکہ قرآنِ عزیز کے اسلوبِ بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیوں کہ زیرِ بحث تینوں سوالات میں سے پہلے اور دوسرے سوالوں کے متعلق، قرآن کا اسلوب بیان یہ ہے: ﴿يَسْأَلُونَكَ عَن ذِي الْقَرْنَيْنِ﴾ [اور] ﴿يَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ﴾ یعنی ان دونوں جگہ، سوال کی حیثیت کو نمایاں کیا ہے، مگر تیسرے مسئلے میں پیرایۂ بیان اس سے جدا، یہ اختیار کیا گیا ہے: ﴿أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا﴾۔ اس جگہ اگرچہ خطاب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ہے، لیکن مقصود وہی لوگ ہیں، جو سوال کر رہے ہیں اور اس واقعے کی کچھ حقیقت جاننے کی وجہ سے، اُسے ایک عجیب و غریب واقعہ سمجھتے اور نبی اکرم ﷺ سے مزید تفصیلات کے طالب ہیں، نیز اسی واقعے میں قرآن نے یہ بھی کہا ہے کہ جب آپ اِس واقعے کو تفصیل کے ساتھ، ان کو بتائیں گے تو آپ ان کی تعداد کے

بارے میں مختلف چرچے سنیں گے: ﴿سَيَقُولُونَ: ثَلَاثَةٌ﴾ [اور] ﴿يَقُولُونَ: خَمْسَةٌ﴾ یہ بھی ثبوت ہے اِس امر کا کہ قریشِ مکّہ، ضرور اس واقعے سے قدرے آگاہ تھے، اور اسی لیے ''الرقیم'' کہہ کر قرآن نے اِس جانب، ان کو توجہ دلائی کہ تم آج جس کا بطرا کہہ کر ذکر کرتے ہو، وہ دراصل تمہارے ہی بھائیوں کی حکومت کا مرکزی شہر ''رقیم'' ہے، جو تم سے فراموش ہوچکا ہے۔

دوسری بات یہ کہ حضرتِ موسیٰ (علیہ السلام) کے زمانے سے رومیوں کی فتوحاتِ رقیم وحجر تک، نبطیوں کے ہاتھوں یہودیوں کو ہر قسم کی تکالیف پیش آچکی اور ان کے ساتھ سیاسی و مذہبی حریفانہ نبرد آزمائیاں بھی ہوچکی تھیں (سفر عدد، باب ۲۰، آیات ۱۴۔۲۱، ویسعیاہ)۔

اس لیے اگرچہ اس واقعے میں عیسائیت کی صداقت کا ایک پہلو ضرور نکلتا تھا، تاہم نبطیوں کی مشرکانہ زندگی اور رومیوں کے ہاتھوں، ان کی تذلیل وتحقیر کا پہلو بھی کچھ کم نمایاں نہیں ہوتا تھا جو بہرحال اُن کی مسرت کا باعث تھا اور اِسی لیے غالباً یہود نے اس حیثیت کو نظر انداز کردیا اور دو سوالوں کے ساتھ، اس تیسرے سوال کو بھی خصوصیت کے ساتھ منتخب کیا۔

تفسیری حقائق:

(۱) ﴿أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحَابَ الْكَهْفِ وَ الرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ آيَاتِنَا عَجَبًا﴾

اے پیغمبر، کیا تو خیال کرتا ہے کہ غار اور رقیم [والے] ہماری نشانیوں میں سے عجیب نشانی تھے؟ یعنی جو لوگ، اس واقعے کو خدا کی نشانیوں میں سے بہت زیادہ نشانی سمجھ رہے ہیں تو اُن پر یہ ظاہر کردو کہ میرے خدا کے نشان، یوں تو کائناتِ انسانی کے لیے بلاشبہ عجیب ہیں لیکن اس کی قدرتِ کاملہ کے پیشِ نظر اس کے دوسرے نشانات کے مقابلے میں یہ کوئی عجیب وغریب نشان نہیں ہے، اس لیے کہ زمین و آسمان کی صناعی، سورج، چاند اور ستاروں کی تخلیق اور ان کا حیرت زا نظامِ کشش، نظامِ فلکی کی یہ بے نظیر ترتیب، انسان پر

وحیِ الٰہی کا نزول اور بظاہر اسباب حق کی کمزوری اور باطل کی قوت کے باوجود، حق کی فتح اور باطل کی شکست ایسے امور ہیں جو اس واقعے سے کہیں زیادہ تعجب خیز اور حیرت انگیز ہیں، پس جن لوگوں کو یہ واقعہ بادی النظر میں عجیب معلوم ہوتا ہے، وہ اگر قدرتِ حق کی مسطورہ بالا کار فرمائیوں پر نگاہِ حقیقت آگاہ سے غور کریں تو پھر ان کو بھی اقرار کرنا پڑے کہ بلاشبہ قدرتِ حق کے سامنے یہ واقعہ نہ عجیب ہے اور نہ حیرت انگیز، البتہ عبرت زا اور بصیرت افروز ضرور ہے۔ ﴿لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ﴾ [سورۃ التوبہ ۸۱، اگر وہ سمجھنا چاہیں]۔

(۲) امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں اصحابِ کہف پر بھی ایک باب معنون کیا ہے، مگر مسطورہ بالا واقعے سے متعلق مشہور حدیث، ان کی شرائط کے مطابق ثابت نہیں ہوئی، اس لیے انہوں نے سورہ کہف کی آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر، اس روایت کے ذریعے نہیں کی، البتہ انہوں نے بنی اسرائیل کے ایک دوسرے واقعے کے پیشِ نظر جو کہ ''حدیث الغار'' کے عنوان سے معنون ہے، یہ سمجھا ہے کہ ''اصحابِ کہف'' اور ''اصحابِ رقیم'' دو، الگ الگ شخصیتیں ہیں اور اصحابِ رقیم وہ حضرات ہیں جن کا ذکر ''حدیث الغار'' میں کیا گیا ہے، اسی بنا پر انہوں نے حدیثِ غار کو ''اصحاب الرقیم'' کی تفسیر میں نقل فرمایا ہے۔

حدیثِ غار کا واقعہ یہ ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگوں سے پہلے بنی اسرائیل میں سے تین شخص سفر کر رہے تھے، اثنائے راہ میں بارش آگئی، وہ تینوں پہاڑ کی کھوہ (غار) میں پناہ لینے کے لیے داخل ہوگئے۔ اتفاقاً پہاڑ کی اونچائی سے ایک بھاری پتھر لڑھک کر غار کے منہ پر آگرا، اور اس کو ڈھانپ لیا۔ یہ دیکھ کر تینوں نے ایک دوسرے سے کہا:

بھائی، اب اس ویرانے میں اس حادثے سے نجات کی، بظاہر اسباب تو کوئی صورت نظر نہیں آتی، البتہ اگر ہم میں سے ہر ایک شخص، اپنی زندگی کے کسی ایسے کام کا ذکر کرے جو اس نے ریاء و نمود سے خالی، صرف رضائے الٰہی کی خاطر کیا ہو رب العالمین کی درگاہ [؟ بارگاہ] میں دعا مانگے تو کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے نجات دے دے،

تب اُن میں سے ایک نے کہا:

خدایا، تجھ کو خوب معلوم ہے کہ میں نے ایک مرتبہ ایک مزدور سے چند سیر چاولوں پر مزدوری کرائی تھی، مگر کام کے بعد مزدور چلا گیا اور اُس کی اجرت میرے ذمے باقی رہ گئی۔ فصل پر جب میں نے چاول کی کاشت کی تو اس کا حصّہ بھی شامل کر لیا اور پیداوار پر اس کے حصے کے چاولوں سے ایک عمدہ بیل خرید لیا۔ اس عرصے میں مزدور آیا اور اس نے اپنی مزدوری کا مطالبہ کیا، میں نے بیل کی رسّی اس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ یہ تیری مزدوری کا حاصل ہے اور اس کو واقعہ سنایا، وہ بہت خوش ہوا، اور بیل کو لے گیا۔ پس اے خدا، اگر تیرے نزدیک میرا یہ عمل، صرف تیری خوشنودی اور حقوق العباد کی حفاظت پر مبنی تھا تو اس کی برکت سے ہماری اس مصیبت کو دور کر دے، چنانچہ اس کی دعا کا یہ اثر ہوا کہ بھاری چٹان نے حرکت کی اور غار کے منہ سے کچھ ہٹ گئی اور کشادگی پیدا ہوگئی۔

اب دوسرے نے کہا: خدایا تو دانا وبینا ہے کہ میرے والدین بہت ضعیف اور ناتواں تھے، اس لیے میرا یہ دستور تھا کہ اپنی بکریوں کا دودھ دوہ کر شام کو سب سے پہلے، اُن کو پلاتا اور بعد میں اپنے اہل وعیال کو شکم سیر کرتا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ مجھ کو جنگل میں دیر ہوگئی، دودھ لے کر گھر آیا تو والدین انتظار کر کے سو چکے تھے۔ اہل وعیال بھوک سے مضطرب اور بے تاب تھے اور دودھ کے خواہش مند، مگر میں نے کہا کہ جب تک والدین اُٹھ کر نہ پی لیں گے، کسی کو دودھ نہیں ملے گا اور والدین کی نیند خراب نہ ہو، اس لیے بیدار کرنا بھی نہیں چاہتا تھا اور تمام شب اسی طرح ان کے سرہانے دودھ لیے بیٹھا رہا کہ شاید درمیان میں بیدار ہوں اور بھوک ستائے، مگر وہ صبح کو ہی بیدار ہوئے، تب میں نے پہلے، ان کو دودھ پلایا اور جب وہ سیراب ہوگئے تو بعد میں، اہل وعیال کو دیا۔ پس اے خدا، اگر میرا یہ عمل، صرف تیری رضا اور طاعتِ والدین کے ادائے حق کے لیے تھا تو ہماری اس مصیبت کو ٹال دے۔ پتھر میں دوبارہ جنبش ہوئی اور چٹان اس درجے ہٹ گئی کہ سامنے آسمان نظر آنے لگا۔

اب تیسرے شخص کو نوبت تھی اس نے کہا: الٰہی! تو علیم وخبیر ہے کہ میں، اپنی چچازاد

بہن [؟ چچا کی لڑکی] پر عاشق تھا اور اس کے وصل کے لیے بے تاب، مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتی تھی، بمشکل تمام میں نے اس کو سو درہم دے کر ورغلایا اور عملِ بد پر آمادہ کر لیا، جب میں اس کے قریب ہوا، اور اور ہم دونوں کے درمیان کوئی حائل نہ رہا تو اس نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: بندۂ خدا! خدا کے خوف سے ڈر اور ناحق عصمت ریزی پر بے باک نہ بن۔ یہ سننا تھا کہ مجھ پر تیرا خوف غالب آیا اور میں اس سے الگ ہو گیا اور سو درہم بھی اسی کو بخش دیے، الٰہ العالمین، اگر میرا یہ عمل، خالص تیری رضا اور تیرے خوف کے پیشِ نظر تھا، تو ہماری اس آفت کو دور کر اور ہم کو اس سے نجات دے۔ اس کے بعد فوراً چٹان حرکت میں آئی اور غار کے دہانے پر سے لڑھک کے نیچے جا رہی اور وہ تینوں اسرائیلی، اِس مصیبت سے نجات پا کر مسرت وشادمانی کے ساتھ اپنی منزل پر روانہ ہو گئے۔

اِس روایت کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابنِ حجرؒ فرماتے ہیں کہ بزّار اور طبرانی نے سندِ حسن کے ساتھ نعمان بن بشیر سے یہی روایت نقل کی ہے اور اس میں یہ اضافہ ہے کہ نعمان فرماتے ہیں کہ میں نے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو رقیم کا ذکر کرتے ہوئے سنا۔ آپ غار میں بندرہ جانے والے تین آدمیوں کا واقعہ سنا رہے تھے، غالباً اسی بنا پر امامِ بخاریؒ نے رقیم کی تفسیر میں یہ ''حدیثِ غار'' روایت کی ہے۔ (فتح الباری، ج ۶، حدیث الغار)۔

لیکن اس تحقیق کے بعد جو گزشتہ سطور میں زیرِ بحث آچکی، جب کہ قرآن، بعض آثارِ صحابہ اور تاریخ سے یہ پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا کہ رقیم، اس شہر کا نام ہے، جس کے کسی پہاڑ کے غار میں اصحابِ کہف جا چھپے تھے تو اب مسندِ بزّار اور معجمِ طبرانی کی روایت کے مبہم الفاظ سے اصحابِ رقیم کو، اصحابِ کہف سے جدا سمجھنا صحیح نہیں ہے، خصوصاً جب کہ روایتِ نعمان میں یہ احتمال موجود ہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم اصحابِ رقیم کا ذکر فرما رہے ہوں اور اس کے ساتھ اس واقعے کا بھی ذکر فرمایا ہو اور بعد کو راوی نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہو کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے حدیث غار کا واقعہ، دراصل اصحابِ رقیم کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے، نیز جب کہ عربی زبان میں ''رقیم'' کے معنی ''غار'' کے کبھی نہیں آتے، نہ حقیقتاً نہ مجازاً، تو پھر یہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ ذاتِ اقدس صلّی اللہ علیہ وسلّم نے

''رقیم'' بمعنی ''غار'' کہہ کر حدیثِ غار کو اس کی تفسیر بتایا ہو، یہ راوی کا وہم ہے اور غالباً اسی لیے بزّار اور طبرانی کے علاوہ کسی نے بھی اس اضافے کو بیان نہیں کیا، حالاں کہ کتبِ حدیث میں یہ واقعہ بہ کثرت منقول ہے اور خود صحیح بخاری بھی اس اضافے سے خالی ہے، نیز اگر صحیح روایت سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ''الرقیم'' کی تفسیر صاف اور واضح الفاظ میں خود ارشاد فرما دی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ جلیل القدر مفسّرین اپنی اپنی تحقیق کے مطابق الرقیم کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل فرماتے! اور خود حافظ ابنِ حجر عسقلانی بھی یہ جرأت نہ کرتے کہ اس روایت کے خلاف یہ فرمائیں کہ صحیح اور صواب یہ ہے کہ اصحابِ کہف اور اصحابِ رقیم دونوں ایک ہی ہیں، چنانچہ یہ فرماتے ہیں:

و قال قوم أخبر الله عن قصة أصحاب الكهف، و لم يخبر عن عن قصة أصحاب الرقيم. (قلت): و ليس كذلك، بل السياق يقتضي أن أصحاب الكهف، هم أصحاب الرقيم (فتح الباری ج ۶، ص ۲۹۳)۔

اور ایک جماعت نے یہ کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحابِ کہف کا واقعہ تو ہم کو سنایا ہے مگر اصحابِ رقیم کا واقعہ نہیں بیان کیا (میں [یعنی حافظ ابن حجر] کہتا ہوں): یہ بات صحیح نہیں ہے، بلکہ قرآن کا سیاق یہ چاہتا ہے کہ اصحابِ کہف اور اصحابِ رقیم ایک ہی ہیں۔

(۳) ﴿فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِينَ عَدَدًا﴾

مولانا آزاد نے ''فضربنا علی الآذان'' کے معنی یہ بیان فرمائے ہیں ''صاف معنی تو یہ ہیں کہ ان کے کان، دنیا کی طرف سے بند ہو گئے تھے، یعنی دنیا کی صدا، ان تک پہنچتی تھی۔'' (ترجمان القرآن، ج ۲)

آیت کی تفسیر میں یہ قول ضعیف اور شاذ ہے (فتح الباری، ج ۶)۔ اس کے برعکس مفسّرین کے نزدیک مشہور تفسیر یہ ہے کہ ان پر نیند طاری ہو گئی تھی چوں کہ نیند کی حالت میں آدمی کوئی آواز نہیں سنتا، اس لیے اس حالت کو ''ضرب علی الآذان'' سے تعبیر کیا گیا، مگر اس تفسیر کے متعلق مولانا آزاد یہ فرماتے ہیں: ''اس تفسیر میں اشکال یہ ہے کہ عربی میں نیند کی حالت کے لیے ''ضرب علی الآذان'' کی تعبیر نہیں ملتی، لیکن وہ (مفسّرین)

کہتے ہیں، یہ ایک طرح کا استعارہ ہے۔ گہری نیند کی حالت کو ''ضرب علی الآذان'' کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے'' (ترجمان القرآن، ج ۲)۔

ہمارے نزدیک مفسّرین کی تفسیر ہی راجح ہے اور یہ استعارہ، ہر زبان کے محاورات میں پایا جاتا ہے، مثلاً جب ماں گود کے بچے کو لوریاں دے کر سلاتی ہے تو اس کے کان اور بازو پر ہاتھ رکھ کر تھپکتی جاتی ہے، اس لیے اردو زبان میں بھی ''کانوں کو تھپک دینا'' نیند طاری کردینے کے لیے بولا جاتا ہے، چنانچہ شیخ الہند (نوّر اللہ مرقدہ) نے اس جملے کا ترجمہ اسی طرح کیا ہے: پھر تھپک دیے ہم نے ان کے کان، اس کھوہ (غار) میں، چند برس گنتی کے۔ (ترجمہ حضرت مولانا محمود الحسن نوّر اللہ مرقدہ)۔

علاوہ ازیں عربی زبان میں ''ضرب علی أذنہ'' کے معنی ''منعہ أن یسمع'' کے آتے ہیں یعنی اس کو سننے سے روک دیا۔

اب سننے سے روک دینے کی متعدد صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کوئی شخص بستی سے دور، جنگل میں غار کی کھوہ میں جا بیٹھا اور اس لیے دنیا کی باتوں سے اس کے کان نا آشنا ہوگئے، دوسری یہ کہ وہ بہرا ہوگیا اور سننے سے معذور کردیا گیا۔ تیسری یہ کہ وہ سوگیا اور اس کے دیگر حواسِ ظاہرہ کی طرح کان بھی سننے سے معطل ہوگئے، لہٰذا ''ضرب علی الآذان'' کی تعبیر ان سب صورتوں کے لیے یکساں قابلِ استعمال ہے اور استعارہ وتشبیہ ہے تو تینوں معنی کے لیے ہے، البتہ مولانا آزاد کی تفسیر میں یہ اشکال ضرور لازم آتا ہے کہ اگر ''ضرب علی الآذان'' کے معنی یہ ہیں کہ اُن کے کان دنیا کی طرف سے بند ہوگئے تھے، یعنی وہ بحالتِ بیداری عام زندگی کے مطابق، بستی سے دور پہاڑ کی غار میں، راہبانہ زندگی بسر کر رہے تھے تو پھر اس آیت کے کیا معنی ہوں گے؟ ﴿وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَاءَلُوْا بَيْنَهُمْ، قَالَ قَائِلٌ مِّنْهُمْ: كَمْ لَبِثْتُمْ؟ قَالُوْا: لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ﴾ اور ہم نے ان کو اٹھایا کہ وہ آپس میں سوال کریں، ایک نے اُن میں سے کہا تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا: ایک دن یا دن کا کچھ حصہ''۔

کیا یہ آیت اپنے صاف معنی میں یہ ظاہر نہیں کرتی کہ ''ضرب علی الآذان'' کی

صاف تعبیر یہاں وہی ہے، جو جمہور مفسّرین کے نزدیک صحیح اور راجح ہے، بلکہ ایسے موقع پر ''بعثناھم'' کی تعبیر کا تقاضا تو یہ ہے کہ مفسّرین کی تفسیر کے علاوہ، دوسرے معنی لینا، قطعاً بے محل [ہوں]۔

اِس جگہ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن نے اصحابِ کہف کی اس گفتگو کے بعد جو وہاں سوئے رہنے کی مدّت سے متعلق ہے، ان کی یہ گفتگو بھی نقل کی ہے کہ ان میں سے کوئی شہر جائے اور پوشیدہ طور پر جائے کہ کسی کو خبر نہ ہونے پائے، یہ بھی جمہور کی تفسیر کو قوت پہنچاتی ہے، اس لیے کہ غار میں مدّتِ قیام پر بات چیت اور پھر فوراً کھانے کی خواہش کا اظہار، دونوں باتوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑیے تو صاف معنی وہی بنتے ہیں، جو مفسّرین نے بیان کیے ہیں اور مولانا آزاد کی یہ تفسیر کہ عرصۂ دراز کے بعد، ان کو شہر کی حالت معلوم کرنے کا خیال پیدا ہوا اور اس سلسلے میں ان کے درمیان یہ گفتگو ہوئی، تکلّف بارد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا آزاد کو شروع سے آخر تک اس واقعے کی تمام آیات میں تکلّفِ بارد اختیار کرنا پڑا ہے، مثلاً جب قرآن نے ان کی حالت بیان کرتے ہوئے یہ کہا: ﴿وَتَحْسَبُهُمْ اَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ﴾ تو ان کو گمان کرے گا کہ وہ بیدار ہیں، حالاں کہ وہ خواب میں ہیں، تو مولانا موصوف کو اپنی تفسیر کو صحیح بنانے کے لیے ''یقظۃ'' کے معنی زندہ اور ''رقد'' کے معنی مردہ کے اختیار کرنے پڑے ہیں، حالانکہ اُن کے حقیقی معنی ''بیداری'' اور ''نیند'' کے ہیں اور یہ معنی بلا تکلف یہاں صادق آتے ہیں، پس مولانا پر بھی وہی بات صادق آتی ہے جو انہوں نے مفسّرین کی مسلّمہ تفسیر پر لازم کی ہے، یعنی ''ففی الکلام تجوز بطریق الاستعارۃ'' (کلام میں استعارہ کی راہ سے مجاز اختیار کیا گیا ہے)۔

بلکہ اگر غائر نظر سے دیکھیے تو ''حقیقت کے صادق ہوتے ہوئے، مجاز اختیار کرنا'' مولانا آزاد کی تفسیر پر تو صادق آتا ہے لیکن جمہور مفسّرین پر صادق نہیں آتا۔

مولانا آزاد نے آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر میں، اگرچہ مفسّرین کے مختار قول کے خلاف ضعیف قول کو اپنا مختار بنایا ہے، تاہم مفسّرین کے اقوال کو احتمال کے درجے میں

تسلیم کرتے ہوئے، ان کی تائید میں جو جملے ارشاد فرمائے ہیں، وہ بلاشبہ ایسے حضرات کے لیے خصوصاً قابلِ مطالعہ ہیں، جو اس قسم کے واقعات کو محض تعجب خیز سمجھ کر، خلافِ عقل کہہ دینے کے عادی ہیں، فرماتے ہیں:

بہر حال، اگر یہاں ''ضرب علی الآذان'' سے مقصود، نیند کی حالت ہو تو پھر مطلب، یہ قرار پائے گا کہ وہ غیر معمولی مدّت تک نیند کی حالت میں پڑے رہے اور ﴿ثمّ بعثناھم﴾ کا مطلب یہ کرنا پڑے گا کہ اس کے بعد نیند سے بیدار ہو گئے۔

یہ بات کہ ایک آدمی پر غیر معمولی مدّت تک نیند کی حالت طاری رہے اور پھر بھی زندہ رہے، طبّی تجارب کے مسلّمات میں سے ہے اور اس کی مثالیں ہمیشہ تجربے میں آتی رہتی ہیں، پس اگر اصحابِ کہف پر قدرتِ الٰہی سے کوئی ایسی حالت طاری ہو گئی ہو، جس نے غیر معمولی مدّت تک انہیں سلائے رکھا تو یہ کوئی مستبعد بات نہیں۔'' (ترجمان القرآن، ج ۲)

(۴) ﴿ثُمَّ بَعَثْنَاھُمْ، لِنَعْلَمَ اَیُّ الحِزْبَیْنِ اَحْصیٰ لِمَا لَبِثُوْا اَمَدًا﴾ پھر ہم نے ان کو (خواب سے) اُٹھایا تا کہ معلوم کریں کہ دو جماعتوں میں سے کس نے، اِس مدّت کو محفوظ رکھا جس میں وہ (غار کے اندر) رہے۔

یہاں دو جماعتوں میں سے ایک اصحابِ کہف کی اور دوسری اہلِ شہر کی جماعت مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اس لیے کیا کہ صحیح مدّت ظاہر ہو جائے اور یہ معلوم کرنے کے بعد کہ خدائے تعالیٰ نے ان کو برسوں تک، بحالتِ خواب زندہ رکھا، جب کہ وہ زندگی کی بقاء کے وسائل سے یکسر محروم تھے، لوگوں کو یہ یقین ہو جائے کہ بلاشبہ اسی طرح، وہ مخلوق کو مرنے کے بعد بھی زندہ کرے گا اور بے شک قیامت اور بعث بعد الموت کا مسئلہ حق ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جب اُن کو بیدار کیا اور اُن میں سے ایک نوجوان، شہر میں کھانا خریدنے گیا تو اس زمانے میں بستی والوں کے درمیان ''بعث بعد الموت'' پر جھگڑا اور مناقشہ جاری تھا۔ ایک جماعت کہتی تھی کہ فقط روح کا بعث ہوگا اور دوسری جماعت قائل تھی کہ روح اور جسم دونوں کو زندہ ہونا ہے۔ یہ تو نصاریٰ کی جماعتیں تھیں اور جو نبطی مشرک آباد تھے، وہ سرے سے بعث بعد الموت ہی کے منکر تھے، ایسے نازک وقت میں

اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو غار سے، بیدار کر کے بھیجا اور اس طرح جب اصحابِ کہف کا واقعہ سب پر ظاہر ہو گیا تو اس نے علیٰ رؤس الاشہاد، یہ نظیر قائم کر دی کہ جس طرح برسوں تک، اسبابِ حیات سے محروم رہنے کے باوجود، روح کے ساتھ جسم بھی صحیح و سالم باقی رہا، اسی طرح ''بعث بعد الموت'' روح اور جسم دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور جس طرح سوتے رہنے کے بعد اصحابِ کہف بیدار کر دیے گئے، اسی طرح قبر (عالم برزخ) میں سینکڑوں اور ہزاروں برس مردہ رہنے کے بعد قیامت میں زندہ کر دیے جائیں گے۔ ﴿وَ کَذٰلِکَ اَعْثَرْنَا عَلَیْهِمْ، لِیَعْلَمُوْا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَیْبَ فِیْهَا، اِذْ یَتَنَازَعُوْنَ بَیْنَهُمْ اَمْرَهُمْ﴾ اور پھر (دیکھو) اسی طرح، یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے لوگوں کو، اُن کے حال سے واقف کر دیا (ان کی بات پوشیدہ نہ رہ سکی) اور اس لیے واقف کر دیا کہ لوگ جان لیں کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔ (تفسیر ابنِ کثیر، ج ۲، عن عکرمہ)

آیت کی یہ تفسیر، عکرمہ کی روایت سے ماخوذ ہے [مولانا حفظ الرحمٰن نے یہاں آیت کا ترجمہ صرف ﴿لا ریب فیها﴾ تک کیا ہے، باقی حصّہ چھوڑ دیا ہے؟] اور اسی کو عام طور پر اختیار کیا گیا ہے، لیکن مولانا آزاد نے ﴿لَا رَیْبَ فِیْهَا﴾ کو ﴿اِذْ یَتَنَازَعُوْنَ بَیْنَهُمْ اَمْرَهُمْ﴾ سے جدا کرتے ہوئے آیت کے معنی یہ کیے ہیں: ''اسی وقت کی بات ہے کہ لوگ آپس میں بحث کرنے لگے، ان لوگوں کے معاملے میں کیا کیا جائے، لوگوں نے کہا اس غار پر ایک عمارت بنا دو''۔ حضرت شاہ ولی اللہ نور اللہ (مرقدہ) نے بھی یہی ترجمہ کیا ہے:

''در آں وقتیکہ نزاع می کردند مردماں درمیانِ خود در مقدمہ ایشاں، پس گفتند عمارت کنید بر غارِ ایشاں'' [اس وقت کہ وہ لوگ آپس میں، ان کے بارے میں جھگڑا (بحث و مباحثہ) کرنے لگے، پھر بولے کہ ان کے غار پر ایک عمارت بنا دو]۔

یعنی یہ حضرات ﴿یتنازعون﴾ میں قیامت کے متعلق شہریوں کے باہم اختلاف کو مراد نہیں لیتے، بلکہ اس گفتگو کو مراد لیتے ہیں جو اصحاب کہف کے مرقد پر ہیکل تعمیر کرنے کے بارے میں ہوئی۔

(۵) ﴿فَاْوٗٓا اِلَی الْکَھْفِ﴾۔

ہم نے واقعے کی جو تفصیلات بیان کی ہیں اور قرآن کی اندرونی اور تاریخ و روایات کی بیرونی شہادتوں سے جن امور کو ثابت کیا ہے، ان سے جدا عام مفسّرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ یہود بنی اسرائیل کے قدیم زمانے کا ہے جو شہر افسس میں ایک مشرک بادشاہ دقیانوس کے زمانہ حکومت میں پیش آیا۔ اس کے یہ معنی ہوئے کہ انہوں نے عیسائیت نہیں بلکہ یہودیت کو قبول کرلیا تھا اور بادشاہِ وقت کے ظلم و جور سے بچ کر غار میں پناہ گزیں ہوگئے تھے۔ لیکن ہم اس پر گزشتہ سطور میں سیر حاصل بحث کر چکے اور ثابت کر چکے ہیں کہ اس واقعے کا تعلّق عیسائی دور سے ہے۔ [یہ بات درست نہیں ہے بلکہ عام مفسّرین اصحاب کہف کو عیسائی مانتے ہیں، بہت کم ایسے مفسرین ہیں جو ان نوجوانوں کو یہودی مانتے ہیں، خود مولانا نے اوپر اس بارے میں صرف ابنِ کثیر کا تردّد نقل کیا ہے]۔

(۶) ﴿سَیَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَۃٌ رَّابِعُھُمْ کَلْبُھُمْ، وَیَقُوْلُوْنَ خَمْسَۃٌ سَادِسُھُمْ کَلْبُھُمْ رَجْمًا بِالْغَیْبِ﴾:

اللہ تعالیٰ نے اس واقعے سے متعلق، ان حقائق کے اظہار کے بعد جو اس کے مقصدِ ''تذکیر'' کے لیے مفید تھے۔ واقعے کی ان جزئیات کے متعلق جو محض تاریخی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کے جان لینے سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوتا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ نصیحت فرمائی کہ وہ ان لاحاصل بحثوں سے پرہیز کریں اور ان پر سرسری طور سے گزر جائیں اور بے کار باتوں کے کھوج لگانے کی فکر نہ کریں، مثلاً یہ کہ ان نوجوانوں کی تعداد کیا تھی؟ ان کی عمروں کا تناسب کیا تھا؟، وہ غار میں کتنی مدّت مقیم رہے؟ مدّت کی صحیح مقدار کیا ہے؟ وغیرہ، ﴿قُلْ رَّبِّیْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِھِمْ، مَّا یَعْلَمُھُمْ اِلَّا قَلِیْلٌ، فَلَا تُمَارِ فِیْھِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاھِرًا، وَّلَا تَسْتَفْتِ فِیْھِمْ مِّنْھُمْ اَحَدًا﴾ (اے پیغمبر) کہہ دے، ان کی اصل گنتی تو میرا پروردگار ہی بہتر جانتا ہے کیوں کہ ان کا حال، بہت کم لوگوں کے علم میں آیا ہے، (اور جب صورتِ حال یہ ہے) تو لوگوں سے اس بارے میں بحث ونزاع نہ کر، مگر صرف اس حد تک کہ صاف صاف بات میں ہو، اور نہ ان لوگوں میں سے کسی سے، اس

بارے میں کچھ دریافت کر، اس لیے کہ جو بات بھی ہوگی اٹکل سے ہوگی۔

تاہم حضرت عبداللہ بن عبّاس (رضی اللہ عنہما) نے یہ فرماتے ہوئے کہ ان قلیل میں سے، جن کو ان کی تعداد کا علم ہے، ایک میں بھی ہوں، ارشاد فرمایا کہ وہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کتا تھا، اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے تعداد کے متعلّق پہلے دو مقولوں کا ذکر کرنے کے بعد یہ فرمایا کہ یہ باتیں اٹکل کے تیر ہیں، مگر تیسرا قول ذکر کرنے کے بعد ایسی کوئی بات نہیں کہی، اس لیے یہی صحیح تعداد ہے۔ (تفسیر ابنِ کثیر، ج ۳)

(۷) ﴿وَ لَبِثُوْا فِیْ کَھْفِھِمْ ثَلٰثَ مِئَۃٍ سِنِیْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا﴾:

اس آیت کا ترجمہ عام طور پر مفسّرین نے اس طرح کیا ہے کہ گویا اللہ تعالیٰ اپنی جانب سے یہ اطلاع دے رہا ہے کہ وہ تین سو نو سال غار میں رہے، مگر حضرت عبداللہ بن عبّاس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے بعض روایات میں جو معنی مذکور ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگوں کا مقولہ ہے، اللہ تعالیٰ کا اپنا قول نہیں ہے یعنی وہ آیت ﴿وَلَبِثُوْا﴾ الآیہ، کو اس سے قبل کے جملے ''یقولون'' کے تحت میں داخل سمجھتے ہیں اور یہ معنی کرتے ہیں کہ ''جس طرح لوگ (عیسائی) اصحابِ کہف کی تعداد کے متعلّق مختلف باتیں کہتے ہیں اور کہیں گے، اسی طرح وہ یہ بھی کہتے ہوئے پائے جاتے ہیں کہ اصحابِ کہف تین سو نو سال تک غار میں رہے، چنانچہ قاضی شوکانی اپنی تفسیر فتح القدیر میں نقل فرماتے ہیں:

أخرج ابن أبي حاتم و ابن مردويه عن ابن عبّاس، قال: إنّ الرجل ليفسّر الآية، و يرى أنها كذلك، فيهوي أبعد ما بين السماء والأرض، ثمّ تلا: ﴿وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ﴾ [الآية]، ثمّ قال: كم لبث القوم؟، قالوا: ثلاث مئة و تسع، قال: لو كانوا لبثوا كذلك، لم يقل الله: ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾، و لكنّه حكى مقالة القوم، فقال: ﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ﴾ إلى قوله: ﴿رَجْمًا بِالْغَيْبِ﴾، فأخبر أنهم لا يعلمون، ثمّ قال: سيقولون ﴿وَ لَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِئَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا﴾۔

ابن ابی حاتم اور ابنِ مردویہ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا: آدمی آیت کی تفسیر کرتا ہے اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے بالکل صحیح تفسیر کی ہے، حالاں کہ وہ اس میں فاش غلطی کرتا ہے، گویا وہ اس آسمان وزمین سے بھی دور جا گرا۔

حضرت ابنِ عباسؓ نے یہ فرما کر، بعد میں اس آیت کو تلاوت کیا ﴿وَ لَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ﴾ اور فرمانے لگے، لوگوں نے یہ سوال پیدا کیا کہ اصحاب کہف کتنے عرصے غار میں رہے۔

پھر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اصحاب کہف واقعی اتنے عرصے ہی غار میں رہے ہوتے تو اللہ تعالیٰ یہ نہ فرماتا: ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ آپ کہہ دیجیے کہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ وہ کتنے عرصے مقیم رہے"۔ دراصل، یہ اللہ تعالیٰ کا مقولہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے قول کو حکایت کیا ہے اور ان کی گفتگو کو یہاں سے شروع کیا ہے: ﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ﴾ الی قولہ: ﴿رَجْمًا بِالْغَيْبِ﴾ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی کہ وہ صحیح تعداد سے واقف نہیں ہیں، اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے لوگوں کا دوسرا یہ مقولہ بیان کیا کہ وہ کہتے ہوئے پائے جائیں گے: ﴿وَ لَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا﴾ (فتح القدیر، سورۂ کہف)۔

اور ابنِ کثیر (ج ۳) نے تفسیر میں بروایت قتادہ عبداللہ بن مسعود سے یہ نقل کیا ہے:

قال قتادة: و في قراءة عبد الله "وقالوا ﴿ولبثوا﴾ يعني أنّه قاله النّاس، و هكذا قال قتادة و مطرف.

قتادہ کہتے ہیں: اور عبداللہ بن مسعود کی قرات میں یہ ہے "وَ قَالُوْا:" ﴿وَلَبِثُوْا﴾ یعنی یہ مقولہ لوگوں کا ہے۔ قتادہ اور مطرف کی رائے بھی یہی ہے۔ (حضرت عبداللہ بن مسعود کی قراءت سے یہ مراد ہے کہ وہ اس مقام پر بطور تفسیر کے یہ پڑھ دیا کرتے تھے۔ مولانا حفظ الرحمٰن)۔

ہمارے نزدیک بھی یہی معنی راجح ہیں، کیوں کہ قرآن کا سیاق اسی کو ظاہر کرتا ہے، اس لیے کہ ان ہی آیات میں، قرآن نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت کی ہے کہ وہ اس قسم کی غیر مفید اور اٹکل کی باتوں کے پیچھے نہ پڑیں، پس جب کہ ﴿وَ لَبِثُوْا

فِيْ كَهْفِهِمْ﴾ الآیہ، کے بعد یہ کہا گیا: ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا، لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ﴾ تو اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ غار میں قیام کی مدت کا مسئلہ بھی اندھیرے کا تیر ہے اور اس لیے صحیح طریقِ کار اس بارے میں بھی یہی ہے کہ اس کو علم الٰہی کے سپرد کر دیا جائے، لہٰذا اس صورت میں یہ مقولہ اللہ تعالیٰ کا نہیں، بلکہ ان لوگوں کا ہے، جو زمانۂ نبوت میں اس واقعے کی تفصیلات کے سلسلے میں بے فائدہ اٹکل کے تیر چلاتے رہتے تھے۔

بایں ہمہ ابنِ کثیر، عام مفسّرین کے معنی کو ہی راجح کہتے ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت کو منقطع اور ان کی قراءت کو شاذ ثابت کر کے، اس کو ناقابلِ حجت قرار دیتے ہیں، مگر حضرت عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہما) کی صحیح روایت کا ان کے پاس کیا جواب ہے؟۔ ابنِ کثیر یہ بھی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اوّل تین سو سال فرمایا اور یہ شمسی حساب کے مطابق ہے اور پھر ﴿وَ ازْدَادُوْا تِسْعًا﴾ کہہ کر نو سال کا اور اضافہ اس لیے کیا، تاکہ شمسی حساب، قمری حساب کے ساتھ مطابق ہو جائے، مگر اوّل نظر میں بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ آیت کی یہ تفسیر نہیں، بلکہ تاویل ہے، اس لیے کہ ایک طرف تو قرآن تذکیر وموعظت کے مقصد سے زائد تفصیلات کو دور از کار کہتا ہے اور دوسری جانب خود ہی ایسی باتوں کے درپے ہوتا ہے کہ جس کا موعظت وبصیرت سے کوئی خاص تعلق نہیں، بلکہ خالص علمِ ہیئت کا مسئلہ ہے۔ (نیز ازروئے حساب بھی نو کا اضافہ تطابقِ حساب کے لیے کافی نہیں ہے)۔

ابنِ کثیر کے نزدیک، یہ مقولہ اس لیے بھی لوگوں کا نہیں ہوسکتا کہ نصاریٰ کے یہاں قیامِ کہف کی مدت تین سو سال مشہور ہے اور نو کا، ان کے یہاں کوئی ذکر نہیں پایا جاتا، مگر یہ بات بھی صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ دوسرے مفسّرین نے ان کے دونوں قول نقل کیے ہیں۔ شاید ابنِ کثیر کی نظر سے دوسرا مقولہ نہیں گزرا۔

(۸) ﴿وَ تَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ﴾ (الی) ﴿وَ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا﴾:

اِن آیات میں قرآنِ عزیز نے اصحابِ کہف کی اس حالت کا ذکر کیا ہے جب کہ وہ شروع میں، غار کے اندر جا کر پوشیدہ ہوئے تھے اور یہ اس لیے کہ ان آیات کے متصل ہی جو آیات، اس واقعے پر روشنی ڈال رہی ہیں، ان میں یہ باتیں مذکور ہیں، وہ نیند سے بیدار ہوئے اور انہوں نے ایک رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا، اس کی وجہ سے شہر والوں پر حقیقتِ حال ظاہر ہو گئی، جملہ معترضہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر اس حقیقتِ حال کے منکشف کر دینے کی مصلحت بیان کی، وہ دوبارہ غار میں عزلت گزیں ہو گئے اور اہلِ شہر نے اس غار کے دہانے پر ہیکل تعمیر کر دیا۔ ان واقعات کے بیان کرنے کے بعد، ان آیات میں اس کیفیت کو بیان کیا جا رہا ہے جو اصحابِ کہف پر نیند طاری ہونے کی حالت میں گزری، یعنی اس غار کی، اندر سے کیا حالت تھی، دھوپ اور تازہ ہوا پہنچنے نہ پہنچنے کی کیا کیفیت تھی، ایک طویل مدّت تک خواب کی حالت میں رہنے کی کیا شکل تھی، کیا ایک ہی کروٹ پر سویا کیے یا زندہ انسانوں کی طرح کروٹیں بدلتے رہتے تھے، اُن کا کتا کس طرح وفاداری کا حق ادا کر رہا تھا۔ اِس مجموعی کیفیت کا اثر باہر سے جھانک کر دیکھنے والے انسان پر کیسا پڑتا تھا۔

جمہور مفسّرین نے یہی تفسیر کی ہے اور آیات کے باہم نظم و ترتیب کے لحاظ سے یہ بہت صاف اور واضح تفسیر ہے، مگر مولانا آزاد اِن تمام آیات کو اصحابِ کہف کے دوبارہ غار میں عزلت گزیں ہو جانے سے متعلق سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ قرآن یہ تفصیلات اس حالت کی بیان کر رہا ہے، جب ان پر موت طاری ہو چکی تھی اور پھر انہوں نے ''اَیقاظ'' میں ''یقظۃ'' کے معنی زندگی اور ''رقود'' میں ''رقد'' کے معنی موت کے اختیار کر کے، کافی تکلف کیا ہے اور بعض مقدمات کے اضافے کے ساتھ، اپنی تفسیر کو دلچسپ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ چوں کہ مفسّرین نے اِن آیات کو اصحابِ کہف کے پہلی مرتبہ غار میں پوشیدہ ہو جانے سے متعلق کہا ہے، اس لیے اُن کو آیات کی تفسیر میں حیرانی پیش آئی ہے، مگر اس پوری تفصیل کے مطالعے سے بآسانی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آیاتِ زیرِ بحث کی تفسیر میں مفسّرینِ قدیم کو تو کوئی حیرانی پیش نہیں آئی،

البتہ خود مولانائے موصوف کو اپنی اختیار کردہ تفسیر کی وضاحت میں ضرور تکلّفاتِ باردہ اختیار کرنے پڑے ہیں اور سچ پوچھیے تو اِس مقام پر ان کی تفسیر تاویل ہو کر رہ گئی ہے۔

(۹) ﴿ذٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ﴾:

یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے۔ یعنی پہاڑ کے اندر غار کی یہ مجموعی کیفیت کہ غار کا دہانہ، اگرچہ تنگ ہے مگر اس کے اِندر بہت کافی وسعت ہے، اس کا جائے وقوع، شمالاً و جنوباً ہے کہ جس کی وجہ سے طلوع و غروب، دونوں حالتوں میں آفتاب غار کے سامنے سے داہنے اور بائیں کترا کر نکل جاتا ہے اور غار اس کی تپش سے محفوظ رہتا ہے اور دوسری جانب منفذ ہونے کی وجہ سے ہوا، اور روشنی بقدرِ ضرورت پہنچتی رہتی ہے، گویا: سامانِ بقاء کے لیے جو چیز مضر ہے یعنی تپش، اس سے حفاظت اور جو بقائے حیات کے لیے ضروری شَے ہے، یعنی روشنی اور ہوا، اس کی موجودگی، یہ ایسے امور ہیں، جو خدائے تعالیٰ کی کھلی نشانیاں کہی جاسکتی ہیں کہ اُن کی بدولت برسوں تک خدا کے نیک بندے دنیا کے علائق سے جدا ہو کر غار میں بحالتِ خواب بسر کر سکے اور ایسی حالت میں بسر کر سکے جب کہ سامان خورد و نوش اور بقائے حیات کے دیگر وسائلِ دنیوی سے قطعاً محروم تھے۔

(۱۰) عام طور پر مشہور ہے کہ اصحابِ کہف ابھی تک غار میں سو رہے ہیں اور زندہ ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے، اس لیے کہ حضرت ابنِ عبّاسؓ نے بصراحت یہ فرمایا ہے کہ ان کا انتقال ہو چکا۔ قال قتادة: غزا ابن عبّاس مع حبيب بن مسلمة، فمرّوا بكهف في بلاد الروم، فرأوا فيه عظاما، فقال قائل: هذه عظام أهل الكهف، فقال ابن عبّاس: لقد بليت عظامهم من أكثر من ثلاث مئة سنة (رواه ابن جرير)۔ قتادہ کہتے ہیں:

ابنِ عبّاسؓ ایک مرتبہ حبیب بن مسلمہ کے ساتھ ایک غزوے میں تشریف لے گئے، راہ میں بلادِ روم میں، اس مقام پر گزر ہوا جہاں پہاڑی غاروں کا سلسلہ ہے۔ وہاں انہوں نے کسی غار کے اندر انسانوں کی ہڈیاں یا ڈھانچے دیکھے تو کسی کہنے والے نے کہا: یہ اہلِ کہف کی ہڈیاں معلوم ہوتی ہیں، اس پر حضرت عبداللہ بن عبّاسؓ نے فرمایا کہ ان کی ہڈیاں تو تین سو سال سے بھی زیادہ عرصہ ہوا کہ بوسیدہ ہو چکیں۔ (یہ روایت بھی اس کی

دلیل ہے کہ یہ واقعہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہے)۔

(۱۱) قرآنِ عزیز اور صحیح روایات سے یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ اصحاب کہف کے نام کیا تھے بلکہ قرآنِ عزیز نے تو مشرکینِ مکّہ یا نبطی اور رومی عیسائیوں کے یہاں، اس سلسلے میں جو اٹکل کی باتیں مشہور تھیں، ان پر اعتماد رکھنے اور ان کی تحقیقات میں پڑنے سے روکا ہے، البتہ اسرائیلی روایات میں ان کے نام یہ بتائے گئے ہیں:

مکسلمینا، تملیخا، مرطونس، کسطونس، بیرونس، ونیموس، نطونس اور ان کے کتے کا نام قطمیر یا حمران ہے۔ (یہ روایت بھی اس کی دلیل ہے کہ یہ واقعہ عیسائیت کے ابتدائی دور میں پیش آیا ہے [کس وجہ سے دلیل ہے، واضح نہیں])۔

(۱۲) ﴿وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ﴾:

کتے نے وفاداری اور جاں نثاری کا ثبوت دیا اور صلحاء کی صحبت پائی تو قرآن نے بھی، اس کا ذکرِ خیر کر کے، اس کو وہ عزت بخشی کہ انسانوں کے لیے قابلِ رشک بنا دیا۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے کیا خوب کہا ہے:

سگِ اصحابِ کہف روزے چند   پے نیکاں گرفت مردم شد
پسرِ نوح با بداں بہ نشست   خاندان نبوّتش گم شد

[اصحاب کہف کا کتا، چند روز نیک لوگوں کی صحبت میں رہا تو انسان بن گیا۔
حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا، بروں کی صحبت میں بیٹھا تو اپنے نبوّت کے خاندان کو کھو بیٹھا]۔

(۱۳) ﴿وَ لَا تَقُوْلَنَّ لِشَيْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ﴾ اور کسی چیز کے لیے یہ نہ کہو کہ کل میں اس کو ضرور کروں گا مگر (یہ کہہ لیا کرو) یہ کہ خدا چاہے تو"۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ تعلیم دی ہے کہ جب مستقبل میں، کسی کام کا ارادہ ہو تو دعوے کے ساتھ یہ نہیں کہنا چاہیے کہ میں اس کو ضرور کروں گا، اس لیے کہ کون جانتا ہے کہ کل کیا ہوگا اور کہنے والا اس کائنات میں موجود بھی ہوگا یا نہیں، لہٰذا اُس معاملے کو خدا کے سپرد کرتے ہوئے "انشاء اللہ" ضرور کہنا چاہیے۔

(۱۴) ﴿وَ قُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا﴾ تم کہو، اُمید ہے، میرا پروردگار، اس سے بھی زیادہ کامیابی کی راہ مجھ پر کھول دے گا"۔

اِس آیت میں اس جانب اشارہ ہے کہ عنقریب ایسا ہی معاملہ، تم کو بھی پیش آنے والا ہے، بلکہ وہ، اس سے بھی عجیب و غریب ہوگا، یعنی اپنا آبائی وطن چھوڑنا پڑے گا۔ راہ میں، غارِ ثور کے اندر کئی دن تک پوشیدہ رہو گے۔ دشمن، غارِ ثور کے منہ پر پہنچ جانے کے باوجود، تم کو نہ پا سکیں گے۔ تم بخیر و خوبی مدینہ پہنچ جاؤ گے اور وہاں تم پر فتح و کامرانی کی ایسی راہیں کھول دی جائیں گی، جو اس معاملے سے کہیں زیادہ عظیم و جلیل ہوں گی۔ یہ سورت مکی عہد کی آخری سورتوں میں سے ہے، اس لیے اس کے نزول کے بہت تھوڑے زمانے بعد، ہجرت کا وہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا، جس نے مسلمانوں کے دورِ حیات میں حیرت زا انقلاب پیدا کر دیا اور باطل نے حق کے سامنے سپر ڈال دی۔

(۱۵) ﴿لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا﴾ ہم ضرور اُن کے مرقد پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے۔

معلوم نہیں کہ اس کہنے سے ان لوگوں کا مقصد کیا تھا؟ یہ کہ واقعی ان کے مرقد پر ہیکل بنا کر اس کو سجدہ گاہِ عام و خاص بنائیں گے، کیوں کہ یہ خدا کے مقبول بندے تھے، تب تو ان عیسائیوں کا یہ عمل، اسلام کی نگاہ میں، قابلِ مذمت و نفرت ہے، اس لیے کہ نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے: "لعن الله اليهود والنصارى، اتخذوا قبور أنبيائهم مساجدا" (رواه [الصحيحان، یعنی بخاری و مسلم نے اس حدیث کو روایت کیا ہے])۔ اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو مسجد (سجدہ گاہ) بنا لیا تھا، یعنی قبروں کو سجدہ کرتے تھے اور پھر ارشاد فرمایا "لا تتخذوا قبري عيدا"، لوگو! تم میری قبر کو عید کی طرح تہوار نہ بنا لینا۔

اور اگر ان کا مطلب یہ تھا کہ ان کی یادگار میں، غار کے منہ پر ایک عبادت گاہ بنائیں گے کہ جس میں صرف خدائے عزّ و جلّ ہی کی عبادت ہوا کرے گی تو ان کا یہ فیصلہ، بے شبہ محمود اور قابلِ ستائش تھا۔

تفہیم القرآن، جلد سوم، ص ۱۱ تا ۵۲

۶ عربی زبان میں "کہف" وسیع غار کو کہتے ہیں اور "غار" کا لفظ تنگ کھوہ کے لیے استعمال ہوتا ہے، مگر اُردو میں غار، کہف کا ہم معنی ہے۔

۷ الرقیم کے معنی میں اختلاف ہے۔ بعض صحابہ وتابعین سے منقول ہے کہ یہ اُس بستی کا نام ہے، جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا، اور اَیلہ (یعنی عقبہ) اور فلسطین کے درمیان واقع تھی اور بعض قدیم مفسّرین کہتے ہیں کہ اس سے مراد، وہ کتبہ ہے، جو اس غار پر اصحابِ کہف کی یادگار میں لگایا گیا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی تفسیر "ترجمان القرآن" میں پہلے معنی کو ترجیح دی ہے اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ مقام، وہی ہے جسے بائبل کی کتاب یشوع (باب ۱۸- آیت ۲۷) میں رقم یا راقم کہا گیا ہے۔ پھر وہ اسے نبطیوں کے مشہور تاریخی مرکز پیٹرا کا قدیم نام قرار دیتے ہیں، لیکن انہوں نے اس بات پر غور نہیں فرمایا کہ کتابِ یشوع میں رقم یا راقم کا ذکر بنی بن یمین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے اور خود اسی کتاب کے بیان کی رو سے اس قبیلے کی میراث کا علاقہ دریائے اردن اور بحرِ لوط کے مغرب میں واقع تھا جس میں پیٹرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ پیٹرا کے کھنڈر جس علاقے میں پائے گئے ہیں، اس کے اور بنی بن یمین کی میراث کے درمیان تو یہوداہ اور اَدومیہ کا پورا علاقہ حائل تھا۔ اسی بنا پر جدید زمانے کے محققینِ آثارِ قدیمہ نے یہ بات ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ پیٹرا اور راقم ایک چیز ہیں۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۴۶ء جلد ۱۷، ص: ۶۵۸) ہمارے نزدیک صحیح بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ رقیم سے مراد، کتبہ ہے۔

۸ یعنی کیا تم اس خدا کی قدرت سے جس نے زمین وآسمان کو پیدا کیا ہے، اس بات کو کچھ بعید سمجھتے ہو کہ وہ چند آدمیوں کو، دو تین سو برس تک سلائے رکھے اور پھر ویسا ہی جوان وتندرست جگا اُٹھائے جیسے وہ سوئے تھے؟ اگر سورج اور چاند اور زمین کی تخلیق پر تم نے کبھی غور کیا ہوتا تو تم ہرگز یہ خیال نہ کرتے کہ خدا کے لیے یہ کوئی بڑا مشکل کام ہے۔

۹ اس قصے کی قدیم ترین شہادت، شام کے ایک عیسائی پادری جیمس سروجی کے مواعظ میں پائی گئی ہے، جو سریانی زبان میں لکھے گئے تھے۔ یہ شخص اصحابِ کہف کی وفات کے چند سال بعد ۴۵۲ء میں پیدا ہوا تھا اور اس نے ۴۷۴ء کے لگ بھگ زمانے میں اپنے یہ مواعظ مرتب کیے تھے۔ ان مواعظ میں وہ اِس پورے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ یہی سریانی روایت ایک طرف ہمارے ابتدائی دور کے مفسّرین کو پہنچی، جسے ابنِ جریر طبری نے مختلف سندوں کے ساتھ اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ اور دوسری طرف یورپ پہنچی جہاں یونانی اور لاطینی زبانوں میں اس کے ترجمے اور خلاصے شائع ہوئے۔ گبن نے اپنی کتاب "تاریخِ زوالِ وسقوطِ دولتِ روم" کے باب ۳۳ میں "سات سونے والوں" ([Seven Sleepers]) کے عنوان کے تحت، ان ماخذ سے، اس قصے کا جو خلاصہ دیا ہے، وہ ہمارے مفسّرین کی روایات سے، اس قدر ملتا جلتا ہے کہ دونوں قصے، قریب قریب ایک ہی ماخذ سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جس بادشاہ کے ظلم سے بھاگ کر اصحابِ کہف غار میں پناہ گزین ہوئے تھے ہمارے مفسّرین، اس کا نام دَقیَنُوس یا دقیانوس یا دَقیُوس بتاتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ وہ قیصر ڈیسیَس (Decius) تھا، جس نے ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک سلطنتِ روم پر فرمانروائی کی ہے اور مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر ظلم وستم کرنے کے معاملے میں جس کا عہد بہت بدنام ہے، جس شہر میں یہ واقعہ پیش آیا اس کا نام ہمارے مفسّرین اُفُسُس یا افسوس لکھتے ہیں، اور گبن اس کا نام اِفسُس (Ephesus) بتاتا ہے، جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر اور مشہور بندرگاہ تھا، جس کے کھنڈر آج، موجودہ ٹرکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۰-۲۵ میل، بجانبِ جنوب پائے جاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۲ صفحہ ۴۳)۔ پھر جس بادشاہ کے عہد میں اصحابِ کہف جاگے اس کا نام ہمارے مفسّرین تیندوسیس لکھتے ہیں اور گبن کہتا ہے کہ ان کے بعث کا واقعہ قیصر تھیوڈوسیس (Theodosius) ثانی کے زمانے میں پیش آیا جو رومی سلطنت کے عیسائیت قبول کر لینے کے بعد ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء تک، روم کا قیصر رہا۔ دونوں بیانات کی مماثلت کی حد یہ ہے کہ اصحاب کہف نے بیدار ہونے کے بعد اپنے

جس رفیق کو کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا تھا، اس کا نام ہمارے مفسّرین یَملیخا بتاتے ہیں اور گبن اسے یَملیخُس ([Jamblichus]) لکھتا ہے۔

قصّے کی تفصیلات دونوں روایتوں میں یکساں ہیں اور ان کا خلاصہ یہ ہے کہ قیصر ڈِیسیَس کے زمانے میں جب مسیح علیہ السلام کے پیروؤں پر سخت ظلم وستم ہو رہے تھے، یہ سات نوجوان ایک غار میں جا بیٹھے تھے۔ پھر قیصر تھیوڈوسیس کی سلطنت کے اڑتیسویں سال (یعنی تقریباً ۴۴۵ء یا ۴۴۶ء میں) یہ لوگ بیدار ہوئے، جب کہ پوری رومی سلطنت مسیح علیہ السلام کی پیرو بن چکی تھی۔ اس حساب سے غار میں ان کے رہنے کی مدّت تقریباً ۱۹۶ سال بنتی ہے۔

بعض مستشرقین نے اس قصّے کو قصّۂ اصحابِ کہف کا مترادف ماننے سے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ آگے قرآن، ان کے قیامِ غار کی مدّت ۳۰۹ سال بیان کر رہا ہے، لیکن اس کا جواب ہم نے حاشیہ ۲۵ میں دے دیا ہے۔

اس سُریانی روایت اور قرآن کے بیان میں کچھ جزوی اختلافات بھی ہیں، جن کو بنیاد بنا کر گبن نے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم پر "جہالت" کا الزام لگایا ہے، حالانکہ جس روایت کے اعتماد پر، وہ اتنی بڑی جسارت کر رہا ہے اس کے متعلّق، وہ خود مانتا ہے کہ وہ اس واقعے کے تیس چالیس سال بعد شام کے ایک شخص نے لکھی ہے اور اتنی مدّت کے اندر زبانی روایات کے ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچنے میں کچھ نہ کچھ فرق ہو جایا کرتا ہے۔ اس طرح کی ایک روایت کے متعلّق یہ خیال کرنا کہ وہ حرف بہ حرف صحیح ہے اور اس سے کسی جز میں اختلاف ہونا، لازماً قرآن ہی کی غلطی ہے، صرف اُن ہٹ دھرم لوگوں کو زیب دیتا ہے جو مذہبی تعصب میں عقل کے معمولی تقاضوں تک کو نظرانداز کر جاتے ہیں۔ قصّۂ اصحابِ کہف کے متعلّق مزید معلومات ضمیمہ نمبر (۱) میں بیان کی گئی ہیں جو کتاب کے آخر میں درج ہے)۔

۱۰ یعنی جب وہ سچے دل سے، ایمان لے آئے تو اللہ نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا اور ان کو یہ توفیق بخشی کہ حق اور صداقت پر ثابت قدم رہیں، اور اپنے آپ کو

خطرے میں ڈال لینا گوارا کر لیں، مگر باطل کے آگے سر نہ جھکائیں۔

۱۱ جس زمانے میں، ان خدا پرست نوجوانوں کو آبادیوں سے بھاگ کر پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی تھی، اُس وقت شہر اِفسُس، ایشیائے کوچک میں بُت پرستی اور جادوگری کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں ڈائنا دیوی کا ایک عظیم الشان مندر تھا، جس کی شہرت، تمام دنیا میں پھیلی ہوئی تھی، اور دور دور سے لوگ، اس کی پوجا کے لیے آتے تھے۔ وہاں کے جادوگر، عامل [؟ تانترک]، فال گیر اور تعویذ نویس دنیا بھر میں مشہور تھے۔ شام و فلسطین اور مصر تک ان کا کاروبار چلتا تھا اور اس کاروبار میں یہودیوں کا بھی اچھا خاصہ حصّہ تھا، جو اپنے فن کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا آف ببلیکل لٹریچر عنوان؟)۔

شرک اور اوہام پرستی کے اس ماحول میں، خدا پرستوں کا جو حال ہو رہا تھا، اُس کا اندازہ اصحابِ کہف کے، اُس فقرے سے کیا جا سکتا ہے جو اگلے رکوع میں آ رہا ہے کہ "اگر ان کا ہاتھ ہم پر پڑ گیا تو بس ہمیں سنگسار ہی کر ڈالیں گے یا پھر زبردستی اپنی ملت میں واپس لے جائیں گے"۔

۱۲ بیچ میں یہ ذکر چھوڑ دیا گیا کہ اس قرارداد باہمی کے مطابق، یہ لوگ، شہر سے نکل کر پہاڑوں کے درمیان ایک غار میں جا چھپے تا کہ سنگسار ہونے یا مجبوراً مرتد ہو جانے سے بچ سکیں۔

۱۳ یعنی ان کے غار کا دہانہ، شمال کے رُخ تھا، جس کی وجہ سے سورج کی روشنی، کسی موسم میں [بھی] اندر نہ پہنچتی تھی اور باہر سے گزرنے والا یہ دیکھ سکتا تھا کہ اندر کون ہے۔

۱۴ یعنی اگر باہر سے کوئی جھانک کر دیکھتا بھی تو ان سات آدمیوں کے وقتاً فوقتاً کروٹیں لیتے رہنے کی وجہ سے، وہ یہی گمان کرتا کہ یہ بس یونہی لیٹے ہوئے ہیں، سوئے ہوئے نہیں ہیں۔

۱۵ یعنی پہاڑوں کے اندر ایک اندھیرے غار میں، چند آدمیوں کا اس طرح

موجود ہونا اور آگے کتے کا بیٹھا ہونا، ایک ایسا دہشت ناک منظر پیش کرتا کہ جھانکنے والے، ان کو ڈاکو سمجھ کر بھاگ جاتے تھے، اور یہ ایک بڑا سبب تھا جس کی وجہ سے ان لوگوں کے حال پر اتنی مدت تک پردہ پڑا رہا۔ کسی کو یہ جرأت ہی نہ ہوئی کہ اندر جا کر کبھی اصل معاملے سے باخبر ہوتا۔

۱۶ یعنی جیسے عجیب طریقے سے وہ سلائے گئے تھے اور دنیا کو، ان کے حال سے بے خبر رکھا گیا تھا، ویسا ہی عجیب کرشمۂ قدرت، ان کا ایک طویل مدت کے بعد، جاگنا بھی تھا۔

۱۷ یعنی جب وہ شخص کھانا خریدنے کے لیے شہر گیا تو دنیا بدل چکی تھی، بُت پرست روم کو عیسائی ہوئے ایک مدت گزر چکی تھی۔ زبان، تہذیب، تمدن، لباس، ہر چیز میں نمایاں فرق آ گیا تھا۔ دو سو برس پہلے کا یہ آدمی، اپنی سج دھج، لباس، زبان ہر چیز کے اعتبار سے فوراً ایک تماشا بن گیا۔ اور جب اس نے قیصر ڈیسیس کے وقت کا سکہ کھانا خریدنے کے لیے پیش کیا تو دوکان دار کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سُریانی روایت کی رو سے دوکان دار کو اس پر شبہ یہ ہوا کہ شاید یہ کسی پرانے زمانے کا دفینہ نکال لایا ہے، چنانچہ اس نے آس پاس کے لوگوں کو اس طرف متوجہ کیا اور آخر کار اس شخص کو حکام کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہاں جا کر یہ معاملہ کھلا کہ یہ شخص تو اُن پیروانِ مسیح میں سے ہے، جو دو سو برس پہلے، اپنا ایمان بچانے کے لیے بھاگ نکلے تھے۔ یہ خبر آناً فاناً، شہر کی عیسائی آبادی میں پھیل گئی اور حکام کے ساتھ، لوگوں کا ایک ہجوم غار پر پہنچ گیا۔

اب جو اصحابِ کہف، خبردار ہوئے کہ وہ دو سو برس بعد سو کر اُٹھے ہیں تو وہ اپنے عیسائی بھائیوں کو سلام کر کے لیٹ گئے اور ان کی روح پرواز کر گئی۔

۱۸ سُریانی روایت کے مطابق اُس زمانے میں، وہاں قیامت اور عالمِ آخرت کے مسئلے پر زور شور کی بحث چھڑی ہوئی تھی، اگرچہ رومی سلطنت کے اثر سے عام لوگ مسیحیت قبول کر چکے تھے، جس کے بنیادی عقائد میں آخرت کا عقیدہ بھی شامل تھا، لیکن ابھی تک رُومی شرک و بُت پرستی اور یونانی فلسفے کے اثرات کافی طاقت ور تھے، جن کی

بدولت بہت سے لوگ آخرت سے انکار، یا کم از کم اس کے ہونے میں شک کرتے تھے۔ پھر اس شک و انکار کو سب سے زیادہ جو چیز تقویت پہنچا رہی تھی، وہ یہ تھی کہ افسس میں یہودیوں کی بڑی آبادی تھی اور ان میں سے ایک فرقہ (جسے صدوقی کہا جاتا تھا) آخرت کا کھلم کھلا منکر تھا۔ یہ گروہ کتاب اللہ (یعنی توراۃ) سے آخرت کے انکار پر دلیل لاتا تھا اور مسیحی علماء کے پاس، اُس کے مقابلے میں مضبوط دلائل موجود نہ تھے۔ متی، مرقس، لوقا، تینوں انجیلوں میں صدوقیوں اور مسیح علیہ السلام کے اُس مناظرے کا ذکر، ہمیں ملتا ہے جو آخرت کے مسئلے پر ہوا تھا، مگر تینوں نے مسیح علیہ السلام کی طرف سے، ایسا کمزور جواب نقل کیا ہے، جس کی کمزوری کو خود علمائے مسیحیت بھی تسلیم کرتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو متی، باب ۲۲، آیت ۲۳-۳۳، مرقس باب ۱۲، آیت ۱۸-۲۷، لوقا، باب ۲۰، آیت ۲۷-۴۰)، اسی وجہ سے منکرینِ آخرت کا پلہ بھاری ہو رہا تھا اور مؤمنین، آخرت بھی شک و تذبذب میں مبتلا ہوتے جا رہے تھے۔ عین اس وقت اصحابِ کہف کے بعث کا یہ واقعہ پیش آیا اور اس نے بعث بعد الموت کا ایک ناقابلِ انکار ثبوت بہم پہنچا دیا۔

۱۹ فحوائے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صالحین نصاریٰ کا قول تھا۔ اُن کی رائے یہ تھی کہ اصحابِ کہف جس طرح غار میں لیٹے ہوئے ہیں، اسی طرح انہیں لیٹا رہنے دو اور غار کے دہانے کو تیغا لگا دو [یعنی بند کر دو]، ان کا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کون لوگ ہیں، کس مرتبے کے ہیں اور کس جزا کے مستحق ہیں۔

۲۰ اس سے مراد، رومی سلطنت کے اربابِ اقتدار اور مسیحی کلیسا کے مذہبی پیشوا ہیں جن کے مقابلے میں صالح العقیدہ عیسائیوں کی بات نہ چلتی تھی۔ پانچویں صدی کے وسط تک، پہنچتے پہنچتے عام عیسائیوں میں اور خصوصاً رومن کیتھولک کلیسا میں شرک اور اولیاء پرستی اور قبر پرستی کا پورا زور ہو چکا تھا، [عیسائی] بزرگوں کے آستانے پوجے جا رہے تھے، اور مسیح علیہ السلام، مریم علیہا السلام اور حواریوں کے مجسمے گرجوں میں رکھے جا رہے تھے۔ اصحابِ کہف کے بعث سے چند ہی سال پہلے، ۴۳۱ء میں پوری عیسائی دنیا کے مذہبی پیشواؤں کی ایک کونسل اسی افسس کے مقام پر منعقد ہو چکی تھی، جس میں مسیح علیہ السلام کی

الوہیت اور حضرت مریمؑ کے ''مادرِ خدا'' ہونے کا عقیدہ چرچ کا سرکاری عقیدہ قرار پایا تھا۔ اس تاریخ کو نگاہ میں رکھنے سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ ﴿الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰی اَمْرِهِمْ﴾ سے مراد وہ لوگ ہیں، جو سچے پیروانِ مسیح کے مقابلے میں اُس وقت عیسائی عوام کے رہنما اور سربراہِ کار بنے ہوئے تھے اور مذہبی و سیاسی امور کی باگیں، جن کے ہاتھوں میں تھیں، یہی لوگ، دراصل شرک کے علَم بردار تھے اور انہوں نے ہی فیصلہ کیا کہ اصحابِ کہف کا مقبرہ بنا کر اس کو عبادت گاہ بنایا جائے۔

۲۱۔ مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا بالکل اُلٹا مفہوم لیا ہے۔ وہ اسے دلیل ٹھہرا کر مقابرِ صلحاء پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز قرار دیتے ہیں، حالاں کہ یہاں قرآن، اُن کی اِس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو نشانی، ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکانِ آخرت کا یقین دلانے کے لیے دکھائی گئی تھی، اسے انہوں نے ارتکابِ شرک کے لیے، ایک خداداد موقع سمجھا اور خیال کیا کہ چلو، کچھ اور ولی پوجا پاٹ کے لیے ہاتھ آ گئے۔ پھر آخر اس آیت سے قبورِ صالحین پر مسجدیں بنانے کے لیے کیسے استدلال کیا جاسکتا ہے جب کہ نبی ﷺ کے یہ ارشادات، اس کی نہی میں موجود ہیں:

لعن الله تعالىٰ زائرات القبور و المتّخذين عليها المساجد و السُّرُج (أحمد، الترمذي، أبو داؤد، النسائي، ابن ماجه)۔

اللہ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر۔

ألا و إنّ من كان قبلكم، كانوا يتّخذون قبور أنبيائهم مساجد، فإنّي أنهاكم عن ذلك (مسلم)۔

خبردار ہو، تم سے پہلے لوگ، اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیتے تھے، میں تمہیں اس حرکت سے منع کرتا ہوں۔

لعن الله تعالىٰ اليهود و النصارى، اتّخذوا قبور أنبيائهم مساجد۔ (أحمد،

البخاري، مسلم، النسائي)۔

اللہ نے لعنت فرمائی یہود اور نصاریٰ پر، انہوں نے اپنے انبیا کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔

إنّ أولئك، إذا كان فيهم الرجل الصالح فمات، بنوا على قبره مسجدا، و صوّروا فيه تلك الصور، أولئك شرار الخلق يوم القيامة۔ (أحمد، البخاري، مسلم، النسائي)۔

ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی مردِ صالح ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد، اس کی قبر پر مسجدیں [؟] بناتے اور اس کی [؟] تصویریں تیار کرتے تھے۔ یہ قیامت کے روز بدترین مخلوقات ہوں گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کی ان تصریحات کی موجودگی میں کون خدا ترس آدمی، یہ جرأت کرسکتا ہے کہ قرآن مجید میں، عیسائی پادریوں اور رومی حکمرانوں کے جس گمراہانہ فعل کا حکایتاً ذکر کیا گیا ہے اس کو ٹھیک وہی فعل کرنے کے لیے دلیل وحجت ٹھہرائے؟

اس موقع پر یہ ذکر کردینا بھی خالی از فائدہ نہیں کہ ۱۸۳۴ء میں ریورنڈ ٹی ارنڈیل (Arundell) نے ''ایشیائے کوچک کے اکتشافات'' (Discoveries in Asia Minor) کے نام سے اپنے جو مشاہدات شائع کیے تھے، ان میں وہ بتاتا ہے کہ قدیم شہر افسس کے کھنڈرات سے متصل، ایک پہاڑی پر، اس نے حضرت مریم اور ''سات لڑکوں'' (یعنی اصحابِ کہف) کے مقبروں کے آثار پائے ہیں۔

۲۲۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعے کے پونے تین سو سال بعد، نزولِ قرآن کے زمانے میں، اس کی تفصیلات کے متعلق مختلف افسانے، عیسائیوں میں پھیلے ہوئے تھے اور عموماً مستند معلومات لوگوں کے پاس موجود نہ تھیں۔ ظاہر ہے کہ وہ پریس کا زمانہ نہ تھا کہ جن کتابوں میں اس کے متعلق نسبتاً زیادہ صحیح معلومات درج تھیں، وہ عام طور پر شائع ہوتیں۔ واقعات زیادہ تر زبانی روایات کے ذریعے سے پھیلتے تھے اور امتدادِ زمانہ کے ساتھ، ان کی بہت سی تفصیلات افسانہ بنتی چلی جاتی تھیں، تاہم چوں کہ تیسرے

قول کی تردید، اللہ تعالیٰ نے نہیں فرمائی ہے، اس لیے یہ گمان کیا جاسکتا ہے کہ صحیح تعداد سات ہی تھی۔

۲۳ مطلب یہ ہے کہ اصل چیز، ان کی تعداد نہیں ہے، بلکہ اصل چیز وہ سبق ہیں، جو اس قصے سے ملتے ہیں۔

اِس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک سچے مومن کو کسی حال میں [بھی] حق سے منہ موڑنے اور باطل کے آگے سر جھکانے کے لیے تیار نہ ہونا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مؤمن کا اعتماد، اسبابِ دنیا پر نہیں، بلکہ اللہ پر ہونا چاہیے، اور حق پرستی کے لیے بظاہر ماحول میں کسی سازگاری کے آثار نظر نہ آتے ہوں، تب بھی اللہ کے بھروسے پر راہِ حق میں قدم اُٹھا دینا چاہیے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جس "عادتِ جاریہ" کو لوگ "قانونِ فطرت" سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دنیا میں کچھ نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ درحقیقت اس کا پابند نہیں ہے، وہ جب اور جہاں چاہے، اس عادت کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے، کرسکتا ہے۔ اُس کے لیے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے کہ کسی کو دو سو برس تک سلا کر، اس طرح اُٹھا بٹھائے، جیسے وہ چند گھنٹے سویا ہے، اور اس کی عمر، شکل، صورت، لباس، تندرستی، غرض کسی چیز پر بھی، اس امتدادِ زمانہ کا کچھ اثر نہ ہو۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ نوعِ انسانی کی تمام، اگلی پچھلی نسلوں کو بیک وقت زندہ کر کے اُٹھا دینا، جس کی خبر انبیاء علیہم السلام اور کتبِ آسمانی نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ جاہل انسان، کس طرح، ہر زمانے میں اللہ کی نشانیوں کو اپنے لیے سرمۂ چشمِ بصیرت بنانے کے بجائے اُلٹا، مزید گمراہی کا سامان بناتے رہے ہیں۔ اصحاب کہف کا جو معجزہ، اللہ نے اس لیے دکھایا تھا کہ لوگ، اس سے آخرت کا یقین حاصل کریں، ٹھیک اسی نشان کو انہوں نے یہ سمجھا کہ اللہ نے انہیں، اپنے کچھ اور ولی پوجنے کے لیے عطا کر دیے..... یہ ہیں وہ اصل سبق، جو آدمی کو اس قصے سے لینے چاہییں اور اس میں توجہ کے قابل یہی امور ہیں۔ ان سے توجہ ہٹا کر، اس کھوج میں لگ جانا کہ اصحاب کہف کتنے تھے اور کتنے نہ تھے، اور ان کے نام کیا کیا تھے، اور ان کا کتا کس رنگ کا

تھا، یہ اُن لوگوں کا کام ہے جو مغز کو چھوڑ کر، صرف چھلکوں سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے اہلِ ایمان کو یہ تعلیم دی کہ اگر دوسرے لوگ اس طرح کی غیر متعلق بحثیں چھیڑیں بھی، تو تم ان میں نہ اُلجھو، نہ ایسے سوالات کی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرو، بلکہ اپنی توجہ صرف کام کی بات پر مرکوز رکھو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی صحیح تعداد بیان نہیں فرمائی، تاکہ شوقِ فضول رکھنے والوں کو غذا نہ ملے۔

۲۴ یہ ایک جملۂ معترضہ ہے، جو پچھلی آیت کے مضمون کی مناسبت سے سلسلۂ کلام کے بیچ میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ پچھلی آیت میں ہدایت کی گئی تھی کہ اصحاب کہف کی تعداد کا صحیح علم، اللہ کو ہے اور اس کی تحقیق کرنا، ایک غیر ضروری کام ہے، لہٰذا خواہ مخواہ ایک غیر ضروری بات کی کھوج میں لگنے سے پرہیز کرو، اور اس پر کسی سے بحث بھی نہ کرو۔ اس سلسلے میں آگے کی بات ارشاد فرمانے سے پہلے، جملۂ معترضہ کے طور پر ایک اور ہدایت بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ ایمان کو دی گئی، اور وہ یہ کہ تم کبھی دعوے سے یہ نہ کہہ دینا کہ میں کل فلاں کام کردوں گا۔ تم کو کیا خبر کہ تم وہ کام کرسکو گے یا نہیں۔ نہ تمہیں غیب کا علم، اور نہ تم، اپنے افعال میں ایسے خود مختار کہ جو کچھ چاہو کرسکو۔ اس لیے اگر کبھی، بے خیالی میں، ایسی بات زبان سے نکل بھی جائے تو فوراً متنبہ ہوکر، اللہ کو یاد کرو اور انشاء اللہ کہہ دیا کرو۔ مزید برآں، تم یہ بھی نہیں جانتے کہ جس کام کے کرنے کو تم کہہ رہے ہو، آیا اس میں خیر ہے یا کوئی دوسرا کام، اس سے بہتر ہے۔ لہٰذا اللہ پر اعتماد کرتے ہوئے یوں کہا کرو کہ اُمید ہے، میرا رب، اس معاملے میں صحیح بات، یا صحیح طرزِ عمل کی طرف میری رہنمائی فرما دے گا۔

۲۵ اس فقرے کا تعلّق، ہمارے نزدیک جملۂ معترضہ سے پہلے کے فقرے کے ساتھ ہے۔ یعنی سلسلۂ عبارت یوں ہے کہ "کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ تین تھے اور چوتھا، اُن کا کتا تھا... اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے اور بعض لوگ اس مدت کے شمار میں نو سال اور بڑھ گئے ہیں"۔ اس عبارت میں ۳۰۰ اور تین سو نو سال

کی تعداد، جو بیان کی گئی ہے، ہمارے خیال میں یہ دراصل لوگوں کے قول کی حکایت ہے نہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنا قول، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ بعد کے فقرے میں اللہ تعالیٰ خود فرمارہے ہیں کہ تم کہو، اللہ بہتر جانتا کہ وہ کتنی مدت رہے۔ اگر ۳۰۹ کی تعداد اللہ نے خود بیان فرمائی ہوتی، تو اس کے بعد، یہ فقرہ ارشاد فرمانے کے کوئی معنی نہ تھے۔ اسی دلیل کی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے بھی یہی تاویل اختیار فرمائی ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول نہیں ہے بلکہ لوگوں کے قول کی حکایت ہے۔

تفہیم القرآن، جلد سوم صفحہ ۷۶۹

ضمیمہ نمبر ۱

بہ سلسلہ سورہ اصحاب کہف، حاشیہ نمبر ۹، صفحہ ۱۲

شہر افسوس (Ephesus) جس میں اصحاب کہف کا واقعہ پیش آیا' تقریباً گیارہویں صدی قبل مسیح میں تعمیر ہوا تھا اور بعد میں یہ بت پرستی کا بہت بڑا مرکز بن گیا۔ یہاں چاند دیوی کی پوجا ہوتی تھی' جسے ڈائنا (Diana) کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اسی کا عظیم الشان مندر عہد قدیم کے عجائبات عالم میں شمار کیا جاتا ہے۔ ایشیائے کوچک کے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے اور رومی سلطنت نے بھی اس کو اپنے معبودوں میں شامل کرلیا تھا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد جب مسیحی دعوت رومی سلطنت کے مختلف علاقوں میں پہنچنی شروع ہوئی تو اس شہر کے چند نوجوان بھی شرک سے تائب ہو کر خدائے واحد پر ایمان لے آئے۔ ان کے قصے کی جو تفصیلات مسیحی روایت کو جمع کر کے گریگوری آف ٹورس (Gregori of Tours) نے اپنی کتاب (Meraculouum liber) میں بیان کی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے:

"یہ سات نوجوان تھے۔ ان کی تبدیلیٔ مذہب کا حال سن کر قیصر ڈیسیس نے ان کو اپنے سامنے طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ تمہارا مذہب کیا ہے۔ انہیں معلوم تھا کہ قیصر

پیروان مسیح کے خون کا پیاسہ ہے۔ مگر انہوں نے کسی خوف کے بغیر صاف صاف کہہ دیا کہ ہمارا رب وہ ہے جو زمین اور آسمان کا رب ہے۔ اس کے سوا ہم کسی اور معبود کو نہیں پکارتے۔ اگر ہم ایسا کریں تو بہت بڑا گناہ کریں گے۔ قیصر نے پہلے تو سخت مشتعل ہو کر کہا کہ اپنی زبان بند کرو' ورنہ میں تمہیں ابھی قتل کرادوں گا پھر کچھ ٹھنڈا ہوا اور بولا تم ابھی بچے ہو۔ میں تمہیں تین دن دیتا ہوں۔ اس مدت میں اگر تم نے اپنا رویہ بدل لیا اور اپنی قوم کے مذہب کی طرف پلٹ آئے تو خیر ورنہ تمہاری گردن ماردی جائے گی۔

اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر یہ ساتوں نوجوان شہر سے بھاگ نکلے اور انہوں نے پہاڑوں کی راہ لی تا کہ کسی غار میں جا چھپیں۔ راستے میں ایک کتا ان کے ساتھ لگ گیا۔ انہوں نے بہتیری کوشش کی کہ وہ ان کا پیچھا چھوڑ دے مگر وہ کسی طرح ان سے الگ نہ ہوا۔ آخر کار ایک بڑے گہرے سے غار کو اچھی جائے پناہ دیکھ کر وہ اس میں چھپ گئے اور کتا اس کے دہانے پر بیٹھ گیا۔ تھکے ماندے تھے اس لیے فوراً ہی سو گئے۔ یہ ۲۵۰ء عیسوی کا واقعہ ہے۔ ۱۹۷ برس بعد ۴۴۷ء عیسوی میں وہ یکا یک بیدار ہوئے جب قیصر تھیوڈوسیَس دوم کا عہد تھا' رومی سلطنت مسیحیت اختیار کر چکی تھی اور شہر افسوس کے باشندے بھی بت پرستی ترک کر چکے تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب رومی باشندوں کے درمیان زندگی بعد موت اور حشر ونشر کے معاملے میں سخت اختلاف برپا تھا او قیصر اس بات پر بہت فکر مند تھا کہ لوگوں کے دلوں سے انکار آخرت کا خیال کیسے نکالا جائے۔ ایک روز اس نے خدا سے دعا کی کہ وہ کوئی ایسی نشانی دکھا دے جس سے لوگ آخرت پر ایمان لے آئیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ ٹھیک اسی زمانے میں یہ نوجوان جاگ اٹھے۔

بیدار ہو کر انہوں نے آپس میں پوچھا کتنی دیر ہم سوئے ہوں گے؟ کسی نے کہا دن بھر۔ کسی نے کہا دن کا کچھ حصہ۔ پھر یہ کہہ کر سب خاموش ہو گئے کہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے ایک ساتھی جین (Jean) کو چاندی کے چند سکے دے کر کھانا لانے کے لیے شہر بھیجا اور اس سے کہا کہ ذرا احتیاط سے کام لینا کہیں لوگ تمہیں

پہچان نہ جائیں۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر لوگوں کو ہمارا پتہ چل گیا تو وہ ہمیں پکڑ لے جائیں گے اور ڈائنا کی پرستش پر مجبور کریں گے۔ مگر جین جب شہر پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دنیا بدلی ہوئی ہے۔ سب لوگ مسیحی ہو گئے ہیں اور ڈائنا کو پوجنے والا کوئی باقی نہیں رہا۔ ایک دکان پر پہنچ کر اس نے کچھ روٹیاں خریدیں اور دکاندار کو چاندی کا ایک سکہ دیا جس پر قیصر ڈیسیس کی تصویر تھی۔ دکاندار یہ سکہ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس نے پوچھا یہ تمہیں کہاں سے ملا۔ جین نے کہا یہ میرا اپنا مال ہے، کہیں سے لایا نہیں ہوں۔ اس پر دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ لوگ جمع ہو گئے۔ حتی کہ کوتوال شہر تک معاملہ پہنچا، کوتوال نے کہا مجھے وہ دفینہ بتاؤ جہاں سے تم یہ سکہ لائے ہو۔ جین نے جواب دیا دفینہ کیسا؟ یہ میرا اپنا مال ہے، میں کسی دفینے کو نہیں جانتا کوتوال نے کہا تمہاری یہ بات ماننے کے قابل نہیں ہے۔ یہ صدیوں پرانا سکہ ہے۔ تم تو ابھی جوان لڑکے ہو، ہمارے بڑے بوڑھوں نے بھی کبھی یہ سکہ نہیں دیکھا۔ یہ ضرور کوئی راز ہے۔ جین نے جب یہ سنا کہ قیصر ڈیسیس کو مرے زمانہ دراز گزر چکا ہے تو دنگ رہ گیا اور کچھ دیر تک بالکل دم بخود رہا۔ پھر آہستہ سے بولا کل ہی تو میں اور میرے چھ ساتھی اس شہر سے بھاگ کر گئے تھے اور ایک غار میں ہم نے پناہ لی تھی تاکہ ڈیسیس کے ظلم سے بچے رہیں۔ جین کی یہ بات سن کر کوتوال بھی حیران ہو گیا اور وہ اس کو لے کر اس غار کی طرف چلا جہاں اس کے بیان کے مطابق یہ لوگ چھپے ہوئے تھے۔ لوگوں کا ایک انبوہ کثیر ان کے ساتھ تھا۔ وہاں پہنچ کر یہ امر پوری طرح تحقیق ہو گیا کہ یہ واقعی قیصر ڈیسیس کے زمانے کے لوگ ہیں۔ قیصر تھیوڈوسیس کو اس کی اطلاع دی گئی۔ وہ خود ان سے ملا اور ان سے برکت لی۔ اس کے بعد یکایک یہ ساتوں آدمی غار میں جا کر لیٹے اور وفات پا گئے۔ اس صریح نشانی کو دیکھ کر لوگ مان گئے کہ واقعی زندگی کے بعد موت برحق ہے پھر قیصر کے حکم سے اس غار پر ایک زیارت گاہ تعمیر کر دی گئی۔''

غار والوں کی یہ داستان جو مسیحی روایت میں بیان ہوئی ہے، قرآن کے بیان کردہ قصے سے اتنی مطابقت رکھتی ہے کہ انہی کو اصحاب کہف قرار دینا بہت زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔ اس پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ یہ قصہ ایشیائے کوچک کے ایک

شہر کا ہے اور قرآن ان واقعات سے بحث نہیں کرتا جو سرزمین عرب کے باہر پیش آئے ہیں، اس لیے اس مسیحی قصے کو اصحاب کہف پر چسپاں کرنا قرآن کے اسلوب سے انحراف ہو گا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اعتراض درست نہیں ہے۔ قرآن مجید میں دراصل جس بات کا التزام کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اہل عرب کو عبرت دلانے کے لیے ان قوموں اور طاقتوں کے حالات پر کلام کیا جائے جن سے وہ واقف تھے، قطع نظر اس سے کہ وہ سرزمین عرب کے حدود میں ہوں یا اس سے باہر۔ اسی بنا پر مصر کی قدیم تاریخ قرآن میں زیر بحث آئی ہے۔ حالانکہ وہ عرب سے باہر واقع ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب مصر کے حالات قرآن میں زیر بحث آ سکتے تھے تو روم کے کیوں نہ آ سکتے تھے؟ اہل عرب جس طرح مصر سے واقف تھے اسی طرح روم سے بھی تو واقف تھے۔ رومی سلطنت کی سرحدیں عین حجاز کی شمالی سرحدوں سے ملی ہوئی تھیں۔ عربوں کے تجارتی قافلے شب و روز رومی علاقوں میں جاتے تھے۔ بہت سے عرب قبائل رومیوں کے زیر اثر تھے۔ روم عربوں کے لیے ہرگز اجنبی ملک نہ تھا۔ سورۂ روم اس پر شاہد ہے۔ علاوہ بریں یہ بات قابل غور ہے کہ اللہ تعالی نے یہ قصہ قرآن مجید میں از خود بیان نہیں فرمایا ہے بلکہ کفار مکہ کے پوچھنے پر اس کا ذکر کیا ہے اور کفار مکہ کو اہل کتاب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا امتحان لینے کے لیے ایسے واقعات دریافت کرنے کا مشورہ دیا تھا جن سے اہل عرب قطعی ناواقف تھے۔

معارف القرآن، مفتی محمد شفیع، جلد پنجم، ص ۵۵۰ تا ۵۶۳

تشریح اللغات

کَھف: پہاڑی غار، جو وسیع ہو، اس کو کہف کہتے ہیں، جو وسیع نہ ہو، اس کو غار کہا جاتا ہے، رقیم: بلفظی اعتبار سے بمعنی المرقوم، یعنی لکھی ہوئی چیز۔ اس مقام پر، اس سے کیا مراد ہے؟، اس میں مفسّرین کے اقوال، مختلف ہیں۔ ضحاک اور سدّی اور ابن جبیر، بروایت ابنِ عباسؓ، اس کے معنی، ایک لکھی ہوئی تختی کے قرار دیتے ہیں، جس پر بادشاہِ وقت نے اصحابِ کہف کے نام کندہ کرکے، غار کے دروازے پر لگا دیا تھا[؟]، اسی وجہ سے اصحابِ کہف کو اصحابُ الرّقیم بھی کہا جاتا ہے، قتادہ، عطیہ، عوفی [اور] مجاہد کا یہ قول ہے کہ رقیم، اس پہاڑ کے نیچے کی وادی کا نام ہے، جس میں اصحابِ کہف کا غار تھا، بعض نے خود، اس پہاڑ کو رقیم کہا ہے، حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے، یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ رقیم کسی لکھی ہوئی تختی کا نام ہے یا کسی بستی کا۔ کعبِ اَحبار، وہب بن منبّہ، حضرت ابنِ عباسؓ سے یہ روایت کرتے ہیں کہ رقیم، اَیلہ یعنی عقبہ کے قریب، ایک شہر کا نام ہے، جو بلادِ روم میں واقع ہے۔ فتیة، فتی کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں: نوجوان۔

﴿فَضَرَبْنَا عَلَىٰ آذَانِهِمْ﴾ کے لفظی معنی، کانوں کو بند کردینے کے ہیں، غفلت کی نیند کو، ان الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے، کیوں کہ نیند کے وقت، سب سے پہلے، آنکھ بند ہوتی ہے، مگر کان اپنا کام کرتے رہتے ہیں، آواز سنائی دیتی ہے، جب نیند مکمّل اور غالب ہوجاتی ہے تو کان بھی، اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں، اور پھر بیداری میں، سب سے پہلے کان، اپنا کام شروع کرتے ہیں کہ آواز سے، سونے والا چونکتا ہے، پھر بیدار ہوتا ہے۔

معارف ومسائل

قصہٗ اصحابِ کہف ورقیم

اس قصہ میں چند مباحث ہیں۔ اوّل، یہ کہ اصحابِ کہف واصحابِ رقیم، ایک ہی

جماعت کے دو نام ہیں، یا یہ الگ الگ دو جماعتیں ہیں، اگرچہ کسی صحیح حدیث میں اس کی کوئی تصریح نہیں، مگر امامِ بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح میں، اصحاب الکھف اور اصحاب الرقیم، دو عنوان الگ الگ دیے، پھر اصحاب الرقیم کے تحت میں، وہ مشہور قصہ، تین شخصوں کے غار میں بند ہوجانے، پھر دعاؤں کے ذریعے راستہ کھل جانے کا ذکر کیا ہے، جو تمام کتبِ حدیث میں مفصّل موجود ہے۔ امامِ بخاری کی اس صنیع سے سمجھا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک، اصحابِ کہف، ایک جماعت ہے اور اصحابِ رقیم، ان تین شخصوں کو کہا گیا ہے جو کسی زمانے میں غار میں چھپے تھے، پھر پہاڑ سے ایک بڑا پتھر، اس غار کے دہانے پر آگرا، جس سے غار بالکل بند ہوگیا، ان کے نکلنے کا راستہ نہ رہا، ان تینوں نے اپنے اپنے خاص نیک اعمال کا واسطہ دے کر، اللہ سے دعاء کی کہ یہ کام، اگر ہم نے خالص آپ کی رضا کے لیے کیا تھا تو اپنے فضل سے ہمارا راستہ کھول دے، پہلے شخص کی دعاء سے پتھر کچھ سرک گیا، روشنی آنے لگی، دوسرے کی دعاء سے اور زیادہ سرکا، پھر تیسرے کی دعاء سے راستہ بالکل کھل گیا۔

لیکن حافظ ابنِ حجرؒ نے شرحِ بخاری میں، واضح کیا ہے کہ از روئے روایتِ حدیث، اس کی کوئی صریح دلیل نہیں ہے کہ اصحابِ رقیم، مذکورہ تین شخصوں کا نام ہے، بات صرف اتنی ہے کہ واقعہٗ غار کے ایک راوی، حضرت نعمان بن بشیرؓ کی روایت میں بعض راویوں نے یہ اضافہ نقل کیا ہے کہ حضرت نعمان بن بشیرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رقیم کا ذکر کرتے ہوئے سنا، آپ ﷺ غار میں بند رہ جانے والے تین آدمیوں کا واقعہ سنا رہے تھے، یہ اضافہ فتح الباری میں بزّار اور طبرانی کی روایت سے نقل کیا ہے، مگر اوّل تو اس حدیث کے عام راویوں کی روایات، جو صحاحِ ستہ اور حدیث کی دوسری کتابوں میں مفصّل موجود ہیں، ان میں کسی نے حضرت نعمان بن بشیر کا یہ جملہ نقل نہیں کیا۔ خود بخاری کی روایت بھی اس جملے سے خالی ہے، پھر اس جملے میں بھی اس کی تصریح نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غار میں بند ہونے والے ان تین شخصوں کو.... اصحاب الرقیم فرمایا تھا، بلکہ الفاظ یہ ہیں کہ آپ ﷺ رقیم کا ذکر فرما رہے تھے، اس ضمن

میں ان تین شخصوں کا ذکر فرمایا، لفظ رقیم کی مراد کے متعلق صحابہ وتابعین اور عام مفسّرین
میں جو اختلافِ اقوال، اوپر نقل کیا گیا ہے وہ خود اس کی دلیل ہے [کہ] رسول اللہ صلّی
علیہ وسلم سے، رقیم کی کوئی مراد متعیّن کرنے کے بارے میں، کوئی روایتِ حدیث نہیں
تھی، ورنہ کیسے ممکن تھا کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم ایک لفظ کی مراد خود متعیّن فرمادیں،
پھر صحابہ وتابعین اور دوسرے مفسّرین اس کے خلاف کوئی قول اختیار کریں۔ اسی لیے
حافظ ابنِ حجر، شارحِ بخاریؒ نے اصحابِ کہف ورقیم کے دو الگ الگ جماعتیں ہونے
سے انکار فرمایا اور صحیح یہ قرار دیا کہ یہ دونوں، ایک ہی جماعت کے نام ہیں، غار میں بند
ہوجانے والے تین شخصوں کا ذکر، رقیم کے ذکر کے ساتھ آگیا ہو، اس سے یہ لازم نہیں آتا
کہ یہی تین شخص، اصحاب الرقیم تھے۔

حافظ ابنِ حجر نے اس جگہ، یہ بھی واضح کردیا کہ قرآن نے جو قصّہ اصحابِ کہف کا
بیان کیا ہے، اس کا سیاق، خود یہ بتلارہا ہے کہ اصحابِ کہف ورقیم، ایک ہی جماعت ہے،
یہی وجہ ہے کہ جمہور مفسّرین اور محدّثین، ان دونوں کے ایک ہی ہونے پر متفق ہیں۔

دوسرا مسئلہ، اس جگہ خود اس قصّے کی تفصیلات کا ہے، جس کے دو حصے ہیں، ایک وہ جو
اس قصّے کی روح اور اصل مقصود ہے، جس سے یہود کے سوال کا جواب بھی ہوجاتا ہے اور
مسلمانوں کے لیے ہدایات ونصائح بھی۔ دوسرا حصّہ وہ ہے جس کا تعلق، اس قصّے کی
صرف تاریخی اور جغرافیائی حیثیت سے ہے۔ بیانِ مقصود میں اس کا کوئی خاص دخل نہیں،
مثلاً یہ قصّہ کس زمانے میں اور کس شہر اور بستی میں پیش آیا، جس کافر بادشاہ سے بھاگ کر،
ان لوگوں نے غار میں پناہ لی تھی، وہ کون تھا، اس کے کیا عقائد وخیالات تھے اور اس نے
ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جس سے یہ بھاگنے اور غار میں چھپنے پر مجبور ہوگئے۔ پھر
یہ کہ ان لوگوں کی تعداد کیا تھی اور زمانہ دراز تک سوتے رہنے کا کل زمانہ کتنا تھا، پھر یہ لوگ
اب تک زندہ ہیں یا مر گئے۔

قرآن حکیم نے اپنے حکیمانہ اصول اور اسلوبِ خاص کے تحت، سارے قرآن میں
ایک قصّہ یوسف علیہ السلام کے سوا، کسی قصّے کو پوری تفصیل اور ترتیب سے بیان نہیں کیا،

جو عام تاریخی کتابوں کا طریقہ ہے، بلکہ ہر قصّے کے صرف وہ اجزاء موقع بموقع بیان
فرمائے ہیں جن سے انسانی ہدایات اور تعلیمات کا تعلق تھا...

قصّۂ اصحابِ کہف میں بھی، یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ قرآن میں، اس کے
صرف وہ اجزاء بیان کیے گئے جو مقصودِ اصلی سے متعلق تھے، باقی اجزاء جو خالص تاریخی یا
جغرافیائی تھے، ان کا کوئی ذکر نہیں فرمایا، اصحابِ کہف کی تعداد اور سونے کے زمانے کی
مدّت کے سوالات کا ذکر تو فرمایا اور جواب کی طرف اشارہ بھی فرمایا، مگر ساتھ ہی یہ بھی
ہدایت کردی کہ ایسے مسائل میں زیادہ غور وفکر اور بحث وتکرار مناسب نہیں، ان کو حوالہ
بخدا تعالیٰ کرنا چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جن کا فرضِ منصبی، معانیِ قرآن کو بیان کرنا ہے، آپ
ﷺ نے بھی کسی حدیث میں ان اجزائے قصّہ کو بیان نہیں فرمایا اور اکابر صحابہ وتابعین
نے اسی قرآنی اسلوب کی بناء پر ایسے معاملات میں، ضابطۂ کار یہ قرار دیا کہ:

أبهموا ما أبهمه الله (اتقان، سیوطی)، یعنی جس غیر ضروری چیز کو اللہ تعالیٰ نے مبہم
رکھا، تم بھی اسے مبہم رہنے دو (کہ اس میں بحث وتحقیق، کچھ مفید نہیں، اکابرِ صحابہ وتابعین
کے اس طرزِ عمل کا مقتضیٰ یہ تھا کہ اس تفسیر میں بھی، ان اجزائے قصّہ کو نظر انداز کردیا جائے
جن کو قرآن اور حدیث نے نظر انداز کیا ہے، لیکن یہ زمانہ، وہ ہے جس میں تاریخی اور
جغرافیائی انکشافات ہی کو سب سے بڑا کمال سمجھ لیا گیا ہے، اور متاخرین علمائے تفسیر نے
اسی لیے کم وبیش ان اجزاء کو بیان فرمادیا ہے، اس لیے زیرِ نظر تفسیر میں قصّے کے وہ اجزاء جو
خود قرآن میں مذکور ہیں، ان کا بیان تو آیاتِ قرآن کی تفسیر کے تحت میں آجائے گا۔ باقی
تاریخی اور جغرافیائی اجزائے قصّہ کو یہاں بقدرِ ضرورت بیان کیا جاتا ہے اور بیان کرنے
کے بعد بھی آخری نتیجہ وہی رہے گا کہ ان معاملات میں کوئی قطعی فیصلہ ناممکن ہے، کیوں
کہ اسلامی اور پھر مسیحی تاریخوں میں، اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ خود اس قدر
مختلف اور متضاد ہے کہ ایک مصنف اپنی تحقیق ورائے کے پیشِ نظر، مقدمات وقرائن کی
مدد سے کسی ایک چیز کو متعین کرتا ہے تو دوسرا، اسی طرح دوسری صورت کو ترجیح دیتا ہے۔

دین کی حفاظت کے لیے غاروں میں پناہ لینے والوں کے واقعات مختلف شہروں اور خطوں میں متعدد ہوئے ہیں

مؤرخین کے اختلافات کی ایک بڑی وجہ، یہ بھی ہے کہ دینِ مسیح علیہ السلام میں چوں کہ رہبانیت کو دین کا سب سے بڑا کام سمجھ لیا گیا تھا، تو ہر خطے اور ہر ملک میں ایسے واقعات متعدد پیش آئے ہیں کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے غاروں میں پناہ گزین ہوگئے، وہیں عمریں گزار دیں، اب جہاں جہاں ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہے، اس پر مؤرخ کو اصحابِ کہف کا گمان ہوجانا کچھ بعید نہیں تھا۔

اصحاب کہف کی جگہ اور ان کا زمانہ:

امامِ تفسیر قرطبی اندلسی نے اپنی تفسیر میں اس جگہ، چند واقعات کچھ سماعی، کچھ چشم دید نقل کیے ہیں، جو مختلف شہروں سے متعلق ہیں۔ قرطبی نے سب سے پہلے تو ضحاک کی روایت سے یہ نقل کیا ہے کہ رقیم، روم کے ایک شہر کا نام ہے، جس کے ایک غار میں اکیس آدمی لیٹے ہوئے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سو رہے ہیں۔ پھر امامِ تفسیر ابنِ عطیہ سے نقل کیا ہے کہ میں نے بہت سے لوگوں سے سُنا ہے کہ شام میں ایک غار ہے جس میں کچھ مُردہ لاشیں ہیں، وہاں کے مجاورین یہ کہتے ہیں کہ یہی لوگ، اصحابِ کہف ہیں، اور اس غار کے پاس ایک مسجد اور مکان کی تعمیر ہے جس کو رقیم کہا جاتا ہے، اور اُن مُردہ لاشوں کے ساتھ ایک مُردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے۔

اور دوسرا واقعہ اندلس [کے شہر] غرناطہ کا نقل کیا ہے، ابنِ عطیہ کہتے ہیں کہ غرناطہ میں ایک لوشہ نامی گاؤں کے قریب ایک غار ہے، جس میں کچھ مردہ لاشیں ہیں اور ان کے ساتھ ایک مردہ کتے کا ڈھانچہ بھی موجود ہے، ان میں سے اکثر لاشوں پر گوشت باقی نہیں رہا، صرف ہڈیوں کے ڈھانچے ہیں، اور بعض پر اب تک گوشت پوست بھی موجود ہے، ان] پر صدیاں گزر گئیں، مگر صحیح سند سے، ان کا کچھ حال معلوم نہیں، کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہی اصحابِ کہف ہیں، ابنِ عطیہ کہتے ہیں کہ یہ خبر سن کر میں خود ۵۰۴ھ میں وہاں

پہنچا تو واقعی یہ لاشیں، اسی حالت پر پائیں اور ان کے قریب ہی ایک مسجد بھی ہے، اور ایک رومی زمانے کی تعمیر بھی ہے جس کو رقیم کہا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں کوئی عالیشان محل ہوگا، اس وقت تک بھی اس کی بعض دیواریں موجود ہیں، اور یہ ایک غیر آباد جنگل میں ہے، اور فرمایا کہ غرناطہ کے بالائی حصے میں ایک قدیم شہر کے آثار ونشانات پائے جاتے ہیں، جو رومیوں کے طرز کے ہیں، اس شہر کا نام رَقیُوس بتلایا جاتا ہے، ہم نے اس کے کھنڈروں میں بہت سے عجائبات اور قبریں دیکھی ہیں۔ قرطبی جو اندلس ہی کے رہنے والے ہیں، ان تمام واقعات کو نقل کرنے کے بعد بھی کسی کو متعین طور پر اصحابِ کہف کہنے سے گریز کرتے ہیں، اور خود ابنِ عطیہ نے بھی اپنے مشاہدے کے باوجود یہ جزم نہیں کیا کہ یہی لوگ، اصحابِ کہف ہیں، محض عام شہرت نقل کی ہے، مگر دوسرے اندلسی مفسّر ابو حیان جو ساتویں صدی [میں] ۶۵۴ھ میں خاص غرناطہ میں پیدا ہوئے، وہیں رہے بسے ہیں، وہ بھی اپنی تفسیر بحرِ محیط میں غرناطہ کے اس غار کا اسی طرح ذکر کرتے ہیں جس طرح قرطبی نے کیا ہے اور ابنِ عطیہ کے اپنے مشاہدے کا ذکر لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ہم جب اندلس میں تھے (یعنی قاہرہ منتقل ہونے سے پہلے) تو بہت لوگ، اس غار کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے، اور یہ کہتے تھے کہ اگرچہ وہ لاشیں اب تک وہاں موجود ہیں، اور زیارت کرنے والے ان کو شمار بھی کرتے ہیں مگر ہمیشہ ان کی تعداد بتانے میں غلطی کرتے ہیں، پھر فرمایا کہ ابنِ عطیہ نے جس شہر رقیوس کا ذکر کیا ہے جو غرناطہ کی جانبِ قبلہ میں واقع ہے تو اس شہر سے میں خود، بے شمار مرتبہ گزرا ہوں، اور اس میں بڑے بڑے.... غیر معمولی پتھر دیکھے ہیں۔ اس کے بعد کہتے ہیں: ويترجح كون أهل الكهف بالأندلس لكثرة دين النصارىٰ بهاحتىٰ هي بلاد مملكتهم العظمىٰ۔ (تفسیر بحرِ محیط، ص۱۰۲، ج۶) ''یعنی اصحابِ کہف کے اندلس میں ہونے کی ترجیح کے لیے یہ بھی قرینہ ہے کہ وہاں، نصرانیت کا غلبہ ہے، یہاں تک کہ یہی خطہ ان کی سب سے بڑی مذہبی مملکت ہے''۔ اس میں یہ بات واضح ہے کہ ابو حیان کے نزدیک اصحابِ کہف کا اندلس میں ہونا راجح ہے۔ (تفسیرِ قرطبی، ص۳۵۶۔۳۵۷، ج۹)

امامِ تفسیر ابنِ جریر اور ابنِ ابی حاتم نے بروایت عوفی، حضرت ابنِ عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ رقیم ایک وادی کا نام ہے جو فلسطین سے نیچے ایلہ (عقبہ) کے قریب ہے، اور ابنِ جریر اور ابنِ ابی حاتم اور چند دوسرے محدثین نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ ''میں نہیں جانتا کہ رقیم کیا ہے، لیکن میں نے کعب احبار سے پوچھا تو انہوں نے بتلایا کہ رقیم، اس بستی کا نام ہے جس میں اصحابِ کہف، غار میں جانے سے پہلے مقیم تھے۔ (روح المعانی)

ابنِ ابی شیبہ، ابن المنذر [اور] ابنِ ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت معاویہؓ کے ساتھ رومیوں کے مقابلے میں ایک جہاد کیا، جس کو غزوۃ المضیق کہتے ہیں، اس موقع پر ہمارا گزر اس غار پر ہوا جس میں اصحابِ کہف ہیں، جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے، حضرت معاویہؓ نے ارادہ کیا کہ غار کے اندر جائیں اور اصحاب کہف کی لاشوں کا مشاہدہ کریں، مگر ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہئے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا مشاہدہ کرنے سے، اس ہستی کو بھی منع کر دیا ہے جو آپ سے بہتر تھی، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، کیوں کہ حق تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ﴿لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَاراً وَّ لَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْباً﴾ (یعنی اگر آپ (ﷺ) ان کو دیکھیں تو آپ ان سے بھاگیں گے اور رعب و ہیبت سے مغلوب ہو جائیں گے)، مگر حضرت معاویہؓ نے ابنِ عباسؓ کی اس بات کو شاید اس لیے قبول نہیں کیا کہ قرآن کریم نے ان کی جو حالت بیان کی ہے، یہ وہ ہے جو ان کی زندگی کے وقت تھی، یہ کیا ضروری ہے کہ اب بھی وہی حالت ہو، اس لیے کچھ آدمیوں کو دیکھنے کے لیے بھیجا، وہ غار پر پہنچے، مگر جب غار میں داخل ہونا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت ہوا بھیج دی، جس نے ان سب کو غار سے نکال دیا۔ (روح المعانی، ص ۲۲۷، ج ۱۵)

مذکور الصدر، روایات و حکایات سے اتنی بات ثابت ہوئی کہ حضرات مفسرین میں سے جن حضرات نے اصحاب کہف کے غار کی جگہ کا پتا دیا ہے، اُن کے اقوال تین مقامات کا پتا دیتے ہیں، ایک خلیجِ فارس [؟؟ خلیجِ فارس کہاں اور خلیج عقبہ کہاں!] کے ساحل عقبہ

(ایلہ) کے قریب، حضرت ابنِ عباسؓ کی بیشتر روایات اسی کی تائید میں ہیں، جیسا کہ مذکورہ روایات میں گزر چکا ہے۔

ابنِ عطیہ کے مشاہدے اور ابوحیان کی تائید سے یہ راجح معلوم ہوتا ہے کہ یہ غار، غرناطہ، اندلس میں ہے، ان دونوں جگہوں میں سے [؟] عقبہ میں ایک شہر یا کسی خاص عمارت کا نام رقیم ہونا بھی بتلایا گیا ہے۔ اسی طرح غرناطہ میں غار کے متصل عظیم الشان شکستہ عمارت کا نام رقیم بتلایا گیا ہے، اور دونوں قسم کی روایات میں کسی نے بھی، اس کا قطعی فیصلہ اور جزم نہیں کیا، کہ یہی غار، اصحاب کہف کا غار ہے، بلکہ دونوں قسم کی روایات کا مدار مقامی شہرت اور سماعی روایات پر ہے، اور تقریباً تمام تفاسیر قرطبی، ابوحیان، ابنِ جریر وغیرہ کی روایات میں اصحابِ کہف جس شہر میں رہتے تھے اس کا قدیم نام افسوس اور اسلامی نام طرسوس بتلایا گیا ہے، اس شہر کا ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر ہونا اہلِ تاریخ کے نزدیک مسلّم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غار بھی ایشیائے کوچک میں ہے، اس لیے کسی ایک کو قطعی طور پر صحیح اور باقی کو غلط کہنے کی کوئی دلیل نہیں، احتمال تینوں جگہ کا ہو سکتا ہے، بلکہ اس احتمال کی بھی کوئی نفی نہیں کر سکتا کہ ان.... غاروں کے واقعات صحیح ہونے کے باوجود بھی، یہ اُن اصحابِ کہف [کا] غار نہ [ہو] جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے، وہ اور کسی جگہ ہو، اور یہ بھی ضروری نہیں کہ رقیم اس جگہ کسی شہر یا عمارت ہی کا نام ہو، بلکہ اس احتمال کی بھی نفی نہیں کی جا سکتی کہ رقیم سے مراد وہ کتبہ ہو جس پر اصحاب کہف کے نام کندہ کر کے غار کے دہانے پر کسی بادشاہ نے لگا دیا تھا۔

جدید مؤرخین کی تحقیق:

عصرِ حاضر کے بعض مؤرخین اور علماء نے مسیحی تاریخوں اور اہلِ یورپ کی تواریخ کی مدد سے غارِ اصحاب کہف کی جگہ اور زمانہ متعین کرنے کے لیے کافی بحث و تحقیق کی ہے۔

ابوالکلام صاحب آزاد نے ایلہ (عقبہ) کے قریب موجودہ شہر پٹرا جس کو عرب مؤرخین بطرا لکھتے ہیں، اس کو قدیم شہر رقیم قرار دیا ہے اور موجودہ تاریخوں سے اس کے

قریب پہاڑ میں ایک غار کے آثار بھی بتلائے ہیں، جس کے ساتھ کسی مسجد کے آثار بھی بتلائے جاتے ہیں، اس کی شہادت میں لکھا ہے کہ بائبل کی کتاب یشوع (باب ۱۸، آیت ۲۷) میں جس جگہ کو رقم یا راقم کہا ہے، یہ وہی مقام ہے جس کو اب پٹرا کہا جاتا ہے، مگر اس پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ کتاب یشوع میں جو رقم یا راقم کا ذکر بنی بن یمین کی میراث کے سلسلے میں آیا ہے، [یہ] علاقہ دریائے اردن کے اور بحر لوط کے مغرب میں واقع تھا، جس میں شہر پٹرا کے ہونے کا کوئی امکان نہیں، اس لیے اس زمانے کے محققینِ آثار قدیمہ نے اس بات کے ماننے میں سخت تامل کیا ہے کہ پٹرا اور راقم، ایک چیز ہیں۔ (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، طبع ۱۹۴۶ء، جلد ۱۷، ص ۶۵۸)۔

اور عام مفسرین نے اصحاب کہف کی جگہ شہرِ افسوس کو قرار دیا ہے جو ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل پر رومیوں کا سب سے بڑا شہر تھا، جس کے کھنڈر اب بھی موجودہ ٹرکی کے شہر ازمیر (سمرنا) سے ۲۰، ۲۵ میل بجانب جنوب پائے جاتے ہیں۔

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب ندویؒ نے بھی ارض القرآن میں شہر پٹرا کا ذکر کرتے ہوئے بین القوسین (رقیم) لکھا ہے، مگر اس کی کوئی شہادت پیش نہیں کی کہ شہر پٹرا کا پرانا نام رقیم تھا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی نے اپنی کتاب قصص القرآن میں اسی کو اختیار فرمایا اور اس کی شہادت میں تورات سفر عدد اور صحیفہ [یسعیاہ] کے حوالے سے شہر پٹرا کا نام راقمہ بیان کیا ہے۔ (ماخوذ از دائرۃ المعارف عرب)

مملکتِ اردن میں عمان کے قریب ایک سنسان جنگل میں ایک غار کا پتا لگا تو حکومت کے محکمۂ آثار قدیمہ نے ۱۹۶۳ء میں، اس جگہ کھدائی کا کام جاری کیا تو اس میں مٹی اور پتھروں کے ہٹانے کے بعد ہڈیوں اور پتھروں سے بھرے ہوئے چھ تابوت اور دو قبریں برآمد ہوئیں، غار کی جنوبی سمت میں پتھروں پر کندہ کچھ نقوش بھی دریافت ہوئے، جو بزنطینی زبان میں ہیں، یہاں کے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہی جگہ رقیم ہے، جس کے پاس اصحاب کہف کا یہ غار ہے، واللہ اعلم۔

حضرت سیدی حکیم الامت تھانویؒ نے بیان القرآن میں تفسیرِ حقانی کے حوالے سے

اصحاب کہف کی جگہ اور مقام کی تاریخی تحقیق یہ نقل کی ہے کہ ظالم بادشاہ جس کے خوف سے بھاگ کر اصحابِ کہف نے غار میں پناہ لی تھی، اس کا زمانہ ۲۵۰ء تھا، پھر تین سو سال تک یہ لوگ سوتے رہے، تو مجموعہ ۵۵۰ء ہوگیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ۵۷۰ء میں ہوئی، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے بیس سال پہلے یہ واقعہ، ان کے بیدار ہونے کا پیش آیا، اور تفسیرِ حقانی میں بھی ان کا مقام شہر افسوس یا طرسوس کو قرار دیا ہے، جو ایشیائے کوچک میں تھا، اب اس کے کھنڈرات موجود ہیں، واللہ اعلم بحقيقة الحال۔

یہ تمام تاریخی اور جغرافیائی تفصیلات ہیں جو قدمائے مفسرین کی روایات سے پھر جدید مؤرخین کے بیانات سے پیش کی گئی ہیں۔ احقر نے پہلے ہی یہ عرض کر دیا تھا کہ نہ قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا، ان پر موقوف ہے نہ اس مقصد کا کوئی ضرور حصہ، ان سے متعلق ہے جس کے لیے قرآن کریم نے یہ قصہ بیان کیا ہے، پھر روایات و حکایات اور ان کے آثار و قرائن، اس درجہ مختلف ہیں کہ ساری تحقیق و کاوش کے بعد بھی، اس کا کوئی قطعی فیصلہ ممکن نہیں، صرف ترجیحات اور رجحانات ہی ہو سکتے ہیں، لیکن آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں تاریخی تحقیقات کا ذوق بہت بڑھا ہوا ہے، اس کی تسکین کے لیے یہ تفصیلات نقل کر دی گئی ہیں، جن سے تقریبی اور تخمینی طور پر اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے قریب پیش آیا، اور بیشتر روایات اس کے شہر افسوس یا طرسوس کے قریب ہونے پر متفق نظر آتی ہیں، واللہ اعلم، اور حقیقت یہ ہے کہ ان تمام تحقیقات کے بعد بھی ہم وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے کہ مقام متعین کرنے کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ اس کی تعیین، کسی یقینی ذریعے سے کی جا سکتی ہے۔ امامِ تفسیر و حدیث ابنِ کثیرؒ نے اس کے متعلق یہی فرمایا ہے کہ: قد أخبرنا الله تعالىٰ بذلك و أراد منا فهمه و تدبره و لم يخبرنا بمكان هذا الكهف في أي البلاد من الأرض إذ لا فائدة لنا فيه و لا قصد شرعي (ابنِ کثیر، ج ۳/۷۵)

"یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمیں اصحابِ کہف کے ان حالات کی خبر دی، جن کا ذکر قرآن میں

ہے تا کہ ہم ان کو سمجھیں اور ان میں تدبر کریں اور اس کی خبر نہیں دی کہ یہ کہف کس زمین اور کس شہر میں ہے، کیوں کہ اس میں ہمارا کوئی فائدہ نہیں اور نہ کوئی شرعی مقصد اس سے متعلق ہے"۔

اصحابِ کہف کا واقعہ کس زمانے میں پیش آیا؟ اور غار میں پناہ لینے کے اسباب کیا تھے؟:

قصے کا یہ ٹکڑا بھی وہی ہے جس پر نہ کسی آیتِ قرآن کا سمجھنا موقوف ہے، نہ مقصد قصہ پر اس کا کوئی خاص اثر ہے، اور نہ قرآن وسنت میں اس کا بیان ہے، صرف تاریخی حکایات ہیں، اسی لیے ابوحیان نے تفسیر البحرالمحیط میں فرمایا: و الرواة مختلفون في قصصهم، و کیف کان اجتماعهم و خروجهم و لم یأت في الحدیث الصحیح کیفیة ذلك و لا في القرآن (بحر محیط ج،۶، ص۱۰۱): ان حضرات کے قصے میں راویوں کا سخت اختلاف ہے اور اس میں کہ یہ اپنے اس پروگرام پر کس طرح متفق ہوئے، اور کس طرح نکلے، نہ کسی صحیح حدیث میں اس کی کیفیت مذکور ہے نہ قرآن میں"۔

تاہم موجودہ طبائع کی دلچسپی کے لیے، جیسے اوپر اصحاب کہف کے مقام سے متعلق کچھ معلومات لکھی گئی ہیں، اس واقعے کے زمانہ وقوع اور اسبابِ وقوع کے متعلق بھی مختصر معلومات تفسیری اور تاریخی روایات سے نقل کی جاتی ہیں، اس قصے کو پوری تفصیل اور استیعاب کے ساتھ، حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیرِ مظہری میں مختلف روایات سے نقل فرمایا ہے، مگر یہاں صرف وہ مختصر واقعہ لکھا جاتا ہے جس کو ابنِ کثیر نے سلف وخلف کے بہت سے مفسّرین کے حوالے سے پیش کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

اصحابِ کہف بادشاہوں کی اولاد اور اپنی قوم کے سردار تھے، قوم بُت پرست تھی ایک روز ان کی قوم اپنے کسی مذہبی میلے کے لیے شہر سے باہر نکلی، جہاں ان کا سالانہ اجتماع ہوتا تھا، وہاں جا کر یہ لوگ اپنے بتوں کی پوجا پاٹ کرتے، اور ان کے لیے جانوروں کی قربانی دیتے تھے، ان کا بادشاہ ایک جبار ظالم، دقیانوس نامی تھا، جو قوم کو اس بت پرستی پر مجبور کرتا تھا۔ اس سال جب کہ پوری قوم اس میلے میں جمع ہوئی، تو یہ اصحاب کہف نوجوان بھی

پہنچے، اور وہاں اپنی قوم کی یہ حرکتیں دیکھیں کہ اپنے ہاتھوں کے تراشے ہوئے پتھروں کو خدا سمجھتے، اور ان کی عبادت کرتے اور ان کے لیے قربانی کرتے ہیں، اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ عقلِ سلیم عطا فرمادی کہ قوم کی اس احمقانہ حرکت سے ان کو نفرت ہوئی، اور عقل سے کام لیا تو ان کی سمجھ میں آگیا کہ یہ عبادت تو صرف اس ذات کی ہونی چاہیے جس نے زمین وآسمان اور ساری مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، یہ خیال بیک وقت ان چند نوجوانوں کے دل میں آیا، اور ان میں سے ہر ایک نے قوم کی اس احمقانہ عبادت سے بچنے کے لیے، اس جگہ سے ہٹنا شروع کیا، ان میں سب سے پہلے ایک نوجوان مجمع سے دور ایک درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گیا، اس کے بعد ایک دوسرا شخص آیا اور وہ بھی اسی درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گیا، اسی طرح پھر تیسرا اور چوتھا آدمی آتا گیا، اور درخت کے نیچے بیٹھتا رہا، مگر ان میں کوئی دوسرے کو نہ پہچانتا تھا اور نہ یہ کہ یہاں کیوں آیا ہے، مگر ان کو درحقیقت اس قدرت نے یہاں جمع کیا تھا جس نے ان کے دلوں میں ایمان پیدا فرمایا۔

قومیّت اور اجتماعیّت کی اصل بنیاد

ابنِ کثیر نے اس کو نقل کر کے فرمایا کہ لوگ تو باہمی اجتماع کا سبب قومیّت اور جنسیّت کو سمجھتے ہیں، مگر حقیقت وہ ہے، جو صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ درحقیقت اتفاق و افتراق، اوّل، ارواح میں پیدا ہوتا ہے، اس کا اثر اس عالم کے ابدان میں پڑتا ہے، جن روحوں کے درمیان ازل میں مناسبت اور اتفاق پیدا ہوا وہ یہاں بھی باہم مربوط اور ایک جماعت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور جن میں یہ مناسبت اور باہمی توافق نہ ہوا بلکہ وہاں علیحدگی رہی، ان میں یہاں بھی علیحدگی رہے گی۔ اسی واقعے کی مثال کو دیکھو کہ کس طرح الگ الگ، ہر شخص کے دل میں ایک ہی خیال پیدا ہوا، اس خیال نے ان سب کو غیر شعوری طور پر ایک جگہ جمع کر دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ، ایک جگہ جمع تو ہو گئے، مگر ہر ایک اپنے عقیدے کو دوسرے سے، اس لیے چھپاتا تھا کہ یہ کہیں جا کر بادشاہ کے .... پاس مخبری نہ کر دے، اور میں،

گرفتار ہو جاؤں، کچھ دیر سکوت کے عالم میں جمع رہنے کے بعد، ان میں سے ایک شخص بولا کہ بھائی ہم سب کے سب کا قوم سے علیحدہ ہو کر، یہاں پہنچنے کا کوئی سبب تو ضرور ہے، مناسب یہ ہے کہ ہم سب باہم ایک دوسرے کے خیال سے واقف ہو جائیں۔ اس پر ایک شخص بول اٹھا کہ حقیقت یہ ہے کہ میں نے اپنی قوم کو جس دین و مذہب اور جس عبادت میں مبتلا پایا، مجھے یقین ہوگیا کہ یہ باطل ہے، عبادت تو صرف اللہ جل شانہ کی ہونی چاہیئے، جس کا تخلیقِ کائنات میں کوئی شریک اور ساجھی نہیں، اب تو دوسروں کو بھی موقع مل گیا، اور ان میں سے ہر ایک نے اقرار کیا کہ یہی عقیدہ اور خیال ہے جس نے مجھے قوم سے علیحدہ کر کے یہاں پہنچایا۔

اب یہ ایک متحد الخیال جماعت ایک دوسرے کی رفیق اور دوست ہوگئی اور انہوں نے الگ اپنی ایک عبادت گاہ بنالی، جس میں جمع ہو کر یہ لوگ، اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کرنے لگے۔

مگر شدہ شدہ، ان کی خبر شہر میں پھیل گئی، اور چغل خوروں نے بادشاہ تک، ان کی خبر پہنچادی۔ بادشاہ نے ان سب کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے تو بادشاہ نے ان کے عقیدے اور طریقے کے متعلق سوال کیا، اللہ نے ان کو ہمت بخشی، انہوں نے بغیر کسی خوف و خطر کے اپنا عقیدۂ توحید بیان کردیا اور خود بادشاہ کو بھی اس کی طرف دعوت دی۔ اسی کا بیان قرآن کریم کی آیات میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَ رَبَطْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا، فَقَالُوا: رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَ مِنْ دُوْنِه اِلٰهًا، لَقَدْ قُلْنَا اِذًا شَطَطًا﴾ (الٰی قوله) ﴿کَذِبًا﴾۔

جب ان لوگوں نے بادشاہ کو بے باک ہو کر، دعوتِ ایمانی دی تو بادشاہ نے اس سے انکار کیا اور ان کو ڈرایا دھمکایا اور ان کے بدن سے وہ عمدہ پوشاک جوان شہزادوں کے بدن پر تھی، اتروادی، تاکہ یہ لوگ اپنے معاملے میں غور کریں اور غور کرنے کے لیے چند روز کی مہلت یہ کہہ کردے دی کہ تم نوجوان ہو میں تمہارے قتل میں اس لیے جلدی نہیں کرتا کہ تم کو غور کرنے کا موقع مل جائے، اب بھی اگر تم اپنی قوم کے دین و مذہب پر

آجاتے ہو تو تم اپنے حال پر رہو گے، ورنہ قتل کردیے جاؤ گے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا لطف و کرم، اپنے مؤمن بندوں پر تھا کہ اس مہلت نے ان لوگوں کے لیے راہِ فرار کھول دی اور یہ لوگ یہاں سے بھاگ کر ایک غار میں روپوش ہوگئے۔

عام روایاتِ مفسّرین، اس پر متفق ہیں کہ یہ لوگ دینِ مسیح علیہ السلام پر تھے، ابنِ کثیر اور دوسرے تمام مفسّرین نے یہ ذکر کیا ہے، اگرچہ ابنِ کثیر نے اس کو قبول اس لیے نہیں کیا کہ اگر یہ لوگ مسیحی دین پر ہوتے تو یہودِ مدینہ، ان سے عداوت کی بناء پر، ان کے واقعے کا سوال نہ کراتے اور ان کو اہمیت نہ دیتے، مگر یہ کوئی ایسی بنیاد نہیں جس کی وجہ سے تمام روایات کو رد کردیا جائے۔ یہودِ مدینہ نے تو محض ایک واقعۂ عجیبہ ہونے کی حیثیت سے اس کا سوال کرایا، جیسے ذوالقرنین کا سوال بھی اسی بناء پر ہے، اس طرح کے سوالات میں یہودیت اور نصرانیت کا تعصب درمیان میں نہ آنا ہی ظاہر ہے۔

تفسیرِ مظہری میں بروایت ابنِ اسحاق، ان لوگوں کو ان موحدین میں شمار کیا ہے جو مسیحی دین کے مٹ جانے کے بعد، ان کے حق پرست لوگ خال خال رہ گئے تھے، جو صحیح دینِ مسیح اور توحید پر قائم تھے۔ ابنِ اسحاق کی روایت میں بھی اس ظالم بادشاہ کا نام دقیانوس بتلایا ہے اور جس شہر میں یہ نوجوان غار میں چھپنے سے پہلے رہتے تھے اس کا نام، افسوس بتلایا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں بھی واقعہ اسی طرح بیان کیا ہے اور بادشاہ کا نام دقیانوس بتلایا ہے۔ ابنِ اسحاق کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اصحابِ کہف کے بیدار ہونے کے وقت، ملک پر دینِ مسیح علیہ السلام کے پابند جن لوگوں کا قبضہ ہوگیا تھا ان کے بادشاہ کا نام بیدوسیس تھا۔

مجموعۂ روایات سے یہ بات تو بظنِ غالب ثابت ہوجاتی ہے کہ اصحابِ کہف صحیح دینِ مسیح علیہ السلام پر تھے اور ان کا زمانہ بعد المسیح ہے اور جس بادشاہ مشرک سے بھاگے تھے اس کا نام دقیانوس تھا، تین سو نو سال کے بعد بیدار ہونے کے وقت جس نیک مؤمن بادشاہ کی حکومت تھی، ابنِ اسحاق کی روایت میں اس کا نام بیدوسیس بتلایا ہے، اس کے

ساتھ موجودہ زمانے کی تاریخوں کو ملا کر دیکھا جائے تو تخمینی اور تقریبی طور پر ان کا زمانہ متعین ہو سکتا ہے، اس سے زیادہ تعیین کی نہ ضرورت ہے اور نہ اس کے علم کے اسباب موجود ہیں۔

کیا اصحابِ کہف اب بھی زندہ ہیں؟

اس معاملے میں صحیح اور ظاہر یہی ہے کہ ان کی وفات ہو چکی ہے، تفسیرِ مظہری میں ابنِ اسحاق کی مفصل روایت میں ہے کہ اصحابِ کہف کی بیداری اور شہر میں ان کے واقعۂ عجیبہ کی شہرت ہو جانے اور اس وقت کے بادشاہ بیدوسیس کے پاس پہنچ کر ملاقات کرنے کے بعد، اصحابِ کہف نے ملِک بیدوسیس سے رخصت چاہی، اور رخصتی سلام کے ساتھ، اس کے لیے دعاء کی اور ابھی بادشاہ اسی جگہ موجود تھا کہ یہ لوگ اپنے لیٹنے کی جگہوں پر جا کر لیٹ گئے، اور اُسی وقت، اللہ تعالیٰ نے ان کو موت دے دی اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی یہ روایت ابنِ جریر، ابنِ کثیر وغیرہ سب ہی مفسّرین نے نقل کی ہے کہ:

قال قتادة: غزا ابن عبّاس مع حبيب بن مسلمة فمرّوا بكهف في بلاد الروم، فرأوا فيه عظاما، فقال قائل: هذه عظام أهل الكهف، فقال ابن عبّاس: لقد بليت عظامهم من أكثر من ثلاث مئة سنة۔ (ابنِ کثیر)

قتادہ کہتے ہیں کہ ابنِ عباسؓ نے حبیب بن مسلمہ کے ساتھ ایک جہاد کیا تو بلادِ روم میں ان کا گزر ایک غار پر ہوا، جس میں مردہ لاشوں کی ہڈیاں تھیں، کسی نے کہا کہ یہ اصحاب کہف کی ہڈیاں ہیں، تو ابنِ عباسؓ نے فرمایا کہ ان کی ہڈیاں تو اب سے تین سو برس پہلے خاک ہو چکی ہیں''۔

یہ سب اس تاریخی قصّے کے وہ اجزاء تھے جن کو نہ قرآن نے بیان کیا، نہ حدیثِ رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اور نہ اس واقعے کا کوئی خاص مقصد یا قرآن کی کسی آیت کا سمجھنا اس پر موقوف ہے، اور نہ تاریخی روایات سے ان چیزوں کا کوئی قطعی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

معارف و مسائل (ص ۶۶۵)

ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے اصحابِ کہف کے تین حال بتائے ہیں اور تینوں عجیب ہیں، جو ان حضرات کی کرامت سے بطور خرقِ عادت ظاہر ہوئے۔

اوّل زمانۂ دراز تک مسلسل نیند کا مسلّط ہونا اور اس میں بغیر کسی غذا وغیرہ کے زندہ رہنا، سب سے بڑی کرامت اور خرقِ عادت ہے، اس کی تفصیل تو اگلی آیات میں آئے گی، یہاں اس کی طویل نیند کی حالت میں، ان کا ایک حال تو یہ بتلایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے غار کے اندر، اس طرح محفوظ رکھا تھا کہ صبح و شام دھوپ ان کے قریب سے گزرتی مگر غار کے اندر ان کے جسموں پر نہ پڑتی تھی۔ قریب سے گزرنے کے فوائد زندگی کے آثار کا قیام [؟] ہوا اور سردی، گرمی کا اعتدال وغیرہ تھے اور ان کے جسموں پر دھوپ نہ پڑنے سے جسموں کی اور ان کے لباس کی حفاظت بھی تھی۔

دھوپ کے ان کے اوپر نہ پڑنے کی یہ صورت غار کی کسی خاص وضع کی بناء پر بھی ہو سکتی ہے کہ اس کا دروازہ جنوب یا شمال میں ایسی وضع پر ہو کہ دھوپ طبعی اور عادی طور پر، اس کے اندر نہ پہنچے۔ ابنِ قتیبہ نے اس کی وضعِ خاص متعین کرنے کے لیے یہ تکلّف کیا کہ ریاضی کے اصول و قواعد کی رو سے اس جگہ کا طولِ بلد، عرضِ بلد اور غار کا رخ متعین کیا (مظہری) اور اس کے بالمقابل زجاج نے کہا کہ دھوپ کا، ان سے الگ رہنا کسی وضع اور ہیئت کی بناء پر نہیں بلکہ ان کی کرامت سے، بطور خرقِ عادت تھا اور اس آیت کے آخر میں جو یہ ارشاد ہے ﴿ذٰلِكَ مِنْ آيَاتِ اللّٰهِ﴾ یہ بھی بظاہر اسی پر دلالت کرتا ہے کہ دھوپ سے حفاظت کا یہ سامان غار کی کسی خاص وضع و ہیئت کا نتیجہ نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی ایک نشانی تھی۔ (قرطبی)

اور صاف بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے ایسا سامان مہیا فرما دیا تھا کہ دھوپ، ان کے جسموں پر نہ پڑے، خواہ یہ سامان، غار کی خاص ہیئت اور وضع کے ذریعے ہو یا کوئی بادل وغیرہ، دھوپ کے وقت حائل کر دیا جاتا ہو یا براہ راست آفتاب کی شعاعوں کو ان سے بطور خرقِ عادت کے ہٹا دیا جاتا ہو۔ آیت میں یہ سب احتمالات

ہیں۔ کسی ایک کو متعین کرنے پر زور دینے کی ضرورت نہیں۔

اصحاب کہف طویل نیند کے زمانے میں اس حالت پر تھے کہ دیکھنے والا ان کو بیدار سمجھے

دوسرا حال یہ بتلایا ہے کہ اصحابِ کہف پر اتنے زمانہ دراز تک نیند مسلط کردینے کے باوجود، ان کے اجسام پر نیند کے آثار نہ تھے، بلکہ ایسی حالت تھی کہ ان کو دیکھنے والا، یہ محسوس کرے کہ وہ جاگ رہے ہیں، عام مفسّرین نے فرمایا کہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، بدن میں ڈھیلاپن جو نیند سے ہوتا ہے وہ نہیں تھا، سانس میں تغیر جو سونے والوں کے ہوجاتا ہے، وہ [بھی] نہیں تھا، ظاہر یہ ہے کہ یہ حالت بھی غیر معمولی اور ایک قسم کی کرامت ہی تھی جس میں بظاہر حکمت، ان کی حفاظت تھی کہ کوئی ان کو سوتا ہوا سمجھ کر، ان پر حملہ نہ کرے، یا جو سامان، ان کے ساتھ تھا، وہ نہ چرالے، اور مختلف کروٹیں بدلنے سے بھی دیکھنے والے کو بیداری کا خیال ہوسکتا ہے اور کروٹیں بدلنے میں، یہ مصلحت بھی تھی کہ مٹی ایک کروٹ کو نہ کھالے۔

اصحاب کہف کا کتا

یہاں ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حدیث صحیح میں آیا ہے کہ جس گھر میں کتا یا تصویر ہو، اس میں فرشتے نہیں ہوتے اور صحیح بخاری کی ایک حدیث میں بروایت ابنِ عمرؓ مذکور ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ جو شخص شکاری کتے یا جانوروں کے محافظ کتے کے علاوہ کتا پالتا ہے تو ہر روز اس کے اجر میں سے دو قیراط گھٹ جاتے ہیں (قیراط ایک چھوٹے سے وزن کا نام ہے)، اور حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ایک تیسری قسم کے کتے کا بھی استثناء آیا ہے، یعنی جو کھیتی کی حفاظت کے لیے پالا گیا ہو۔

ان روایاتِ حدیث کی بناء پر، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان بزرگ، اللہ والوں نے کتا کیوں ساتھ لیا؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ یہ حکم کُتا پالنے کی ممانعت، شریعتِ محمدیہ کا حکم ہے، ممکن ہے کہ دینِ مسیح علیہ السلام میں ممنوع نہ ہو۔ دوسرے یہ بھی قرینِ

قیاس ہے کہ یہ لوگ صاحبِ جائداد، صاحبِ مویشی تھے، ان کی حفاظت کے لیے کتا پالا ہو اور جیسے کتے کی وفاشعاری مشہور ہے، یہ جب شہر سے چلے تو وہ بھی ساتھ لگ لیا۔

نیک صحبت کے برکات کہ اس نے کتے کا بھی اعزاز بڑھادیا

ابنِ عطیہ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد نے بتلایا کہ میں نے ابوالفضل جوہریؒ کا ایک وعظ ۴۶۹ ہجری میں، جامعِ مصر کے اندر سنا، وہ برسرِ منبر یہ فرمارہے تھے کہ جو شخص نیک لوگوں سے محبت کرتا ہے، ان کی نیکی کا حصّہ اس کو بھی ملتا ہے۔ دیکھو اصحابِ کہف کے کتے نے ان سے محبت کی اور ساتھ لگ لیا تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کا ذکر فرمایا۔

قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں ابنِ عطیہ کی روایت نقل کرنے کے بعد فرمایا کہ جب ایک کتا، صلحاء اور اولیاء کی صحبت سے یہ مقام پاسکتا ہے تو آپ قیاس کرلیں کہ مؤمنینِ موحدین جو اولیاء اللہ اور صالحین سے محبت رکھیں، ان کا مقام کتنا بلند ہوگا بلکہ اس واقعے میں ان مسلمانوں کے لیے تسلّی اور بشارت ہے جو اپنے اعمال میں کوتاہ ہیں، مگر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے محبت پوری رکھتے ہیں۔

صحیح بخاری میں بروایت انسؓ مذکور ہے کہ میں اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم ایک روز مسجد سے نکل رہے تھے، مسجد کے دروازے پر ایک شخص ملا اور یہ سوال کیا کہ یا رسول اللہ قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم نے قیامت کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے (جو اس کے آنے کی جلدی کر رہے ہو)، یہ بات سن کر یہ شخص دل میں کچھ شرمندہ ہوا اور پھر عرض کیا کہ میں نے قیامت کے لیے بہت نماز، روزے اور صدقات تو جمع نہیں کیے، مگر میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت رکھتا ہوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہے تو (سن لو کہ) تم (قیامت میں) اسی کے ساتھ ہوگے جس سے محبت رکھتے ہو۔

حضرت انسؓ نے فرماتے ہیں کہ ہم یہ جملۂ مبارکہ، حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے سن کر اتنے خوش ہوئے کہ اسلام لانے کے بعد اس سے زیادہ خوشی کبھی نہ ہوئی تھی اور اس کے بعد

حضرت انسؓ نے فرمایا کہ (الحمدللہ) میں اللہ سے، اس کے رسول سے، ابوبکر وعمر سے محبت رکھتا ہوں، اس لیے اس کا امیدوار ہوں کہ ان کے ساتھ ہوں گا (قرطبی)۔

اصحاب کہف کو اللہ تعالیٰ نے ایسا رعب وجلال عطا فرمادیا تھا کہ جو دیکھے ہیبت کھا کر بھاگ جائے

﴿لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ﴾: ظاہر یہ ہے کہ اس میں خطاب، عام لوگوں کو ہے، اس لیے اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اصحاب کہف کا رعب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی چھا سکتا تھا۔ عام مخاطبین کو فرمایا گیا ہے [کہ] اگر تم ان کو جھانک کر دیکھو تو ہیبت کھا کر بھاگ جاؤ اور ان کا رعب وہیبت تم پر طاری ہوجائے۔

یہ رعب وہیبت کس بناء اور کن اسباب کی وجہ سے تھا۔ اس میں بحث فضول ہے اور اس لیے قرآن وحدیث نے اس کو بیان نہیں کیا، حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لیے، ایسے حالات پیدا فرمادیے تھے کہ ان کے بدن پر دھوپ نہ پڑے اور دیکھنے والا ان کو بیدار سمجھے اور دیکھنے والے پر ان کی ہیبت طاری ہوجائے کہ پوری طرح دیکھ نہ سکے، یہ حالات خاص اسباب طبیعہ [؟طبعیہ] کے راستے سے ہونا بھی ممکن ہے اور بطور کرامت [و] خرقِ عادت کے طریق سے بھی، جب قرآن وحدیث نے اس کی کوئی خاص وجہ متعین نہیں فرمائی تو خالی قیاسات اور تخمینوں سے اس میں بحث کرنا بے کار ہے۔

تفسیرِ مظہری میں اسی کو ترجیح دی ہے اور تائید میں ابنِ ابی شیبہ، ابن المنذر [اور] ابنِ ابی حاتم کی سند سے حضرت ابنِ عباسؓ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں ہم نے روم کے مقابلے میں حضرت معاویہؓ کے ساتھ جہاد کیا جو غزوۃ المضیق کے نام سے معروف ہے۔ اس سفر میں ہمارا گزر اس غار پر ہوا جس میں اصحابِ کہف ہیں۔ حضرت معاویہؓ نے ارادہ کیا کہ اصحاب کہف کی تحقیق اور مشاہدے کے لیے غار میں جائیں۔ ابنِ عباسؓ نے منع کیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے بڑی اور بہتر ہستی (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کے مشاہدے سے منع کردیا ہے اور یہی آیت پڑھی ﴿لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ﴾ (اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابنِ عباسؓ کے نزدیک ﴿لَوِ اطَّلَعْتَ﴾ کا

خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تھا)، مگر حضرت معاویہؓ نے ابن عباسؓ کی رائے کو قبول نہیں کیا (غالباً وجہ یہ ہوگی کہ انہوں نے آیت کا مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے عام مخاطبین کو قرار دیا ہوگا، یا یہ کہ یہ حالت قرآن نے اس وقت کی بیان کی ہے جس وقت اصحابِ کہف زندہ تھے اور سو رہے تھے، اب ان کی وفات کو عرصہ ہو چکا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ اب بھی وہی رعب وہیبت کی کیفیت موجود ہو بہر حال) حضرت معاویہؓ نے ابنِ عباس کی بات قبول نہ کی اور چند آدمی تحقیق ومشاہدے کے لیے بھیج دیے، جب لوگ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایک سخت گرم ہوا بھیج دی جس کی وجہ سے کچھ نہ دیکھ سکے (مظہری)۔

معارف ومسائل

﴿وَكَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ﴾۔ اس آیت میں اصحابِ کہف کے راز کا اہلِ شہر پر منکشف ہوجانا اور اس کی حکمت، عقیدۂ آخرت وقیامت، کہ سب مردے دوبارہ زندہ ہوں گے، اس پر ایمان ویقین حاصل ہونا، بیان فرمایا ہے، تفسیرِ قرطبی میں اس کا مختصر قصہ اس طرح مذکور ہے کہ:

اصحابِ کہف کا حال اہلِ شہر پر کھل جانا

اصحابِ کہف کے نکلنے کے وقت جو ظالم اور مشرک بادشاہ دقیانوس اس شہر پر مسلط تھا، وہ مرگیا، اور اس پر صدیاں گزر گئیں، یہاں تک [کہ] اس مملکت پر قبضہ، اہلِ حق کا ہوگیا جو توحید پر یقین رکھتے تھے، ان کا بادشاہ، ایک نیک صالح آدمی تھا (جس کا نام تفسیرِ مظہری میں تاریخی روایات سے بیدوسیس لکھا ہے)۔ اس کے زمانے میں اتفاقاً قیامت اور اس میں، سب مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کے مسئلے میں کچھ اختلافات پھیل گئے، ایک فرقہ اس کا منکر ہوگیا کہ یہ بدن گلنے سڑنے پھر ریزہ ریزہ ہوکر، ساری دنیا میں پھیل جانے کے بعد پھر زندہ ہوجائیں گے، بادشاہِ وقت بیدوسیس کو اس کی فکر ہوئی کہ کس طرح، ان کے شکوک وشبہات دور کیے جائیں، جب کوئی تدبیر نہ بنی تو اس نے ٹاٹ کے

کپڑے پہنے اور راکھ کے ڈھیر پر بیٹھ کر اللہ سے دُعا کی اور الحاح وزاری شروع کی کہ یا
اللہ آپ ہی کوئی ایسی صورت پیدا فرمادیں کہ ان لوگوں کا عقیدہ صحیح ہوجائے اور یہ راہ پر
آجائیں۔ اس طرف، یہ بادشاہ گریہ وزاری اور دعا میں مصروف تھا، دوسری طرف اللہ
تعالیٰ نے اس کی دعا کی قبولیت کا یہ سامان کر دیا کہ اصحابِ کہف بیدار ہوئے اور انہوں
نے اپنے ایک آدمی کو (جس کا نام تملیخا بتلایا جاتا ہے)، ان کے بازار میں بھیج دیا، وہ کھانا
خریدنے کے لیے دُکان پر پہنچا اور تین سو برس پہلے بادشاہ، دقیانوس کے زمانے کا سکّہ،
کھانے کی قیمت میں پیش کیا تو دُکان دار حیران رہ گیا کہ یہ سکّہ کہاں سے آیا، کس زمانے
کا ہے؟ بازار کے دوسرے دُکان داروں کو دکھلایا، سب نے یہ کہا کہ اس شخص کو کہیں پُرانا
خزانہ ہاتھ آگیا ہے، اس میں سے یہ سکّہ نکال کر لایا ہے، اس نے انکار کیا کہ نہ مجھے کوئی
خزانہ ملا، نہ کہیں سے لایا یہ میرا اپنا روپیہ ہے۔

بازار والوں نے اس کو گرفتار کر کے بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا، یہ بادشاہ، جیسا کہ
اوپر بیان ہوا ہے، ایک نیک، صالح، اللہ والا تھا، اور اس نے سلطنت کے پُرانے خزانے
کے آثار قدیمہ [؟] میں، کہیں وہ تختی بھی دیکھی تھی جس میں اصحابِ کہف کے نام اور ان
کے فرار ہوجانے کا واقعہ بھی لکھا ہوا تھا، بعض کے نزدیک، خود ظالم بادشاہ دقیانوس نے یہ
تختی لکھوائی تھی کہ یہ اشتہاری مجرم ہیں، ان کے نام اور پتے محفوظ رہیں، جب کہیں ملیں،
گرفتار کر لیے جائیں، اور بعض روایات میں ہے کہ شاہی دفتر میں بعض ایسے مؤمن بھی
تھے جو دل سے بُت پرستی کو بُرا سمجھتے اور اصحابِ کہف کو حق پر سمجھتے تھے، مگر ظاہر کرنے کی
ہمت نہیں تھی، انہوں نے یہ تختی بطور یادگار کے لکھ لی تھی، اسی تختی کا نام، رقیم ہے۔ جس کی
وجہ سے اصحابِ کہف کو اصحابِ رقیم بھی کہا گیا۔

الغرض اس بادشاہ کو اس واقعے کا کچھ علم تھا، اور اس وقت وہ اس دعا میں مشغول تھا
کہ کسی طرح لوگوں کو اس بات کا یقین آجائے کہ مُردہ اجسام کو دوبارہ زندہ کر دینا، اللہ
تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے سامنے کچھ بعید نہیں۔

اس لیے تملیخا سے اس کے حالات کی تحقیق کی تو اس کو اطمینان ہوگیا کہ یہ انہی لوگوں

میں سے ہے اور اس نے کہا کہ میں تو اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرتا تھا کہ مجھے ان لوگوں سے
ملادے جو دقیانوس کے زمانے میں اپنا ایمان بچا کر بھاگے تھے؟۔ بادشاہ اس پر مسرور ہوا
اور کہا کہ شاید اللہ تعالیٰ نے میری دعا قبول فرمائی، اس میں لوگوں کے لیے شاید کوئی ایسی
حجت ہو جس سے ان کو حشرِ اجساد کا یقین آجائے، یہ کہہ کر اس شخص سے کہا کہ مجھے اس غار
پر لے چلو جہاں سے تم آئے ہو۔

بادشاہ، بہت سے اہلِ شہر کے مجمع کے ساتھ غار پہنچا، جب غار، قریب آیا تو تملیخا نے
کہا کہ آپ ذرا ٹھہریں، میں جا کر اپنے ساتھیوں کو حقیقتِ معاملہ سے باخبر کر دوں کہ اب
بادشاہ مسلمان موحّد ہے اور قوم بھی مسلمان ہے، وہ ملنے کے لیے آئے ہیں، ایسا نہ ہو کہ
اطلاع سے پہلے آپ پہنچیں تو وہ سمجھیں کہ ہمارا دشمن بادشاہ چڑھ آیا ہے، اس کے مطابق
تملیخا نے پہلے جا کر ساتھیوں کو تمام حالات سنائے تو وہ لوگ، اس سے بہت خوش ہوئے،
بادشاہ کا استقبال، تعظیم کے ساتھ کیا، پھر وہ اپنے غار کی طرف لوٹ گئے، اور اکثر روایات
میں یہ ہے کہ جس وقت تملیخا نے ساتھیوں کو یہ سارا قصہ سنایا، اسی وقت سب کی وفات
ہوگئی، بادشاہ سے ملاقات نہیں ہوسکی، بحر محیط میں ابوحیّان نے اس جگہ یہ روایت نقل کی
ہے کہ ملاقات کے بعد اہلِ غار نے بادشاہ اور اہلِ شہر سے کہا کہ اب ہم آپ سے رخصت
چاہتے ہیں اور غار کے اندر چلے گئے، اسی وقت اللہ تعالیٰ نے ان سب کو وفات دے دی۔
واللہ أعلم بحقیقة الحال۔

بہرحال اب اہلِ شہر کے سامنے یہ عجیبہ [؟] قدرتِ الٰہیہ کا واشگاف ہو کر آگیا تو
سب کو یقین ہوگیا کہ جس ذات کی قدرت میں یہ داخل ہے کہ تین سو برس تک زندہ
انسانوں کو بغیر کسی غذا اور سامانِ زندگی کے زندہ رکھے اور اس طویل عرصے تک ان کو نیند
میں رکھنے کے بعد پھر صحیح سالم، قوی، تندرست اٹھادے، اس کے لیے یہ کیا مشکل ہے کہ
مرنے کے بعد بھی، پھر ان اجسام کو زندہ کر دے۔

اس واقعے سے ان کے انکار کا سبب دور ہوگیا کہ حشرِ اجساد کو مستبعد اور خارج از
قدرت سمجھتے تھے، اب معلوم ہوا کہ مالک الملکوت کی قدرت کو انسانی قدرت پر قیاس کرنا

خود جہالت ہے۔ اسی کی طرف، اس آیت میں اشارہ فرمایا ﴿لِيَعْلَمُوْا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّ اَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا﴾ یعنی ہم نے اصحاب کہف کو زمانہ دراز تک سُلانے کے بعد جگا کر بٹھا دیا تا کہ لوگ سمجھ لیں کہ اللہ کا وعدہ یعنی قیامت میں سب مُردوں کے اجسام کو زندہ کرنے کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں۔

اصحابِ کہف کی وفات کے بعد لوگوں میں اختلافِ رائے

اصحاب کہف کی بزرگی اور تقدس کے تو سب ہی قائل ہو چکے تھے، ان کی وفات کے بعد، سب کا خیال ہوا کہ غار کے پاس کوئی عمارت بطور یادگار کے بنائی جائے، عمارت کے بارے میں اختلاف رائے ہوا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ شہر میں اب بھی کچھ بُت پرست لوگ موجود تھے، وہ بھی اصحابِ کہف کی زیارت کو آتے تھے، ان لوگوں نے عمارت بنانے میں یہ رائے دی کہ کوئی رفاہِ عام کی عمارت بنا دی جائے، مگر اربابِ حکومت اور بادشاہ مسلمان تھے اور انہی کا غلبہ تھا، ان کی رائے یہ ہوئی کہ یہاں مسجد بنا دی جائے جو یادگار بھی رہے اور آئندہ بُت پرستی سے بچانے کا سبب بھی بنے، یہاں اختلاف رائے کا ذکر کرتے ہوئے درمیان میں قرآن کا یہ جملہ ہے ﴿ربهم أعلم بهم﴾ یعنی ان کا رب ان کے حالات کو پوری طرح جانتا ہے۔

تفسیر بحر محیط میں، اس جملے کے معنی میں دو احتمال ذکر کیے ہیں، ایک یہ کہ یہ قول، انہی حاضرینِ اہلِ شہر کا ہو، کیوں کہ ان کی وفات کے بعد جب ان کی یادگار بنانے کی رائے ہوئی تو جیسا عموماً یادگاری تعمیرات میں ان لوگوں کے نام اور خاص حالات کا کتبہ لگایا جاتا ہے، جن کی یادگار میں تعمیر کی گئی ہے، تو ان کے نسب اور حالات کے بارے میں مختلف گفتگوئیں ہونے لگیں، جب کسی حقیقت پر نہ پہنچے تو خود انہوں نے ہی آخر میں عاجز ہو کر کہہ دیا ﴿رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ﴾ اور یہ کہہ کر اصل کام یعنی یادگار بنانے کی طرف متوجہ ہو گئے، جو لوگ غالب تھے ان کی رائے مسجد بنانے کی ہو گئی۔

دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ یہ کلام حق تعالیٰ کی طرف سے ہے، جس میں، اس زمانے

کے باہم جھگڑا اور اختلاف کرنے والوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جب تمہیں حقیقت کا علم نہیں اور اس کے علم کے ذرائع بھی تمہارے پاس نہیں تو کیوں اس بحث میں وقت ضائع کرتے ہو، اور ممکن ہے کہ زمانہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں یہود وغیرہ جو اس واقعے میں، اسی طرح کی بے اصل باتیں اور بحثیں کیا کرتے تھے، ان کو تنبیہ مقصود ہو۔ و اللہ سبحانہ و تعالیٰ أعلم۔

معارف ومسائل

اختلافی بحثوں میں گفتگو کے آداب

﴿سَيَقُوْلُوْنَ﴾ یعنی وہ لوگ کہیں گے، وہ کہنے والے کون لوگ ہیں۔ اس میں دو احتمال ہیں، ایک یہ کہ مراد، ان سے وہی لوگ ہوں جن کا باہم اختلاف اصحابِ کہف کے زمانے میں، ان کے نام و نسب وغیرہ کے متعلق ہوا تھا، جس کا ذکر اس سے پہلی آیت میں آیا ہے، انہی لوگوں میں سے بعض نے عدد کے متعلق پہلا، بعض نے دوسرا، بعض نے تیسرا قول اختیار کیا تھا۔ (ذكره في البحر عن الماوردي)

اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ ﴿سَيَقُوْلُوْنَ﴾ کی ضمیر نصاریٰ نجران کی طرف عائد ہو، جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی تعداد کے بارے میں مناظرہ کیا تھا، ان کے تین فرقے تھے ایک فرقہ ملکانیہ کے نام سے موسوم تھا، اس نے تعداد کے متعلق پہلا قول کہا، یعنی تین کا عدد بتلایا، دوسرا فرقہ یعقوبیہ تھا، اس نے دوسرا قول یعنی پانچ ہونا اختیار کیا، تیسرا فرقہ نسطوریہ تھا، اس نے تیسرا قول کہا کہ سات تھے، اور بعض نے کہا کہ یہ تیسرا قول مسلمانوں کا تھا[؟]، اور بالآخر، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر اور قرآن کے اشارے سے تیسرے قول کا صحیح ہونا معلوم ہوا۔ (بحر محیط)

﴿وَ ثَامِنُهُمْ﴾ یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ اس جگہ اصحابِ کہف کی تعداد میں، تین قول نقل کیے گئے ہیں، تین، پانچ، سات، اور ہر ایک کے بعد ان کے کتے کو شمار کیا گیا ہے، لیکن پہلے دو قول میں ان کی تعداد اور کتے کے شمار میں واو عاطفہ نہیں لا گیا، ﴿ثَلٰثَةٌ

رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ اور ﴿خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ بلا واوِ عاطفہ کے آیا، اور تیسرے قول میں ﴿سَبْعَةٌ﴾ کے بعد واوِ عاطفہ کے ساتھ ﴿وَثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ فرمایا۔ اس کی وجہ حضرات مفسرین نے یہ لکھی ہے کہ عرب کے لوگوں میں عدد کی پہلی گرہ سات ہی ہوتی تھی سات کے بعد جو عدد آئے، وہ الگ سا شمار ہوتا تھا، جیسا کہ آج کل نو کا عدد، اس کے قائم مقام ہے کہ نو تک اکائی ہے، دس سے دہائی شروع ہوتی ہے، ایک الگ سا عدد ہوتا ہے، اسی لیے تین سے لے کر سات تک جو تعداد شمار کرتے ... تو اس میں واوِ عطف نہیں لاتے تھے، سات کے بعد کوئی عدد بتلانا ہوتا تو واوِ عاطفہ کے ساتھ الگ کر کے، بتلاتے تھے، اور اسی لیے اس واؤ کو واوِ ثمان [واو الثمانیة] کا لقب دیا جاتا تھا۔ (مظہری وغیرہ)

اسمائے اصحابِ کہف

اصل بات تو یہ ہے کہ کسی صحیح حدیث سے اصحابِ کہف کے نام صحیح صحیح ثابت نہیں، تفسیری اور تاریخی روایات میں نام مختلف بیان کیے گئے ہیں، ان میں اقرب وہ روایت ہے جس کو طبرانی نے معجمِ اوسط میں، بسندِ صحیح حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے نقل کیا ہے کہ اُن کے نام یہ تھے: مکسلمینا، تملیخا، مرطونس، سنونس، سارینونس، ذونواس، کعسططیونس۔

﴿فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا، وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِّنْهُمْ أَحَدًا﴾

یعنی آپ اصحابِ کہف کی تعداد وغیرہ کے متعلق ان کے ساتھ بحث و مباحثہ میں کاوش نہ کریں، بلکہ سرسری بحث فرماویں، اور ان لوگوں سے آپ خود بھی کوئی سوال اس کے متعلق نہ کریں۔

اختلافی معاملات میں طویل بحثوں سے اجتناب کیا جائے

ان دونوں جملوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو تعلیم دی گئی ہے، وہ درحقیقت علمائے امت کے لیے، اہم رہنما اصول ہیں کہ جب کسی مسئلے میں اختلاف پیش

آئے تو جس قدر ضروری بات ہے، اس کو واضح کر کے بیان کر دیا جائے، اس کے بعد بھی لوگ غیر ضروری بحث میں الجھیں تو ان کے ساتھ سرسری گفتگو کر کے بحث ختم کر دی جائے۔ اپنے دعوے کے اثبات میں کاوش اور ان کی بات کی تردید میں بہت زور لگانے سے گریز کیا جائے کہ اس کا کوئی خاص فائدہ تو ہے نہیں، مزید بحث و تکرار میں وقت کی اضاعت بھی ہے اور باہم تلخی پیدا ہونے کا خطرہ بھی۔

دوسری ہدایت، دوسرے جملے میں یہ دی گئی ہے کہ وحیِ الٰہی کے ذریعے سے قصۂ اصحابِ کہف کی جتنی معلومات، آپ کو دے دی گئی ہیں، اُن پر قناعت فرماویں کہ وہ بالکل کافی ہیں، زائد کی تحقیقات اور لوگوں سے سوال وغیرہ میں نہ پڑیں، اور دوسروں سے سوالات کا ایک پہلو، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی جہالت یا ناواقفیت ظاہر کرنے اور ان کو رسوا کرنے کے لیے سوال کیا جائے، یہ بھی اخلاقِ انبیاء کے خلاف ہے، اس لیے دوسرے لوگوں سے دونوں طرح کے سوال کرنا ممنوع کر دیا گیا، یعنی تحقیق مزید کے لیے ہو یا مخاطب کی تجہیل و رسوائی کے لیے ہو۔

کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، از مولانا احمد رضا خاں، صفحہ ۵۲۹ تا ۵۳۳

"کیا تمہیں معلوم ہوا کہ پہاڑ کی کھوہ اور جنگل کے کنارے والے ہماری ایک نشانی تھے" حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ رقیم اس وادی کا نام ہے جس میں اصحاب کہف ہیں۔ آیت میں ان اصحاب کی نسبت فرمایا کہ "جب ان نوجوانوں نے" اپنی کافر قوم سے اپنا ایمان بچانے کے لیے "غار میں پناہ لی، پھر بولے اے ہمارے رب ہمیں اپنے پاس سے رحمت دے" اور ہدایت و نصرت اور رزق و مغفرت اور دشمنوں سے امن عطا فرما، اصحاب کہف [کے بارے میں] قوی ترین قول یہ ہے کہ [وہ] سات حضرات تھے اگرچہ ان کے ناموں میں کسی قدر اختلاف ہے لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت پر [تفسیر] جو خازن میں ہے ان کے نام یہ ہیں: کمل مینا، یملیخا، مرطونس، بینونس، ساریونس، ذونوانس، کشفیط طنونس [اصل میں واضح نہیں ہے کہ کون سا نام کہاں ختم ہوا ہے] اور ان کے کتے کا نام قطمیر ہے۔

خواص: یہ اسماء لکھ کر دروازے پر لگادیے جائیں تو مکان جلنے سے محفوظ رہتا ہے، سرمایہ پر رکھ دیے جائیں تو چوری نہیں جاتا، کشتی یا جہاز ان کی برکت سے غرق نہیں ہوتا، بھاگا ہوا شخص ان کی برکت سے واپس آجاتا ہے، کہیں آگ لگی ہو اور یہ اسماء کپڑے میں لکھ کر ڈال دیے جائیں تو وہ بجھ جاتی ہے، بچے کے رونے، باری کے بخار، درد سر، اُمّ الصبیان، خشکی و تری کے سفر میں جان و مال کی حفاظت عقل کی تیزی، قیدیوں کی آزادی کے لیے یہ اسماء لکھ کر بطریق تعویذ بازو میں باندھے جائیں (جمل)۔

واقعہ [یہ ہے کہ] حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد اہل انجیل کی حالت بدتر ہوگئی، وہ بت پرستی میں مبتلا ہوئے اور دوسروں کو بت پرستی پر مجبور کرنے لگے، ان میں دقیانوس بادشاہ بڑا جابر تھا، جو بت پرستی پر راضی نہ ہوتا اس کو قتل کر ڈالتا، اصحاب کہف شہر افسوس کے شرفاء و معززین میں سے ایماندار لوگ تھے، دقیانوس کے جبر و ظلم سے اپنا ایمان بچانے

کے لیے بھاگے اور قریب کے پہاڑ میں ایک غار کے اندر پناہ گزیں ہوئے، وہاں سو گئے، تین سو برس سے زیادہ عرصہ تک اسی حالت میں رہے، بادشاہ کو جستجو سے معلوم ہوا کہ وہ غار کے اندر ہیں تو اس نے حکم دیا کہ غار کو ایک سنگین دیوار کھینچ کر بند کر دیا جائے تا کہ وہ اس میں مر کر رہ جائیں اور وہ ان کی قبر ہو جائے، یہی ان کی سزا ہے، عمال حکومت میں سے یہ کام جس کے سپرد کیا گیا وہ نیک آدمی تھا' اس نے ان اصحاب کے نام، تعداد، پورا واقعہ رانگ کی تختی پر کندہ کرا کر تانبے کے صندوق میں دیوار کی بنیاد کے اندر محفوظ کر دیا۔ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اسی طرح ایک تختی شاہی خزانہ میں بھی محفوظ کرادی گئی، کچھ عرصہ بعد دقیانوس ہلاک ہوا، زمانے گزرے، سلطنتیں بدلیں تا آنکہ ایک نیک بادشاہ فرمانروا ہوا، اس کا نام بیدروس تھا جس نے اڑسٹھ سال حکومت کی پھر ملک میں فرقہ بندی پیدا ہوئی اور بعض لوگ مرنے کے بعد اٹھنے اور قیامت آنے کے منکر ہو گئے، بادشاہ ایک تنہا مکان میں بند ہو گیا اور اس نے گریہ وزاری سے بارگاہ الٰہی میں دعا کی، یارب کوئی ایسی نشانی ظاہر فرما جس سے خلق کو مُردوں کے اٹھنے اور قیامت آنے کا یقین حاصل ہو، اسی زمانہ میں ایک شخص نے اپنی بکریوں کے لیے آرام کی جگہ حاصل کرنے کے واسطے اسی غار کو تجویز کیا اور دیوار گرادی، دیوار گرنے کے بعد کچھ ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ گرانے والے بھاگ گئے، اصحاب کہف بحکم الٰہی فرحاں و شاداں اٹھے، چہرے شگفتہ، طبیعتیں خوش، زندگی کی تروتازگی موجود، ایک نے دوسرے کو سلام کیا، نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، فارغ ہو کر یملیخا سے کہا کہ آپ جائیے اور بازار سے کچھ کھانے کو بھی لائیے اور یہ بھی خبر لائیے کہ دقیانوس کا ہم لوگوں کی نسبت کیا ارادہ ہے؟ وہ بازار گئے اور شہر پناہ کے دروازے پر اسلامی علامت دیکھی، نئے نئے لوگ پائے، انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام کی قسم کھاتے سنا، تعجب ہوا یہ کیا معاملہ ہے، کل تو کوئی شخص اپنا ایمان نہیں ظاہر کر سکتا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نام لینے سے قتل کر دیا جاتا تھا، آج اسلامی علامتیں شہر پناہ پر ظاہر ہیں، لوگ بے خوف و خطر حضرت کے نام قسمیں کھاتے ہیں۔ پھر آپ نان پز کی دوکان پر گئے، کھانے خریدنے کے لیے اس کو دقیانوسی سکہ کا روپیہ دیا جس کا چلن صدیوں سے موقوف ہو گیا تھا اور اس کو

دیکھنے والا بھی کوئی باقی نہ رہا تھا، بازار والوں نے خیال کیا کہ کوئی پرانا خزانہ ان کے ہاتھ آ گیا ہے، انہیں پکڑ کر حاکم کے پاس لے گئے وہ نیک شخص تھا اس نے بھی ان سے دریافت کیا کہ خزانہ کہاں ہے؟ انہوں نے کہا خزانہ کہیں نہیں ہے یہ روپیہ ہمارا اپنا ہے۔ حاکم نے کہا یہ بات کسی طرح قابل یقین نہیں، اس میں جو سنہ موجود ہے وہ تین سو برس سے زیادہ کا ہے اور آپ نوجوان ہیں ہم لوگ بوڑھے ہیں ہم نے تو کبھی یہ سکہ دیکھا ہی نہیں، آپ نے فرمایا میں جو دریافت کروں وہ ٹھیک ٹھیک بتاؤ تو عقدہ حل ہو جائے گا، یہ بتاؤ کہ دقیانوس بادشاہ کس حال وخیال میں ہے؟ حاکم نے کہا آج روئے زمیں پر اس نام کا کوئی بادشاہ نہیں، سینکڑوں برس ہوئے جب ایک بے ایمان بادشاہ اس نام کا گزرا ہے۔ آپ نے فرمایا کل ہی تو ہم اس کے خوف سے جان بچا کر بھاگے ہیں، میرے ساتھی قریب کے پہاڑ میں ایک غار کے اندر پناہ گزیں ہیں، چلو میں تمہیں ان سے ملا دوں، حاکم اور شہر کے عمائد اور خلق کثیر ان کے ہمراہ سر غار پہنچے، اصحاب کہف یملیخا کے انتظار میں تھے، کثیر لوگوں کے آنے اور کھٹکے سن کر سمجھے کہ یملیخا پکڑے گئے اور دقیانوسی فوج ہماری جستجو میں آ رہی ہے، اللہ کی حمد اور شکر بجا لانے لگے [؟] اتنے میں یہ لوگ پہنچے، یملیخا نے تمام قصہ سنایا، ان حضرات نے سمجھ لیا کہ ہم بحکم الٰہی اتنا طویل زمانہ سوئے اور اب اس لیے اٹھائے گئے ہیں کہ لوگوں کے لیے بعد موت زندہ کیے جانے کی دلیل اور نشانی ہوں، حاکم سر غار پہنچا تو اس نے تانبے کا صندوق دیکھا، اس کو کھولا تو تختی برآمد ہوئی، اس تختی میں ان اصحاب کے اسماء اور ان کے کتے کا نام لکھا تھا، یہ بھی لکھا تھا کہ یہ جماعت اپنے دین کی حفاظت کے لیے دقیانوس کے ڈر سے اس غار میں پناہ گزیں ہوئی، دقیانوس نے خبر پا کر ایک دیوار سے انہیں غار میں بند کر دینے کا حکم دیا، ہم یہ حال اس لیے لکھتے ہیں جب کبھی یہ غار کھلے تو لوگ حال پر مطلع ہو جائیں، یہ لوح پڑھ کر سب کو تعجب ہوا اور لوگ اللہ کی حمد وثناء بجا لائے کہ اس نے ایسی نشانی ظاہر فرما دی جس سے موت کے بعد اٹھنے کا یقین حاصل ہوتا ہے۔ حاکم نے اپنے بادشاہ بیدروس کو واقعہ کی اطلاع دی وہ امراء وعمائد کو لے کر حاضر ہوا اور سجدۂ شکر الٰہی بجا لایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی دعا قبول کی۔ اصحاب

کہف نے بادشاہ سے معانقہ کیا اور فرمایا ہم تمہیں اللہ کے سپرد کرتے ہیں۔ والسلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اللہ تیری اور تیرے ملک کی حفاظت فرمائے اور جن وانس کے شر سے بچائے۔ بادشاہ کھڑا ہی تھا کہ وہ حضرات اپنے خواب گاہوں کی طرف واپس ہو کر مصروف خواب ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں وفات دی۔ بادشاہ نے سال کے صندوق میں ان کے اجساد کو محفوظ کیا اور اللہ تعالیٰ نے رعب سے ان کی حفاظت فرمائی کہ کسی کی مجال نہیں کہ وہاں پہنچ سکے، بادشاہ نے سر غار مسجد بنانے کا حکم دیا، اور ایک سرور کا دن معین کیا کہ ہر سال لوگ عید کی طرح وہاں آیا کریں (خازن وغیرہ)۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ صالحین میں عرس کا معمول قدیم سے ہے۔

''تو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر گنتی کے کئی برس تھپکا'' یعنی انہیں ایسی نیند سلا دیا کہ کوئی آواز بیدار نہ کر سکے ''پھر ہم نے انہیں جگایا کہ دیکھیں'' کہ اصحاب کہف کے ''دو گروہوں میں کون ان کے ٹھہرنے کی مدت زیادہ ٹھیک بتاتا ہے، ہم ان کا ٹھیک ٹھیک حال تمہیں سنائیں، وہ کچھ جوان تھے کہ اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کو ہدایت بڑھائی اور ہم نے ان کی ڈھارس بندھائی جب'' وہ دقیانوس بادشاہ کے سامنے ''کھڑے ہو کر بولے کہ ہمارا رب وہ ہے جو آسمان اور زمین کا رب ہے۔ ہم اس کے سوا کسی معبود کو نہ پوجیں گے ایسا ہو تو ہم نے ضرور حد سے گزری ہوئی بات کہی، یہ جو ہماری قوم ہے اس نے اللہ کے سوا خدا بنا رکھے ہیں، کیوں نہیں لاتے ان پر کوئی روشن سند، تو اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ پر جھوٹ باندھے'' اور اس کے لیے شریک اور اولاد ٹھہرائے پھر انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا'' اور جب تم ان سے اور جو کچھ وہ اللہ کے سوا پوجتے ہیں سب سے الگ ہو جاؤ تو غار میں پناہ لو، تمہارا رب تمہارے لیے اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے کام میں آسانی کے سامان بنا دے گا اور اے محبوب تم سورج کو دیکھو گے کہ جب نکلتا ہے تو ان کے غار سے دہنی طرف بچ جاتا ہے اور جب ڈوبتا ہے تو ان سے بائیں طرف کترا جاتا ہے'' یعنی ان پر تمام دن سایہ رہتا ہے اور طلوع سے غروب تک کسی وقت بھی دھوپ کی گرمی انہیں نہیں پہنچتی '' حالانکہ وہ اس غار کے کھلے میدان

میں ہیں'' اور تازہ ہوائیں ان کو پہنچتی ہیں ''یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے جسے اللہ راہ دے تو وہی راہ پر ہے اور جسے گمراہ کرے تو ہرگز اس کا کوئی حمایتی راہ دکھانے والا نہ پاؤ گے اور تم انہیں جاگتا سمجھو'' کیونکہ ان کی آنکھیں کھلی ہیں ''اور وہ سوتے ہیں اور ہم ان کی داہنی بائیں کروٹیں بدلتے ہیں'' سال میں ایک مرتبہ دسویں محرم کو ''اور ان کا کتا اپنی کلائیاں پھیلائے ہوئے ہے غار کی چوکھٹ پر'' جب وہ کروٹ لیتے ہیں وہ بھی کروٹ بدلتا ہے۔

فائدہ: تفسیر ثعلبی میں ہے کہ جو کوئی ان کلمات ﴿وَ كَلْبُهُمْ بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيْدِ﴾ کو لکھ کر اپنے ساتھ رکھے کتے کے ضرر سے امن میں رہے [گا]۔

''اے سننے والے اگر تو انہیں جھانک کر دیکھے تو ان سے پیٹھ پھیر کر بھاگے اور ان سے ہیبت میں بھر جائے۔'' اللہ تعالیٰ نے ایسی ہیبت سے ان کی حفاظت فرمائی ہے کہ ان تک کوئی جا نہیں سکتا۔ حضرت معاویہ جنگ روم کے وقت کہف کی طرف گزرے تو انہوں نے اصحاب کہف پر داخل ہونا چاہا، ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے انہیں منع کیا اور یہ آیت پڑھی، پھر ایک جماعت حضرت امیر معاویہ کے حکم سے داخل ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی ہوا چلائی کہ سب جل گئے [؟]۔ ''اور یونہی ہم نے ان کو جگایا'' ایک مدت دراز کے بعد'' کہ آپس میں ایک، دوسرے سے احوال پوچھیں'' اور اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیمہ دیکھ کر ان کا یقین زیادہ ہو اور وہ اس کی نعمتوں کا شکر ادا کریں ''ان میں ایک کہنے والا بولا'' یعنی مکس لمینا جو ان میں سب سے بڑے اور ان کے سردار ہیں ''تم یہاں کتنی دیر رہے؟ کچھ بولے ایک دن رہے یا دن سے کم'' کیونکہ وہ غار میں طلوع آفتاب کے وقت داخل ہوئے تھے اور جب اٹھے تو آفتاب قریب غروب تھا، اس سے انہوں نے گمان کیا کہ یہ وہی دن ہے۔

مسئلہ: اس سے ثابت ہوا کہ اجتہاد جائز اور ظن غالب کی بنا پر قول کرنا درست ہے۔

دوسرے بولے تمہارا رب خوب جانتا ہے جتنا تم ٹھہرے'' انہیں یا تو الہام سے معلوم ہوا کہ مدت دراز گزر چکی یا انہیں کچھ ایسے دلائل وقرائن ملے جیسے کہ بالوں اور

ناخنوں کا بڑھ جانا جس سے انہوں نے یہ خیال کیا کہ عرصہ بہت گزر چکا۔ ''تو اپنے میں ایک کو یہ چاندی لے کر'' یعنی دقیانوسی سکہ کے روپے جو گھر سے لے کر آئے تھے اور سوتے وقت اپنے سرہانے رکھ لیے تھے۔

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ مسافر کو خرچ ساتھ میں رکھنا طریقہ توکل کے خلاف نہیں ہے چاہیے کہ بھروسہ اللہ پر رکھے۔

''شہر میں بھیجو پھر وہ غور کرے کہ وہاں کون سا کھانا زیادہ ستھرا ہے'' اور اس میں کوئی شبہ حرمت نہیں ''کہ تمہارے لیے اس میں سے کھانے کو لائے اور چاہیے کہ نرمی کرے اور ہرگز کسی کو تمہاری اطلاع نہ ہونے دے، بے شک اگر وہ تمہیں جان لیں گے تو تمہیں پتھراؤ کریں گے'' اور بری طرح قتل کر دیں گے۔ ''یا اپنے دین'' یعنی جبر وستم سے کفری ملت ''میں پھیر لیں گے اور ایسا ہوا تو تمہارا کبھی بھلا نہ ہوگا اور اسی طرح ہم نے ان کی اطلاع کر دی'' لوگوں کو دقیانوس کے مرنے اور مدت گزر جانے کے بعد'' کہ لوگ جان لیں'' اور بیدروس کی قوم میں جو لوگ مرنے کے بعد زندہ ہونے کا انکار کرتے ہیں انہیں معلوم ہو جائے'' کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت میں کچھ شبہ نہیں، جب وہ لوگ ان کے معاملہ میں باہم جھگڑنے لگے'' یعنی ان کی وفات کے بعد ان کے گرد عمارت بنانے میں ''تو بولے ان کے غار پر کوئی عمارت بناؤ، ان کا رب انہیں خوب جانتا ہے وہ بولے جو اس کام میں غالب رہے تھے'' یعنی بیدروس بادشاہ اور اس کے ساتھی ''قسم ہے کہ ہم تو ان کے گرد مسجد بنائیں گے'' جس میں مسلمان نماز پڑھیں اور ان کے قرب سے برکت حاصل کریں (مدارک)۔

مسئلہ: اس سے یہ معلوم ہوا کہ بزرگوں کے مزارات کے قریب مسجدیں بنانا، اہل ایمان کا قدیم طریقہ ہے اور قرآن میں اس کا ذکر فرمانا اور اس کو منع نہ کرنا اس فعل کے درست ہونے کی قوی ترین دلیل ہے۔

مسئلہ: اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بزرگوں کے جوار میں برکت حاصل ہوتی ہے اسی لیے اہل اللہ کے مزارات پر لوگ حصول برکت کے لیے جایا کرتے ہیں اور اسی لیے قبروں کی

زیارت سنت اور موجب ثواب ہے۔

''اب کہیں گے'' نصرانی جیسا کہ ان میں سے سید اور عاقب نے کہا'' کہ وہ تین ہیں چوتھا ان کا کتا اور کچھ کہیں گے پانچ ہیں چھٹا ان کا کتا، بے دیکھے الاؤ تکا (تیر تکا) بات'' جو بے جانے کہہ دی کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتی'' اور کچھ کہیں گے سات ہیں'' اور یہ کہنے والے مسلمان ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کو ثابت رکھا کیوں کہ انہوں نے جو کچھ کہا وہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے علم حاصل کرکے کہا'' اور آٹھواں ان کا کتا، تم فرماؤ میرا رب ان کی گنتی خوب جانتا ہے'' کیونکہ جہانوں کی تفاصیل اور کائنات ماضیہ ومستقبلہ کا علم اللہ ہی کو ہے یا جس کو وہ عطا فرمائے ''انہیں نہیں جانتے مگر تھوڑے'' حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا کہ میں انہیں قلیل میں سے ہوں جن کا آیت میں استثنا فرمایا'' تو ان کے بارے میں'' اہل کتاب سے ''بحث نہ کرو مگر اتنی ہی بحث جو ظاہر ہو چکی'' اور قرآن میں نازل فرما دی گئی آپ اتنے ہی پر اکتفا کریں اور اس معاملہ میں یہود کے جہل کا اظہار کرنے کے درپے نہ ہوں ''اور ان کے'' یعنی اصحاب کہف کے بارے میں ''کسی کتابی سے کچھ نہ پوچھو''۔

ضمیمہ (۲)

مضامین وغیرہ کے عکس

بسم الله الرحمن الرحيم

أبو الأعلى المودودي
(أمير الجماعة الإسلامية بباكستان)

الرقم ۷۲۸
التاريخ ۱۳/۱۲/۹۰ھ
۱۰/۲/۱م
المرفقات

الأخ الكريم محمد تيسير ظبيان حفظه الله ورعاه

السلام عليكم ورحمة الله وبركاته : وبعد .

فقد تلقيت رسالتكم الكريمة قبل مدة بيد الانبساط والارتياح ومعها نسخة من عدد (مجلة الشريعة) التي تتضمن بحثاً وافياً فيما يتعلق بموقع الكهف . ولا يسعني الا أن اتقدم اليكم باجزل شكري وأخلص تقديري لما قمتم به من تحقيق رائع ودراسة مستوفية لهذا الأثر الاسلامي المقدس، واحسنتم اذ اقمتم في موقع الكهف مسجدا ومدرسة وضاحية باسم ناحية الكهف وارجو من الله تعالى أن يكتب لهذا المسجد والمدرسة ازدهارا وخلودا . وان صحتي هذه الايام منحرفة تماما حيث لا استطيع المشي والحركة واعاني من الآلام ما اعاني ولو كنت متمتعا بصحة جيدة لقمت بالرحلة الى هذه الآثار المقدسة واستفدت ما جدّ عنها من معلومات واكتشافات . واني ارجو منكم أن توافوني باستمرار بما يصل الى علمكم من معلومات ودراسات عن الآثار الاسلامية التي لديكم كما ارجو أن تواصلوا ارسال مجلتكم (الشريعة) التي تنشر هذا النوع من الدراسات .

هذا وارسل اليكم نسخة من كتابي (ارض القرآن) بالاردو حسب طلبكم وهو يتضمن بعض الصور العكسية لما زرتها من الاماكن الاثرية وأخيرا اهديكم اصدق التحيات .

المخلص
[signature]
ابو الأعلى المودودي

5-A, ZAILDAR PARK, ICHRA, LAHORE - (PAKISTAN)

مولانا سید ابوالاعلیٰ المودودی کا خط محمد تیسیر ظبیان کے نام
(مؤلف اهل الكهف وظهور المعجزة القرآنية الكبرى)

مولانا مودودیؒ کا خط اہل الکہف کے مصنف محمد تیسیر ظبیان کے نام

(امام ابوالاعلیٰ مودودی کے خط بنام مؤلفِ اہل الکہف [محمد تیسیر ظبیان] کا اردو ترجمہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوالاعلیٰ المودودی

(امیر جماعتِ اسلامی پاکستان)

نمبر ۷۱۸ تاریخ ۱۳/۱۲/۹۰[۱۳]ھ، مطابق ۱۰/۲/۷۱[۱۹]م

برادر مکرم محمد تیسیر ظبیان حفظہ اللہ ورعاہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا عنایت نامہ کچھ عرصے قبل، بہت خوشی وانبساط کے ساتھ وصول کیا، جس کے ساتھ مجلۃ الشریعۃ کا ایک شمارہ بھی تھا، جس میں کہف کے محلِ وقوع کے بارے میں سیر حاصل بحث ہے، میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں بہت بہت شکریہ پیش کروں اور مخلصانہ طور پر اس خدمت پر آپ کی قدر کروں جو آپ نے اسلامی مقدس اثر کے بارے میں انجام دی ہے اور بہترین تحقیق کی شکل میں پیش کی ہے۔ آپ نے اس بحث کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل روشنی ڈالی ہے۔ آپ نے بڑا اچھا کیا کہ کہف کے مقام پر مسجد اور مدرسہ قائم کردیا۔ نیز محلۂ کہف (ناحیۃ الکہف) نامی ایک بستی بسادی۔

میں اللہ سے دعا گو ہوں کہ اللہ، اس مسجد اور مدرسے کو ترقی اور دوام نصیب فرمائے۔ میری صحت آج کل بہت گری ہوئی ہے، چل پھر بھی نہیں سکتا، بہت درد والم سے دوچار ہوں۔ اگر میری صحت ٹھیک ہوتی تو میں ان مقدس آثار کو دیکھنے کے لیے ضرور حاضر ہوتا، تاکہ نئی دریافت اور معلومات سے استفادہ کرسکوں۔

میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ کو اپنے یہاں کے اسلامی آثار کے بارے میں جیسے جیسے نئی نئی معلومات فراہم ہوتی رہیں، مجھے مطلع فرماتے رہیں، ساتھ ہی میری درخواست ہے کہ آپ اپنا رسالہ الشریعۃ جو ایسے مضامین شائع کرتا ہے، برابر بھیجتے رہیں۔

میں آپ کی فرمائش کے مطابق، آپ کے لیے (سفرنامہ) ارض القرآن، اردو کی ایک کاپی بھیج رہا ہوں، جس میں ان آثاری مقامات میں سے، بعض کے فوٹو ہیں جن کی میں نے زیارت کی تھی۔

آخر میں خالص تحیات کا ہدیہ پیش کرتا ہوں۔

مخلص

دستخط ابوالاعلیٰ المودودی

5-A, ZAILDAR PARK, ICHRA, LAHORE-(PAKISTAN)

[الجمعیۃ کے اس مضمون کا عکس نہیں مل سکا ہے، اس لیے کمپوز کرا کے شامل کیا جا رہا ہے]

اردو ترجمہ از ادریس حسن، روزنامہ الاہرام مصر

غار اصحاب کہف عمان کے قریب مل گیا

اصحاب کہف خدا پرست لوگوں کا ایک گروہ تھا......

یہی وہ غار ہے جس کا قرآن میں ذکر آیا ہے اور ابھی حال ہی میں تاریخی آثار کی کھدائی کے موقع پر جو کہ حکومت اردن کے پایۂ تخت عمان سے سات کلومیٹر کے فاصلے پر ”رقیم“ نام کے گاؤں میں عمل میں آئی، اس غار کا پتہ چلا ہے۔ تحقیقات اور چھان بین کے بعد معلوم ہوا ہے کہ جو کچھ سورۂ کہف میں آیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ حکومت ہاشمی کا سرکاری عملہ اس کام میں مصروف ہے کہ اس غار کو مسلمانوں کی مقدس زیارت گاہ کی شکل دے دی جائے تا کہ دنیا بھر کے مسلمان، اس کی زیارت کے لیے آیا کریں۔ امید ہے کہ دو ماہ کے بعد رسمی طور پر اعلان ہو جائے گا۔

اب تک چند قرآنی مفسرین نے اس غار کے بارے میں مختلف تفسیریں کی تھیں۔ ایک گروہ تو کہتا تھا کہ غار کہف دمشق کے قریب موجود ہے اور دوسرا گروہ کہتا تھا کہ غار کہف شہر افسوس میں ہے جو کہ ٹرکی کا علاقہ ہے۔ ایک تیسرا گروہ اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ یہ غار بلقاء کے نزدیک ہے جو عمان کے نزدیک ہے۔

بہر حال حالیہ تحقیقات کے بعد تیسرے گروہ کا نظریہ صحیح نکلا۔ چونکہ غار کہف بلقاء ہی کے گاؤں ”رقیم“ میں ملا ہے جس کا ذکر کلام پاک میں آیا ہے: ﴿ام حسبت ان اصحاب الکھف والرقیم کانوا من آیاتنا عجبا﴾

رقیم ایک گاؤں ہے جو عمان شہر کے جنوب میں سات کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے اور جس کو آج کل ”رجیب“ کہتے ہیں۔ تحقیقات کا کام ۱۹۶۲ء میں حکومت ہاشمی کی طرف سے شروع کیا گیا۔ محققین نے اس سلسلہ میں بادیہ نشینوں سے معلومات کی اور آخر کار اس جگہ پہنچ گئے جہاں غار کہف ہے۔ کافی خاک برداری کے اور کھدائی کے بعد تحقیق دانوں اور رابطۂ علوم اسلامی

عمان کے چھان بین کرنے والوں نے غار کہف کا پتہ چلایا ہے۔ اب وہ غار کے منہ پر کھڑے ہو گئے، محکمۂ آثار باستانی اردن کے ڈائرکٹر مرحوم ڈاکٹر رفیق الدجانی کی زیر نگرانی مزید چھان بین کا کام شروع ہو گیا۔

کھدائی کے بعد مندرجہ ذیل باتوں کا پتہ چلا ہے:

۱۔ غار کہف کے منہ پر ایک نقشیں پتھر لگا ہوا ہے جو کہ تیسری قرن میلادی کے بازنطین دور کا پتہ دیتا ہے اور چند سکے بھی دریافت ہوئے ہیں جو اسی دور کے ہیں۔

۲۔ اس غار میں ایک مسجد بھی پائی گئی ہے۔ جس کا ذکر کلام پاک میں آیا ہے: ﴿قال الذین غلبوا علی امرھم لنتخذن علیھم مسجدا﴾

۳۔ اور کلام پاک کی اس آیت کے مطابق ﴿ویقولون سبعة وثامنھم کلبھم﴾ اس غار میں سات قبریں ملی ہیں جو کہ اصحاب کہف کی ہی ہیں۔

۴۔ ان قبروں میں سے سات انسانوں کی کھوپڑیاں اور ایک کھوپڑی حیوان کی دستیاب ہوئی ہے۔

۵۔ کلام پاک کی آیت کے مطابق ﴿وتری الشمس اذا طلعت تزاور عن کھفھم ذات الیمین واذا غربت تقرضھم ذات الشمال وھم فی فجوة منه﴾ آفتاب طلوع ہونے کے وقت بڑے آرام سے اس غار کے پاس سے گذر جاتا ہے اور اس کی تیز شعاعیں غار میں داخل نہیں ہوتیں اور اسی طرح شام کو غروب ہوتے وقت اس سے بچ کر نکل جاتا ہے۔

اب جب کہ محققین نے اس امر کی تصدیق کر لی ہے کہ یہی وہ غار اصحاب کہف ہے جس کا ذکر کلام پاک میں آیا ہے تو اس جگہ کا نام اہل کہف رکھ دیا ہے اور حکومت اردن کے محکمہ اوقاف کی طرف سے پرانی مسجد کی تعمیر نو شروع ہو گئی ہے جو دو ماہ بعد مکمل ہو جائے گی۔

اس سلسلے میں مشہور عالم و تمدن اسلامی کے ماہر ڈاکٹر مصلح بیومی نے اپنے خیالات اس طرح ظاہر کیے ہیں کہ آج جب کہ غار اصحاب کہف کا پتہ چل گیا کلام پاک کی صداقت پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی ہے اور کلام یزدانی کا ایک اور معجزہ منظر عام پر آیا ہے۔

[روزنامہ الجمعیۃ جلد ۶۱ پیر، ۱۳؍ رجب المرجب ۱۳۹۶ ہجری مطابق ۱۲؍ جولائی ۱۹۷۶ء] شمارہ نمبر ۱۴۹۔

مآخذ

☆ اکتشاف کهف أهل الکهف /بقلم المکتشف رفیق وفا الدجاني، المساعد الفنی لمدیر الآثار العامة بالأردن [آنذاك]/ مؤسسة المعارف۔ بیروت دسمبر۱۹۶۴ء

☆ أهل الکهف و ظهور المعجزة القرآنیة الکبری/ محمّد تیسیر ظبیان/ دار الاعتصام، القاهرة (ط۔ا) ۱۹۷۸ء

☆ اللؤلؤ و المرجان فیما اتفق علیه الشیخان/ جمع محمّد فؤاد عبدا الباقی و مراجعة الدکتور عبد الستار أبو غدّة/ وزارة الأوقاف و الشؤون الإسلامیة ۔ الکویت ۱۹۷۷

☆ ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد، ساہتیہ اکادیمی نئی دہلی، جلد چہارم (پہلا ایڈیشن) ۱۹۷۰ء اور جلد دوم، مکتبہ مصطفائی، لاہور (بلا تاریخ)۔

☆ تفہیم القرآن جلد سوم، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، جلد سوم، نئی دہلی ۱۹۹۹ء

☆ سفرنامۂ ارض القرآن روداد سفر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی / [مرتبہ] محمد عاصم/ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی بار دوم ۱۹۷۸ء (۳۴۴ص)

☆ قصص القرآن/ مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی/ ندوۃ المصنفین دہلی جلد سوم طبع چہاردہم ۱۹۷۸ء (۳۹۸ص)

☆ لغات القرآن، مولانا عبدالرشید نعمانی، جلد اوّل، ندوۃ المصنفین، دہلی (طبع پنجم) ۱۹۷۶ء (۳۲۱ص)

☆ معارف القرآن، مفتی محمد شفیع، جلد پنجم (سورہ یوسف تا سورہ کہف)، ربانی بکڈپو، لال کنواں دہلی ۱۹۹۵ء

☆ کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن، خزائن العرفان في تفسیر القرآن، ترجمہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی، تفسیر حضرت صدر الافاضل سید محمد نعیم الدین مرادآبادی (مثل لاہور تاج کمپنی) یاسین بک ڈپو رودگران دہلی (بلا تاریخ)

The History of the Decline and Fall of the Roman Empire,
Chapter XXXIII

Encyclopedea of Islam (New Edition), Leiden (Anbat)

ضمیمہ (۳)

تصویریں
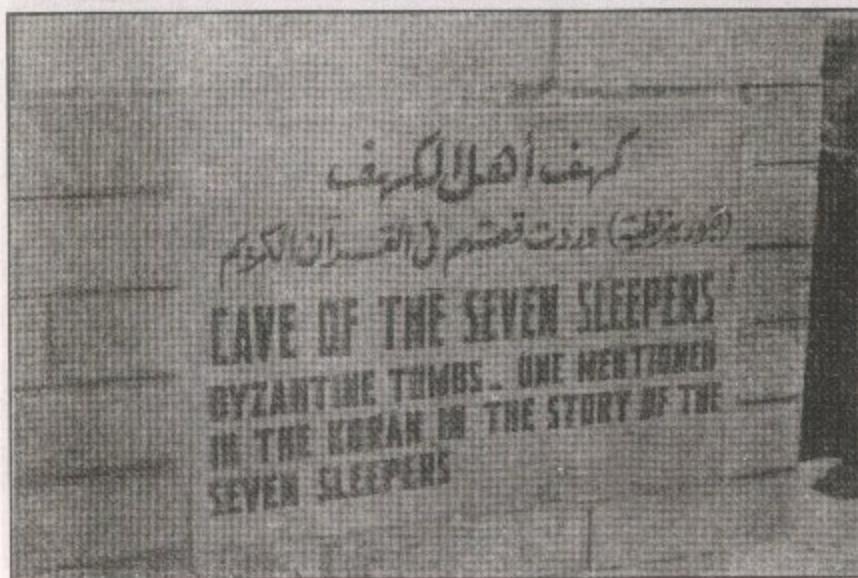
اصحاب کہف کے غار کے قریب لگایا گیا کتبہ

جنوب میں واقع مسجد

The History of the Decline and Fall of the Roman Empire, Chapter XXXIII
Encyclopaedia of Islam (New Edition), Leiden (Brill)

غار کا ایک منظر جس میں اوپر کی جانب مسجد و محراب نظر آ رہے ہیں
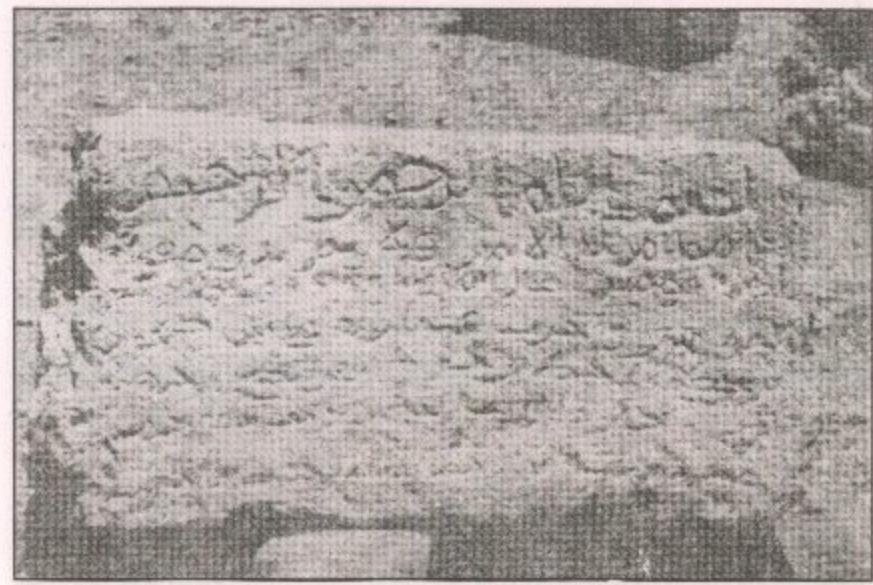
اسلامی عہد کی قدیم مسجد کی تعمیر کا پتھر سے بنا کتبہ

غار میں ملنے والا حیوانی جبڑا

غار کے اندر کا حصہ اور مسجد کا دروازہ

کہف کے اندر ایک دیوار پر گہرے کتھئی رنگ کے رومی نقش و نگار کا ایک نمونہ
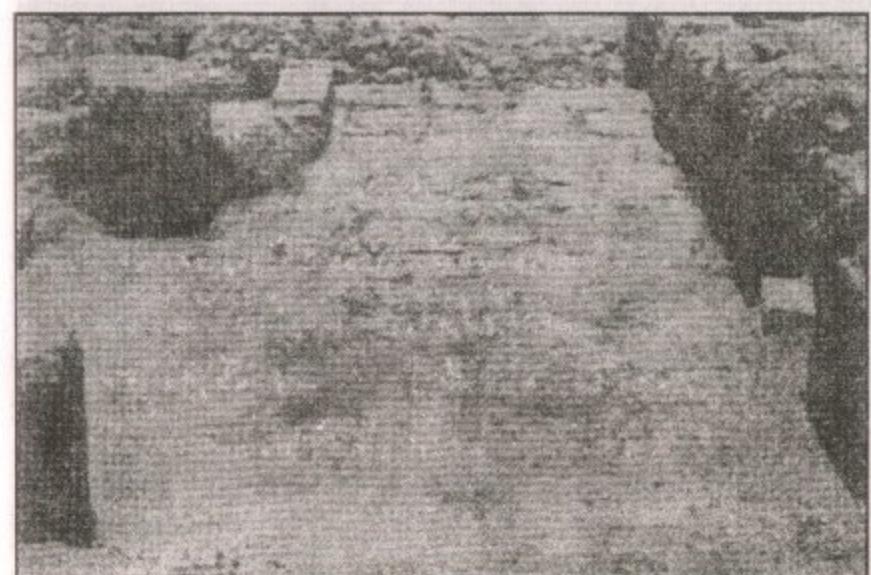
اسلامی عہد کی قدیم مسجد کا صحن

فجوہ (کشادہ جگہ) اور مسجد کے صحن سے جانے والی سرنگ کی کھڑکی

کہف کی چوکھٹ اور اس کے اندر موجود چبوترے (فجوۃ) کا ایک منظر

فجوہ (کشادہ جگہ) اور کہف کے اندر سے کھلا ہوا راستہ

ترکی کے شہر افسوس کے غار کا دروازہ

غار کے اندر ملنے والا پتھر جس پر تحریر کندہ ہے

غار میں ملنے والی انسانی کھوپڑیاں

مسجد کے اندرونی حصے کا منظر

مسجد کے اندرونی حصے کا ایک دوسرا منظر
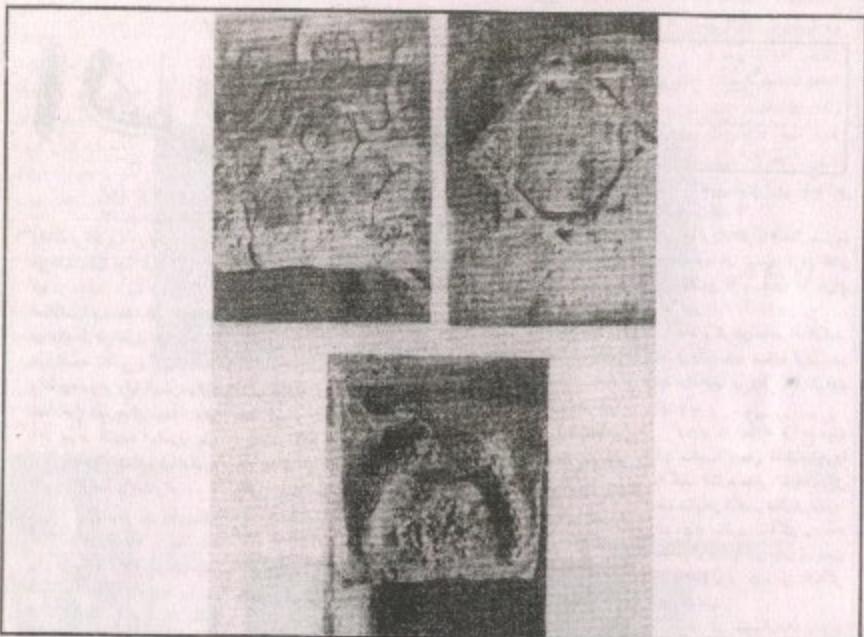
پتھروں سے بنی قبروں (تابوتوں) کے سامنے کی جانب بنے نقش ونگار

ترکی کے شہر افسوس کے غار کا اندرونی حصہ
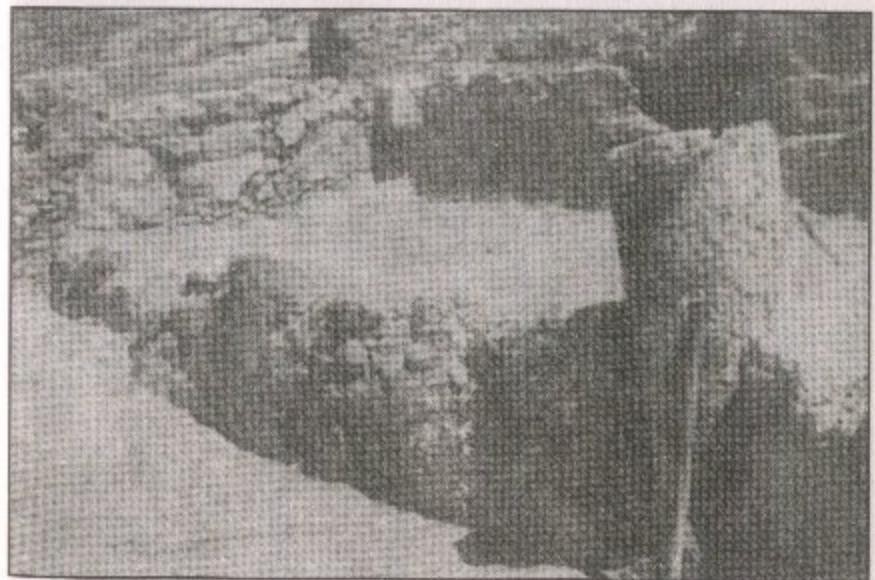
THE SEVEN SLEEPERS

by Isobel Fistere

The gentle legend of the "Seven Sleepers" is a tale known round the world, with claimants for its locale from Asia Minor to Scandanavia, from Yemen to Brittany. It is an appealing and pious legend: of ancient Syriac origin, of young Christian zealots persecuted by a pagan Roman emperor, saved from death by being put into a centuries long sleep. When they awaken, it is to a world that has meantime become Christian, but is torn by doubts about the Resurrection, and an after-life. Their miraculous appearance presented living proof of God's ability to resurrect soul and body, and caused a great revival of faith. They were feted, canonized, and turned into living legends.

Excellent, then. A pure Christian parable of faith and devotion. But hold. The same story forms the text for one of the books of the Koran ... the Sourate XVIII. How did this happen ? How did Islam come to share the Christian parable?

The persistent legend had been passed down through the centuries by scholars of Syrica, Latin, French and Arab persuasion. The earliest Syriac version of Jacques de Saroug was translated into 6th century Latin by Gregory de Tours, introducing the story into Western Europe, and Latin legend. A 6th century canticle is still sung in an annual pilgrimage in Brittany to a "Seven Sleepers Cave," the ancient chant beginning:

"Autrefois il y avait un homme cruel, Decius, il était nommé Empereur le plus féroce le plus méchant qu'on pût trouver.
Fit une persecution martyrisant tous les Chretiens.
Qui refusèrent d'abandonner leur foi et leur croyance,"

ماہر آثار قدیمہ فیسٹر کا ایک انگریزی مجلّے میں شائع ہونے والے مضمون کا پہلا صفحہ،
فیسٹر ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے اس غار کے انکشاف میں دلچسپی لی اور اس جگہ کا معائنہ کیا۔

شرایط واگذاری خا

خانه‌های ارزان قیمت یک تاسه اتاق خواب دارد

متقاضیان بایده ۲ درصد قیمت خانه را نقد بپردازند

اوامر شاهنشاه به دولت:

تامیتوانید خانه ارزان قیمت بسازید

۴۴ صفحه

پنجشنبه چهارم شهریور ۲۵۳۵
بیست و نهم شعبان ۱۳۹۶

اسرار تازه غار اصحاب کهف

جمجمه هایی که در غار کشف شده مورد آزمایش علمی قرار میگیرد

ایرانی روزنامہ "اطلاعات" بتاریخ ۲۹ شعبان ۱۳۹۶ ہجری میں اصحاب کہف کے غار کے انکشاف کی خبر

عمان میں مدوّر رومی تماشا گاہ (amphitheatre)، جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ سرکش وظالم حکمران یہاں دیوی دیوتاؤں کے لیے قربانی چڑھاتے تھے۔ اس میں بیک وقت ساٹھ ہزار آدمیوں کی گنجائش ہے۔

کھدائی کے دوران ملنے والی چیزیں، جو اب غار کے فجورے یا چبوترے پر رکھ دی گئی ہیں

زیر نظر تصویر میں اصحاب کہف کی چار قبریں نظر آرہی ہیں۔ دوسری جانب دیگر قبریں بھی ہیں

رقیم پہاڑ کا ایک منظر اور کہف پر تعمیر شدہ مسجد کا بیرونی حصہ

مرمت کے بعد اصحاب کہف کے غار کا بیرونی منظر اور قرآن مجید میں مذکور کہف پر تعمیر شدہ قدیم مسجد (عبادت گاہ) کے آثار

غار کے اندر سے دروازے کا منظر

صاحبِ کتاب پر ایک نظر

ڈاکٹر محمد نعمان خان ہندوستان کی مشہور علمی دانش گاہ دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر اور پروفیسر ہیں۔ آپ کے والد مولانا قاری محمد سلیمان خان رحمۃ اللہ علیہ (وفات: نومبر ۱۹۷۶ء) دہلی کی مشہور درس گاہ مدرسہ عالیہ عربیہ فتحپوری میں تا حیات تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ عربی زبان وادب کے جانے پہچانے اسکالر ہیں۔ اردو آپ کی مادری زبان ہے، آپ نے مشہور زماں اردو شاعر غالب کے محلے بلیماران میں نشو ونما پائی ہے۔ ابتدا میں آپ نے نئی دہلی میں واقع اردنی سفارت خانے میں مقامی سکریٹری کی حیثیت سے کام کیا، اس کے بعد اردن کی شاہی اکیڈمی "المجمع الملكي لبحوث الحضارة الإسلامية" میں کافی عرصے تک علمی خدمات انجام دیں اور مملکت اردن کے موسس وبانی شاہ عبداللہ بن حسین کے مجموعۂ تصانیف "الآثار الكاملة" کے اردو ترجمے پر نظر ثانی کی، یہ کتاب بھیونڈی سے شائع ہوئی، جرمنی میں قیام کا موقع ملا تو وہاں رہ کر جرمنی زبان سیکھی اور عربی کی سب سے پہلی جامع قاموس "كتاب العين" میں موجود تفسیری مواد پر کام کیا۔ یہ کتاب جرمنی زبان میں عربی متن کی تحقیق کے ساتھ ۱۹۹۴ء میں برلن سے Die exegetischen Teile des Kitab al-Ayn کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس دوران بامبرگ یونیورسٹی میں اعزازی طور پر تدریسی خدمات انجام دیں۔ اس کے علاوہ آپ نے عربی زبان کے مشہور عالم ولغت نویس ابن منظور افریقی کی کتاب "المنتخب والمختار" کو ایڈٹ کر کے شائع کیا، اسی طرح ان کی مشہور زمانہ قاموس "لسان العرب" میں موجود اغلاط پر "تصحيح لسان العرب" نامی کتاب دہلی سے شائع ہوئی۔

فراست علی